تمدن اسلام

حصہ اوّل

مصر کے نامور فاضل علامہ جرجی زیدان اڈیٹر رسالہ الہلال کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا

ترجمہ

جس میں

اسلامی سلطنت کی یوماً فیوماً وسعت پذیر ترقی کیساتھ انتظام ملکی ،مالی اور فوجی کی تاریخ
اور اس کے تموّل، تمدن اور شان وشوکت کی تفصیل محققانہ طور سے درج ہے

مولوی محمد حلیم صاحب انصاری رودلوی نے ترجمہ کیا

اور

شیخ عبدالعزیز منیجر کے اہتمام سے

مطبع روز بازار الیکٹرک پریس (ہال بازار) امرتسر میں

طبع ہوا

کارخانہ "وکیل" کی بے نظیر کتابیں

ذیل کی پر تاثیر کتابیں جو مشرق و مغرب کے بہترین دلوں دماغوں کا نتیجہ ہیں ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بے نظیر تسلیم کر لی گئی ہیں اور انکی قومی و مذہبی اثر خیزی کی ایک دنیا قائل ہے مسلمانوں کا کوئی گھر اور کوئی لائبریری ان سے محروم نہیں رہنی چاہیے محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
الاسلام -	۸ر	تفسیر السموات -	۸ر	سوانح حیدر علی سلطان	عہ
اسلام	۲ر	تعلیم نسواں -	۲ر	” ٹیپو ”	عہ
اسلام کی دنیوی برکتیں	۸ر	تنزل علوم دینیہ	ار	دمشق - -	۱۲
اسلامی حکومت	۲ر	تدبیر -	۲ر	روح کی بیداری	۴ر
احسان عام	ار	تقلید عمل بالحدیث	۸ر	رسائل شبلی	عہ
الدین یسر	۳ر	تعصب و انصاف	ار	زیب النسا بیگم	ار
اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر	۱۲ر	تاریخ التاریخ	۳ر	سوانح مولانا روم	عاً
اساس الاخلاق	۱۲	جہانگیر - -	۲ر	سلیمان علیہ السلام	۴ر
البرامکہ مجلد ؏ بلا جلد	۸ر ۱۲	جسمانی تعلیم	۴ر	سیاحت ہند	للعہ
اشاعت اسلام	۸ر	حضرت عیسےٰ وصلیب	ار	شکوہ ہند	۳ر
الخطبات الاحمدیہ	عہ ۸ر	حضرت ہاجرہ	۲ر	صلہ رحم	۲ر
القانون ..	عہ	حضرت زید	۴ر	صناعۃ العرب	۳ر
بیوہ کی مناجات	۲ر	حقیقت السحر	۲ر	عربوں کا فن تعمیر	۴ر
پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ	ار	حب وطن -	ار	اسرار ادویہ	۸ر
تنوق قدیم	۸ر	حیات خسرو -	۱۲ر	تحقیق اناجیل ہر دو حصہ	عہ
	۴ر	حیات صالح - ..	۴ر	غذائے انسانی	۳ر

فہرست مضامین تمدن اسلام حصہ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

دنیا کی تاریخ میں اسلامی تاریخ کا اہم ہونا مُسلّم ہے۔ کیونکہ اس سے وہ تاریخ مراد ہے جو قدیم زمانہ کے حالات کو موجودہ ایام کے حالات سے متصل کرتی ہے؛ اور زمانہ متوسط (مڈل ایجز) میں جو متمدن دنیا گذری ہے اس کے حالات کا پتہ دیتی ہے؛ اسلامی تاریخ قدیم تمدن کا خاتمہ اور جدید تمدن کا دیباچہ ہے؛ نئی تہذیب اور موجودہ ایام کے تمدن کی کڑیاں اسی تاریخ سے پھوٹی ہیں؛ ہم برسوں سے اس تاریخ کے مطالعہ میں مصروف تھے؛ اور رسالہ الہلال کے کاموں سے فراغت حاصل کرنیکے اوقات اسی کی سیر میں صرف کرتے تھے اس حالت میں جہاں کہیں کوئی مناسب موقع نظر پڑتا فوراً اسے نوٹ کر لیتے اور فرصت کے منتظر رہتے کہ موقع ملیگا تو اسلامی تمدن پر اس قسم کی ایک مطول تاریخ لکھینگے جو اس کے تمام حالات پر حاوی ہو ہمنے اپنے اس ارادہ کو اس وقت سے پہلے بھی کئی مرتبہ پبلک کے سامنے پیش کر دیا تھا؛ خدا کے فضل سے ہمارا یہ عزم برابر قائم رہا؛

ہمارا خیال تھا کہ عربی زبان کے پڑھنے والے اگرچہ وہ مختلف مذہبوں اور مشربوں کے ہیں۔ پھر بھی وہ ایک ایسی تاریخ کے محتاج ہیں؛ اسلئے کہ یہاں کی زبان۔ ان کی قوم اور ان کے ملک کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ان کے آداب اور ان کے عادات کی تاریخ ہے؛ اسلئے ہم موقع بموقع اس تاریخ کے متعلق ایسے مضامین کا سلسلہ نکالتے رہے؛ جنکو لوگ شوق کی نگاہ سے دیکھیں؛ اور اسطرح ہم ان کے ذہنوں کو "الہلال" میں اسلامی تاریخ کیساتھ تعلق رکھنے والے ناول متواتر شائع کرتے رہنے سے اس تاریخ کے مطالعہ کیلئے تیار کرتے رہے اگرچہ وہ لوگ مختلف طبقوں متفاوت درجات علم و فضل اور عقل و فہم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا تھے ہماری اس کارروائی کا مبنیٰ اور حصول یہ تھا کہ محض تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں پر بار گذرتا ہے؛ وہ خاص کر ہمارے

ملک میں کیونکہ یہاں علم وفن کا چرچا کم ہے اور اسکی ترقی گویا ابھی صرف اپنے عہد طفلی میں ہے۔ لہذا ہمارے لئے کوئی ایسا طرز اختیار کرنا ضروری تھا جس کے ذریعہ سے لوگ مطالعہ میں دلچسپی لیں اور اس غرض کو پورا کرنے کے واسطے ناولوں کا پیرایہ اختیار کرنا سب سے بہتر ذریعہ تھا۔

اسلامی تاریخ کے اس سلسلہ میں سے ہم نے ابتک چند کڑیاں پوری کی ہیں جنمیں اس تاریخ کے اہم واقعات عبداللہ بن زبیر کے قتل تک درج ہیں جس کے بعد سے خلافت کی باگ بے غل وغش عبدالملک بن مروان کے ہاتھ میں آئی اور ہم نے اسبات کو دیکھ لیا ہے کہ عام ناظرین کی طبیعتوں میں اس تاریخ کو وسعت دینے کا شوق اور اسلامی تمدن کی حقیقت معلوم کرنیکا ذوق نشو ونما پا رہا ہے۔ نیز اپنے فاضل نامہ نگاروں کے خیالات میں ایک طرح کی بلند پروازی کو بھی معائنہ کر لیا ہے جسے وہ لوگ اس تمدن کی حالت سے بحث کرتے ہوئے جدید تمدن یورپ کے ساتھ اسکا تعلق دریافت کرنیکے اشتیاق میں عیاں کرتے ہیں اسکے علاوہ بہت سے صاحب علم و فضل نے اس معاملہ میں ہمسے خط وکتابت کرکے اس امر کے متعلق ہماری ذاتی رائے دریافت کی ہے ان امور پر لحاظ کرکے ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ الہلال کے دسویں سال کے خاتمہ پر ہم ایک ایسی کتاب شائع کریں جسمیں اسی موضوع پر بحث کیگئی ہو اور اسمیں اس تمدن کی تاریخ بیان کرکے جدید یورپین تمدن کیساتھ اس کا تعلق ظاہر کیا جائے کسی قوم کی اصلی تاریخ اسکے تمدن اور آبادکاری کی تاریخ ہوا کرتی ہے نہ کہ اسکے جنگی کارناموں اور فتوحات کی جس امر کی اسلامی تاریخ لکھتے ہوئے عرب مورخوں کو خصوصاً عادت پڑ گئی ہے وہ صرف واقعات کو جیسے کا تیسا بیان کر دیتے ہیں اور ایسے اسباب کی جانب بہت کم اشارہ کرتے ہیں جن سے ان واقعات کا باہمی تعلق سمجھ میں آسکے اور وہ ایکدوسرے سے مرتبط ہو سکیں۔ تاکہ عقل انکی علت دریافت کر سکے انہیں غور کر سکے اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس قسم کی حقیقت سمجھ میں آسکے مگر ہم انہیں اسبارہ میں معذور بھی سمجھتے ہیں ان بیچاروں کو جیسا موقع ملتا تھا اور جس حالت کے مطابق لکھنا پڑتا تھا اسمیں ایک بڑی دقت یہ بھی کہ انکو واقعات کے اسباب پر غور کرنیسے پہلو تہی کرنا پڑتا تھا۔ اور اکثر اوقات وہ کسی ایک جانب کی طرفداری کرتے ہوئے لکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یا ممکن ہے کہ انہیں کوئی اور عذر بھی ہوتا رہا ہو۔

بہر حال آج ان معاملات پر غور کرنیسے ہمیں کوئی روکنے والا نہیں ہے اور اسمیں بھی کچھ شک نہیں کہ بہت سے مشرقی علما اور یورپین عالموں نے اس مضمون پر تصانیف کرنیکا قصد کیا ہے۔ لیکن ان کو مسلمانوں کی لکھی ہوئی تواریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جو ان کی آتش شوق کو فرو کر دیتی۔ کیونکہ ایسی باتیں اگر ان کتابوں میں

ہیں بھی تو پراگندہ طور پر واقع ہیں اور دشواری سے ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے جب گزشتہ سال ہمنے اپنا یہ
خیال شائع کیا تو یورپین علماء کے ایک گروہ نے ایسے سخت کام کیلئے ہمارے مستعد ہوجانیپر بہت مسرت ظاہر
کی تھی اور حق یہ ہے کہ گو ہمنے اس ارادہ کا اظہار کردیا تھا۔ لیکن باوجود بیحد تلاش اور جستجو کے خود ہمیں بھی
یہ امید نہ تھی کہ ایسے سخت مضمون کے متعلق ہم کو اس قدر مصالحہ مل جائیگا جو (۱) صفحو نپر بھی لکھا جاسکے کیونکہ
ضمیمہ سال دہم کی ضخامت اتنی ہی ہونی تھی مگر ہم نے کمر ہمت باندھ کر تا امکان کوشش کی اور اہل عرب کی لکھی
ہوئی تاریخی، سیاسی، ادبی، اور دیگر علوم کی کتابیں دیکھنی شروع کیں جو ہم کو مطبوعہ اور قلمی دستیاب ہوسکیں۔

تاریخ فتوح اور تقاویم کی کتابوں میں سے ابن اثیر، ابن خلدون، ابن خلکان، مقریزی، بلاذری،
ابی الفدا، تاریخ خمیس، مسعودی، مقری، فخری، سیوطی، ابن خرداذبہ، یاقوت اور اصطخری وغیرہ
لوگوں کی کتابیں مطالعہ کیں ادب میں آغانی، عقد الفرید، ابن عبدربہ، کشکول، مستطرف اور سراج الملوک
وغیرہ کتابوں پر نظر ڈالی تفسیر و حدیث اور فقہ کے متعلق تفسیر رازی، تفسیر زمخشری صحیح بخاری، مشکوۃ المصابیح
اور ہدایہ وغیرہ کتابوں کی سیر کی ملکی اور مالی انتظام کی کتابوں میں سے ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ قدامۃ بن جعفر
کی کتاب الخراج و صنعۃ الکتابۃ۔ ماوردی کے احکام السلطانیہ ملک سعید کی عقد الفرید، اور ابن خلدون کا مقدمہ
وغیرہ۔ اسکے علاوہ بہت سی کتابیں دوسرے مضامین کی۔ جنکے دیکھنے والے کو اسبات کا وہم وگمان بھی نہو
کہ وہ ان سے اس مضمون کے متعلق کوئی فائدہ اخذ کرسکیگا۔ اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں ہمیں
بہت سی مفید باتیں دستیاب ہوئیں۔ ان کتابوں میں سے چند یہ ہیں حیاۃ الحیوان مصنفہ دمیری عجائب المخلوقات
مصنفہ قزوینی اور ان کے علاوہ معجمات اور فہرستوں کی دوسری کتابیں مثلاً تہانوی کی کتاب۔ کشاف
اصطلاحات الفنون، اور کتاب کشف الظنون، کلیات ابی البقا وغیرہ۔ یہ کتابیں صرف عربی زبان میں ہیں

اس کے بعد ہمنے مولفین یورپ کی بھی وہ تمام کتابیں پڑھیں جو اسلام۔ اسلام کی تاریخ اور اسکے آداب
پر انگریزی فرانسیسی یا جرمن زبان میں لکھی گئیں تھیں اور ہمیں دستیاب ہوسکیں مثلاً فرانس کے عالم لیبون
کی کتاب تمدن عرب پر، لیبو کی تاریخ سلطنت رومانیہ شرقیہ، فرانس کے مشہور رسالہ "ایشیا" کے مضامین
تمدن مشرق کے بیان میں، فون کریمر کی کتاب جرمنی زبان میں، میکس ہولر علامہ جرمنی کی کتاب تاریخ الاسلام
اسٹینلی لین پول انگریزی کی تصنیف دول اسلامیہ کے بیان میں اور گبن کی رومن امپائر وغیرہ۔

(۱) یہ کتاب ہندوستان کے ایک عالم مولوی شیخ محمد تہانوی کی تصنیف ہے جو بارھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں اور اسکو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا ہے (مترجم عفی عنہ)

غرضکہ مختلف زبانوں اور مضامین کی عام لغتوں اور اخباروں کے علاوہ عربی اور یوروپین زبانوں کی جو کتابیں ہم نے مطالعہ کی ہیں اُن کی تعداد دو سو جلدوں سے زائد ہے؛ اور یہ سب اُس مواد کے علاوہ ہے جو برسوں مشرق کی تاریخ دیکھتے رہنے سے ہمارے ذہن میں جمع ہو رہا تھا؛ ان امور کے بعد ہم کو اس قدر سرمایہ بہم پہنچ گیا جو اس عجیب تمدن کے سیاسی؛ انتظامی؛ علمی؛ ادبی؛ اور اخلاقی پہلوؤں سے فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے مطلوبہ کتاب کے ایسے کئی حصے پُر کر دے پس ہمارے لئے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اس موضوع کو ہم کئی حصوں پر تقسیم کر دیں جنمیں سے پہلا حصہ اس وقت شائع کریں اور باقی حصوں کو انشاء اللہ آئندہ والہلال کے سالانہ تحفوں کی شکل میں شائع کرتے رہیں؛ پس یہ کتاب کا پہلا حصہ اور آئندہ حصوں کی بنیاد ہے؛ ہمنے اس کو تمہیدی مقدمات سے شروع کیا ہے جنمیں عرب اور تمدن اسلام سے پہلے عرب کی حالت اور انکا کچھ عرصہ قبل از اسلام ترقی کیلئے آمادہ ہوتے جانا؛ زمانہ جاہلیت کا طرز حکومت؛ آغاز دعوت اسلام تک کعبہ اور قریش کا حال؛ پھر ظہور اسلام؛ اس کی اشاعت؛ اسلامی فتوحات۔ دولت بنی امیہ و عباسیہ کا قیام اور اُن کے بعد اندلس کی اور پھر بنو فاطمہ کی حکومتوں کا قائم ہونا وغیرہ؛ تمام باتیں بیان کر دی ہیں اور انپر ایک کھوٹا کھرا پرکھنے والے شخص کی طرح نظر کی ہے ہم نے کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہیں لکھا جسکے اسباب اور وجوہات کو نمایاں طور پر نہ دکھایا ہو اور پھر اُن سے کوئی نتیجہ نہ نکالا ہو؛ بلکہ اس کے بعد ہونیوالے واقعہ سے اس کا تعلق بھی عیاں نہ کر دیا ہو خصوصاً اسباب کے بیان کرنے پر ہمنے بہت زور دیا ہے جس نے روم و فارس کی زبردست و عظیم الشان سلطنتیں فتح کر لینے پر اہل عرب کو جرأت دلائی۔ ان کی ہمت بندھائی اور اعانت کی۔ باوجودیکہ وہ بہت قلیل التعداد اور بالکل بے سر و سامان تھے؛ یہ اس قسم کی فلسفیانہ بحث ہے جسے ہماری دانست میں ابتک کسی شخص نے کسی زبان میں پوری طرح بیان نہیں کیا؛ تصانیف اہل فرنگ میں اسکے متعلق کہیں کہیں کچھ نظر آتا بھی ہے تو وہ نہایت مختصر اور غیر تشفی بخش ہے؛ مگر ہم اسبارہ میں یوروپین مصنفوں کو الزام دینا نہیں چاہتے کیونکہ یہ مضمون انکی رسائی فہم اور پرواز خیالات سے بالاتر ہے؛ اسے نہ انکے مذہب سے کوئی علاقہ ہے اور نہ انکے حالات و آداب اور تاریخ کے ساتھ کوئی لگاؤ؛ اور جو ذرا تھوڑا تعلق ہے بھی تو وہ نہ ہونیکے برابر؛ البتہ خود ہم ہی قابل ملامت ہیں کیونکہ یہ زبان ہماری مادری زبان تھی؛ اسپر بھی اہل یوروپ ہماری قوم کے تمدن و ادب و اخلاق کی تاریخ سے بحث کرنے میں سبقت لے گئے!!!

تمکہ و بلاتفہ: ...کے بعد ہم نے اسلامی سلطنت کے کمال اور عروج کے زمانہ میں اسکی حالت پر غور کیا ہے

اس کی تعداد و مقدار بیان کی ہے؛ اسلامی حکومت اور اس کی مصلحتوں (کاروباری شعبوں) اور اسباب پر نظر ڈالی ہے کہ اس کی بنیاد کیونکر پڑی؛ پھر مختلف ضرورتوں کی وجہ سے اس کے کاروبار میں بہت سی شاخیں کیونکر پیدا ہوئیں مثلاً خلافت اور اس کے توابع وزارت، ولایت اعمال، بیت المال (خزانہ عامرہ) فوج اور تمام دفاتر ملکی ومالی؛ اس کے بعد ہم نے ان تمام صیغوں اور محکموں کی تاریخ بیان کی ہے اور ان کے فروعات وملحقات کا ذکر کیا ہے؛

واقعی امر یہ ہے کہ اس تاریخ کی خاطر تصانیف عرب کی چھان بین میں ہمنے جیسی دقت وزحمت اٹھائی ہمارا ہی جی خوب جانتا ہے؛ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہمنے بڑی بڑی ضخیم کتابیں تمام وکمال دیکھ ڈالی ہیں اور ان میں سے ہمیں اپنے مفید مطلب صرف ایک یا دو فقرے ملے ہیں؛ اور لبسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بغیر دو یا تین جلدیں دیکھ چکنے کے صرف ایک بات بھی پوری نہیں ہوئی ہے؛

مثلاً جب ہم نے اسلامی حکومت کے اندر ولائت اعمال اور عہدہ قضاء کی تاریخ لکھی تو اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ بھی ارادہ ہوا کہ خلفائے راشدین کے عہد میں عاملوں اور قاضیوں کی تنخواہوں کی شرح بھی بیان کردیں اس کے متعلق کتاب فتوح البلدان بلاذری میں ہم کو اتنی عبارت ملی۔ کہ عمر بن الخطابؓ نے عمار بن یاسرؓ کو شہر کوفہ کی فوج کا افسر اور وہاں کے مسلمانوں کی نماز کا امام مقرر کیا تھا عبد اللہ بن مسعودؓ کو وہاں کا قاضی اور ناظر بیت المال بنایا تھا۔ اور عثمان بن حنیفؓ کو پیمائش اراضی کا مہتمم قرار دیا الخ۔ لیکن مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ ان لوگوں کی تنخواہیں کیا تھیں؛ اس کے بعد ہم نے طرطوشی کی کتاب سراج الملوک کے اس باب میں جسمیں اُسنے یہ بیان کیا ہے کہ سلطان وقت بیت المال میں سے کن طریقوں پر خرچ کرتا تھا؛ اور عاملوں کا کیا اصول تھا؛ دیکھا کہ عمر بن الخطابؓ نے سب سے اوّل عمارؓ کو ولائت کوفہ کا حاکم بناتے وقت عاملوں کی تنخواہ کی شرح مقرر کی اس سے قبل خلیفہ ممدوح نے کسی حاکم یا افسر کی کچھ تنخواہ متعین نہیں فرمائی تھی۔ خلیفہ موصوف نے عمارؓ کا مشاہرہ چھ سو درم قرار دیا اور انکے تحت حکام محرروں اور موذنوں کی تنخواہیں علیحدہ علیحدہ قرار دیں؛ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کا وظیفہ سو درم ماہوار متعین فرمایا الخ۔ مگر مصنف مذکور نے اس مقام پر نہ عمارؓ کا منصب بیان کیا ہے؛ اور نہ یہ بتایا ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کا کیا عہدہ تھا۔ لیکن ہمنے فتوح البلدان اور سراج الملوک دونوں کتابوں کی روائتیں اکٹھا کر کے ان سے یہ

نتیجہ اخذ کیا کہ فوج کے افسر اور امام نماز کی تنخواہ عمرؓ کے عہد میں چھ سو درم ماہوار تھی اور قاضی کا مشاہرہ سو درم ہوتا تھا اس کے علاوہ دیگر قرائن سے اس بات کا سراغ لگایا کہ عمارؓ عمرؓ کی طرف سے کوفہ کے عامل مقرر ہوئے تھے پھر ان سب امور میں باہم مطابقت دینے سے ثابت ہو گیا کہ عمرؓ کے عہد میں عامل کی تنخواہ چھ سو درم ماہوار تھی اور قاضی کی سو درم ماہوار اسی پر اندازہ کرنا چاہیئے کہ کتنی دقتوں سے ایک ایک ذرا سی بات کا پتہ ملا ہوگا،

دوسرے حصہ میں ہم اسلامی سلطنت کی دولتمندی اور اس کی رعایا کی خوشحالی اور خوشباشی کا ذکر کرینگے اور یہ بات دکھائینگے کہ اسلامی سلطنت کے تعلقات اپنی ہمعصر مملکتوں کے ساتھ کیسے تھے۔ خلفاء کی مجالس (بزم) اور مشاغل تفریح کے حالات علم اور علماء شعر اور شعراء کیساتھ ان کا اہتمام۔ دربارداری کے اصول اور حاضری دربار کے طریقے، ان کے محلات اور حریم، ان کی شان و شوکت، سواری کا جلوس، ان کی ضیافت اور سخاوت کا ذکر، اسلامی عمارتیں اور اسلامی شہروں کا حال یہ سب باتیں بیان کریں گے،

تیسرا حصہ علوم و آداب اور شعر و صناعت کے بیان میں ہوگا جس میں یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام سے قبل تا ۳۵۰ھ عراق میں ان چیزوں کی کیا حالت تھی؟ اور مسلمانوں نے اس میں کیا ترقی کی، اس ترقی کی تاریخ اور منشاء وغیرہ سب باتوں کا ذکر ہوگا،

چوتھے حصہ میں اس زمانہ روشن کے آداب معاشرت سے مناسب موقع بحث کیجائیگی، پھر اسلامی تمدن کے ساتھ جدید یورپی تمدن کا تعلق بیان کرکے یہ بحث انشاء اللہ ختم کر دی جائیگی اور اسلامی تمدن کے آثار کا سابقہ حصوں میں تفصیل ذکر ہوچکنے کے بعد سپارہ میں جو کچھ لکھا جائیگا وہ بہت صاف اور واضح ہوگا۔

یہاں تک ہمنے جسقدر امور بیان کئے ہیں ان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مضمون زیر بحث نہائت دشوار اور پیچیدہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں ایک نیا کام ہے حالانکہ اس معاملہ میں خود ہم بہت ہی قاصر ہیں، یہ تمہید اس معذرت کی بناء ہے جو اس کتاب میں نقائص واقع ہونے پر بالآخر ہم کو پیش کرنی ہوگی، لہذا تمام اہل فضل و کمال حضرات سے ہم سماجت کی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور آراء سے ہماری امداد فرمادیں تاکہ ہم آئندہ حصوں میں ان سے انشاء اللہ نفع اٹھائیں،،

تمہیدی مقدمات

کسی قوم کے تمدن سے بحث کرتے وقت اس کی عظمت، ثروت اور ملکی وسعت پر بھی غور کرنا ضروری ہوتا ہے نیز یہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ شہری زندگی کے اسباب و نتائج میں سے کن چیزوں نے اسکے تمدن کا ساتھ دیا تھا اس میں علم، ادب، اور صنعت و حرفت اور اس کے لوازمات شلاً مدرسوں، مکتبوں اور انجمنوں کی تاریخ سلطنت کے حالات کا مفصل بیان اس کے مناصب اور وہ اسباب جن سے یہ سلطنت خوشحالی کی انتہا کو پہونچی اور اسبات کا بیان کہ اس کے طرز معاشرت میں اس کا کیا اثر تھا، سب امور کو ذکر کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس قوم کے عادات اور طرز معاشرت بیان کرتے ہوئے ان باتوں کی نسبت ان کے اسباب و بواعث کی طرف کی گئی ہو۔

اس کے علاوہ جبتک اس قوم کے زمانہ بداوت (وحشت) کے حالات مع اس امر کے بیان نہ کردیئے جائیں کہ وہ شہری زندگی کیجانب کس طرح بڑھی، اور اس ترقی کے اسباب کیا تھے جنھوں نے اس امر میں اس کی مدد کی، اسوقت تک اس تمدن کا بیان پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتا۔ یہ بحث یوں تو عام طور پر ضروری ہے، مگر اسلامی تمدن کی تاریخ میں خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں چند خاص اسباب اور ذریعے ایسے موجود ہیں جن کا وجود دوسری قوموں کی تمدن میں نہیں ہے۔

بنا برین ہم کو سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ ہم اس کتاب کو چند تمہیدی مقدمات کے ساتھ شروع کریں جن میں اسلام سے قبل عرب کی حالت اور تمدن کیساتھ انکی مناسبت اور جو امور اس قوم کے حالات سے اسلامی دعوت کے قبل گذرے ان سب کا مفصل بیان ہو، ساتھ ہی یہ امر بھی دکھادیا جائے کہ اسلامی دعوت کے ظاہر ہونے کیوقت جزیرہ نمائے عرب کی کیا کیفیت تھی روم اور فارس کے باشندے ان دنوں کس رنگ میں تھے اور وہ کون سی بات تھی جسنے اہل عرب کو باوجود قلیل التعداد اور بے سر و سامان ہونے کے ان سلطنتوں کو فتح کر لینے میں امداد پہنچائی، اسلامی سلطنت کس طرح قائم ہوئی اور اسنے خلفائے راشدین کے زمانہ میں دینی حیثیت رکھنے کے ساتھ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں دنیوی حکومت اور سیاسی حالت کیطرف کیونکر ترقی کی، اس بحث سے فراغت پاکر ہم انشاء اللہ اسلامی حکومت کی وسعت اور اس کے کاروبار کی تاریخ پر گفتگو کرینگے۔ لہذا ہم تمہیدی مقدمات کو آغاز کرتے ہیں۔

عرب اور تمدّن

بعض یورپین وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ عرب والوں کو اسلامی تمدن قائم کرنیکے بارہ میں کوئی فضیلت نہیں حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے اس تمدّن کی بنیاد رومانی (یونانی) اور فارسی تمدّن کے کھنڈروں پر قائم کی تھی ان لوگوں کی رائے میں اسلامی تمدن سے وہ تمدن مراد ہے جو مذکورہ بالا دونوں قوموں کی تمدنوں سے مل ملا کر ایک عطر مجموعہ کی صورت میں بنا لیا گیا اور ضرورت وقت کے لحاظ سے اُنمیں کسیقدر تغیر اور تبدّل بھی کر دیا گیا۔

اُن کا قول ہے کہ اہل عرب اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے شہری زندگی سے دُور رہتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اس قول کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اہل عرب نے جاہلیت اور اسلام کے زمانوں میں اپنی جانب سے خود کسی تمدن کی بنیاد نہیں قائم کی۔ لیکن ہمارے نزدیک عرب والے دوسری قوموں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کاروبار کو فروغ دینے اور ملک کا انتظام کرنیکی استعداد رکھتے تھے۔ وہ ان قوموں سے کسیطرح کم نہ تھے۔ جنہوں نے قدیم یا جدید زمانہ کے اندر تمدن میں ترقی کی ہے اور اسباب کی تمہید میں ہمارا حسب ذیل بیان قابل غور ہے۔

جزیرہ عرب کے باشندے دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں۔

(۱) قحطانی یعنی ملک یمن اور اسکے آس پاس کے رہنے والے جو اپنا نسب قحطان یا یقطان سے ملاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ نسب ارفخشاد کے ذریعہ سے سام بن نوح پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

(۲) اسماعیلی۔ یا عدنانی۔ یہ لوگ حجاز۔ نجد اور ان کے قرب و جوار کے باشندے ہیں۔ اور اپنے نسب کا سلسلہ ابراہیم خلیل اللہ کے بیٹے اسمعیل سے ملاتے ہیں جو بی بی ہاجرہ کے بطن سے تھے۔ ان لوگوں کو عدنانی بھی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اجداد میں ایک شخص عدنان گزرے ہیں اور اسی قسم کی وجہوں سے ان کو مُضری اور معدی بھی کہا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے لوگ زیادہ تر جزیرۂ عرب کے اس حصہ میں سکونت رکھتے تھے جو بالکل بے آب و گیاہ ہے اور وسط ملک میں واقع ہے۔

قحطانی عربوں نے اسماعیلی عربوں سے بہت پہلے تمدن میں اپنی ترقی عیاں کی تھی اسلئے کہ بہ نسبت اسماعیلی عربوں کے ان کا ملک سرسبز اور شاداب زمینوں سے قریب تر تھا قحطانیوں کی یہاں قدیم زمانہ میں بہت سی حکومتیں قائم تھیں جو تمدن و عمارات اور شاہانہ شان و شوکت کی مظہر تھیں۔ سب سے زیادہ مشہور حمیر

کہلان اور سبا کی حکومتیں ہوئی ہیں، جن کے نامور شہر آرب۔ صنعا اور سبا وغیرہ تھے؛

اسماعیلی عربوں کی بھی ولادت مسیح سے قبل اور بعد میں کئی نامور حکومتیں گذر چکی ہیں مثلاً فلسطین کے اطراف میں نبطی حکومت اس کے علاوہ اُن متمدّن قوموں کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو بائدہ عرب کے گروہ میں نہایت اعلیٰ ترقی کر چکی ہیں، مثلاً عاد، ثمود، طلسم اور جدیس وغیرہ اُن قوموں کے کاروباری فروغ کا عہد اقوام عرب میں سب سے قدیم ہے اور ان کا نسب غالباً لاوذ بن سام بن نوح سے ملتا ہے: نیز عمالقہ کا مشہور و پُر شوکت اور صاحب طاقت گھرانا بھی انہی بائدہ عرب کے زمرہ میں سے تھا جنکا ذکر قدیم تاریخ میں پایا جاتا ہے اور اسکا مفصل بیان سال پنجم کے الہلال نمبر ۸ میں بھی کیا گیا ہے

اس تمہید کے بعد یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اسلامی تمدن اہل عرب کے کاروباری فروغ دکھانے کا پہلا زمانہ نہیں تھا، بلکہ اس سے قبل بنو حمیر کہلان اور سبا کے خاندان بھی ممالک مشرق اور مغرب کے مابین عقد تجارت کا واسطہ ہو چکے ہیں کیونکہ یمن کا ملک اس زمانہ کے متمدّن ممالک کے وسط میں واقع ہوا تھا؛ ہندوستان کا تجارتی مال بحر ہند کی راہ سے یمن اور حضرموت کو جایا کرتا تھا، اور یمن کے لوگ اسے حبش مصر اور فینیقیہ کو لیجاتے تھے؛ بلکہ اس سے بھی آگے؛ اور وہی عمالقہ اور دیگر قوموں تک پہنچاتے تھے اور بلاد مغرب میں بھی اسکی تجارت کرتے تھے: اسماعیلی عربوں نے بادیہ کے انتہائی کناروں تک خشکی کے راستہ سے اپنی تجارت کا سلسلہ بڑھا رکھا تھا اور وہ اس زمانہ کے آباد ملکوں میں عقد تجارت کا واسطہ بنے ہوئے تھے؛

علاوہ اس کے کہ عرب کا ملک اُن دنوں کے متمدّن ملکوں کے وسط میں واقع تھا تجارت کے کاروبار بڑھانے اور تمام ممالک سے تجارتی رابطہ پیدا کر لینے میں اہل عرب کو اس بات نے اور بھی مدد پہنچائی کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جو اس عہد کی اکثر متمدن قوموں کی زبانوں سے مشابہ تھی، اس لئے کہ ان دنوں سامی زبانیں تلفظ اور معنے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ملتی ہوئی تھیں گویا کہ عربی۔ کلدانی، اشوری، عبرانی، حبشی، اور فینیقی لوگ اُن ایام میں بلا کسی ترجمان کے باہم گفتگو کر سکتے اور ایکدوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے اسلئے کہ ان کو ایک اصل زبان سے نکل کر الگ الگ زبانیں بنے ہوئے بہت کم مدت گذری تھی اور ان کی وہی حالت تھی جو آجکل کی بازاری عربی اور فصیح زبان عرب کی ہے کہ انمیں نسبتاً بہت تفاوت نہیں، اسی وجہ سے اگر کوئی عرب قبیلہ حمیر یا مضر کا ملک عراق میں وارد ہوتا تو اس کو کلدانی۔ بابلی اور اشوری لوگوں سے بات چیت کرنے میں کسی ترجمان کی

حاجت نہوتی تھی اور اسیطرح جب وہ فینیقیہ یا حبشہ میں داخل ہوتا تو وہاں کے باشندوں کی زبانیں بھی بخوبی سمجھ لیتا۔ اسکی مثال یوں سمجھو کہ اس زمانہ میں ملک شام کا رہنے والا آدمی مصر والوں کی زبان بہت خوبی سے سمجھتا ہے اور ہم اپنے اس بیان کی تائید میں وہ واقعہ پیش کرتے ہیں جو کتاب مقدس تورات میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی بابت مذکور ہے کہ آپ ولادت مسیح سے تقریباً دو ہزار سال قبل کلدان کے ملک سے نکل کر سوریا فینیقیہ اور عرب کے ملکوں میں سیر کرتے پھرے وہاں کے لوگوں سے ملے جلے اور انمیں رہے لیکن انہیں وہاں کے رہنے والوں سے بات چیت کرنے میں کسی ترجمان کی حاجت نہ ہوئی۔ اور اسیطرح پندرھویں صدی قبل مسیح کے قریب بنی اسرائیل اپنی بیابان نوردی کی حالت میں چالیس برس تک جزیرہ عرب کے بالائی حصّوں میں مارے مارے پھرتے رہے مگر ان کو بھی وہاں کے رہنے والوں سے گفتگو کرنے میں کسی ترجمان کی ضرورت نہ پڑی۔

اب یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ اہل عرب اصل فطرت اور نسب کے اعتبار سے بھی حضارت اور تمدن کے اہل تھے اسلئے کہ وہ اشوریوں، کلدانیوں، فینیقیوں کے بھائی اور ہم نسل تھے اور ان کو بھی وہ اہلیت و استعداد حاصل تھی جو ان قوموں کو حاصل تھی۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ اقوام مذکورہ کے لوگ ایسے ملکوں میں آباد ہوئے جو زرخیز اور سیر حاصل تھے، اور اہل عرب نے اس قسم کے جزیرہ میں سکونت اختیار کی جس کے اکثر حصے ریگستانی اور بے آب و گیاہ تھے نہ ان میں نہریں تھیں اور نہ بہتے ہوئے چشمے۔ وہ صرف مینہ کے پانی سے سیراب ہوتے تھے اور اہل عرب کے دوسرے بھائی اشوری لوگوں نے عراق کے ملک میں وطن بنایا جو تمام روئے زمین کے ممالک میں سب سے زیادہ سرسبز اور زرخیز ملک ہے، یہانتک کہ ملک مصر سے بھی اس کا نمبر بڑھا ہوا ہے اسوجہ سے انکی دولتمندی بڑھی اور مال و دولت نے انکی مخفی قوتوں کو ابھار کر انکی عقل و فہم کو بارآور کر دیا۔ ظہور اسلام کے بعد جب اہل عرب کو اس سرسبز وادی (عراق) میں بود و باش کا موقعہ ملا تو انکا تمدن بھی اپنے اگلوں (اشور والوں) سے ہرگز کم نہیں رہا۔

ان سب باتوں کیساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ عرب والوں نے کسی ایسی بات میں جسکی توقع جزیرہ عرب کے باشندوں سے ہوسکتی تھی کوئی کمی نہیں کی، صرف یمن والوں کا تمدن اس قسم کا مشہور تمدن گزرا ہے، جسکے آثار آج تک حضرموت۔ حیرہ اور یمن کے ملکوں میں ریت کے ڈھیروں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ عاد ثمود، اور باشندۂ عرب کے دوسرے قبائل کا تمدن جو نہایت اعلےٰ درجہ کا تمدن تھا اس سے ہم اسلئے بحث

نہیں کرتے کہاں کی تاریخ اور خبروں میں سے ہمارے پاس بجز ان قصص و حکایات کے جنکو اہل عرب نے ان قبائل کی بنائی ہوئی شاندار عمارتوں کے متعلق روایت کیا ہے اور کوئی مواد موجود نہیں ہے اور وہ قصے بھی خارج از بحث ہونے کی وجہ سے آج ہمارے نزدیک خرافات سے زیادہ قعت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ وہ ہے جسے عرب والے شہر ارم ذات العماد کی نسبت یوں بیان کرتے ہیں:

شداد بن عاد نے **احقاف** کی سرزمین کے ایک قطعہ اراضی جس کی مساحت دس فرسخ (۳۰) میل مربع تھی ایک شہر تعمیر کرایا تھا اس کی شہر پناہ کی دیواریں ملک یمن کے عقیق (پتھر) سے بنائی گئی تھیں اور ان کے اوپر تمام چاندی کے پترے منڈھے گئے تھے جن پر سنہری گنگا جمنی بیل بوٹے منقوش تھے اس شہر کے اندر ایک ہزار محل بنے ہوئے تھے اور ہر ایک محل زبرجد اور **یاقوت** کے سو سو گز بلند ستونوں پر قائم تھا۔ شہر کے وسط میں متعدد نہریں جاری کی گئی تھیں اور ان نہروں میں چھوٹی چھوٹی نالیاں نکال کر قصروں اور محلوں میں پہنچائی گئی تھیں۔ اس شہر کی مٹی مشک و عنبر اور وہاں کی کنکریاں سونے کی ٹکڑے اور یاقوت اور زبرجد وغیرہ جواہرات تھے اس کے علاوہ اسی قسم کی اور باتیں بھی مروی ہیں جو احتمال کے قاعدے سے بھی باہر ہیں تاہم یہ تمام باتیں کچھ نہ کچھ صلیت کی جھلک ضرور دکھاتی ہیں۔ اگرچہ ہم ان کو لاکھ درجہ بے اصل و بے حقیقت سمجھیں پھر بھی ہم انہیں اس درجہ سے ہرگز نہیں گرا سکتے کہ قوم عاد کی بعض عمارتیں مرصع رہی ہوں اور انکی کسی کسی دیوار یا ستونوں میں بیش قیمت جواہرات سے پچی کاری کی گئی ہو کیونکہ یہ صورت شان و شوکت دکھانے کی انتہائی حد ہے اور تمدن کے زمانے کے علاوہ کسی اور وقت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

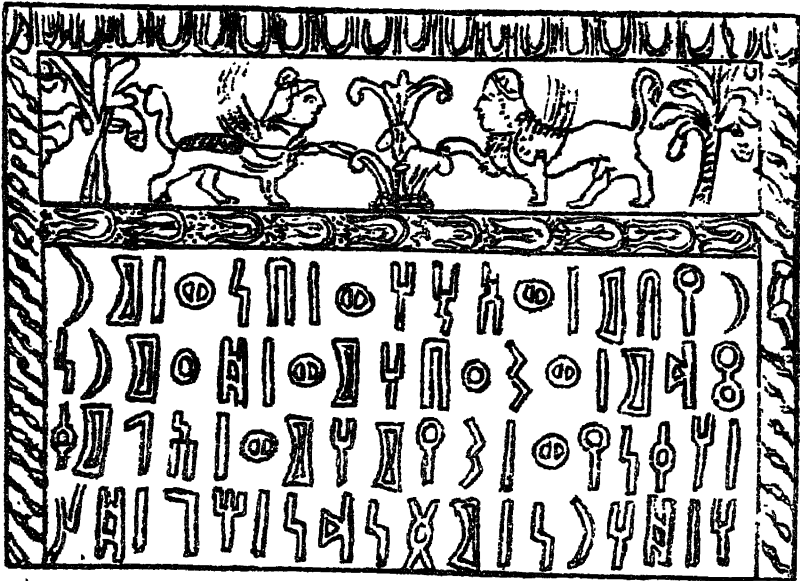
قحطانی عربوں کے مشہور خاندان حمیر سبا اور کہلان ہیں جن کا ذکر اوپر بھی ہو چکا۔ ان کی حکومت کا زمانہ عاد اور ثمود کے ایام سے متصل گذرا ہے اور سیاح لوگوں نے انکے کچھ آثار کا پتہ بھی لگایا ہے جو اکثر صنعا عدن اور حضرموت کی قدیم عمارتوں کے کھنڈر ہیں جنکے اندر سے مستند حمیری خط میں لکھی ہوئی تختیاں برآمد ہوئی ہیں۔ انپر اکثر دینی دعاؤں کی عبارتیں یا اسی طرح کی اور باتیں منقوش ہیں۔ مگر ان محققین کو ابھی تک ان عظیم الشان دفینوں کے نکالنے پر قدرت حاصل نہیں ہو سکی ہے جو وسط ملک کے اندر مدفون ہیں کیونکہ وہاں تک کسی کی رسائی دشوار ہے یہ تمام باتیں ان شہادتوں کے علاوہ ہیں جنکو عرب مورخین نے ان سلطنتوں کے جاہ و جلال کے باب میں نقل کیا ہے۔ گو اسلام سے بہت پیشتر یہ حکومتیں مٹ مٹا چکی تھیں لیکن اس زمانہ تک انکے قصے بہت کچھ مشہور و معروف تھے اور ان حکایتوں سے اس قسم کے ایک قدیم تمدن کا سراغ

ملتا ہے جو اشور، مصر، اور فینیقیہ والوں کے تمدن سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

ان قوموں نے شہر آباد کئے، محل اور قصر بنوائے، باغ لگائے بت تراشی کی صنعت کو فروغ دیا۔ کانیں کھودیں، فوجی نظم و ترتیب قائم کی، ممالک فتح کئے اور تجارت کے کاروبار کو بڑھایا غرضکہ تمدن کی دنیا میں بہت خوبی کیساتھ حصہ لیا اور کاروباری زندگی کا نمونہ دکھا کر اپنے تئیں قابل تمدن ثابت کر دکھایا۔ یونان کے مشہور سیاح ہیرو ڈوٹس نے ولادت مسیح سے پانچسو سال قبل ان قوموں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملک عرب کے صرف جنوبی حصہ میں بخورات، مُر، قرفہ، دارچینی اور لاون وغیرہ چیزیں پائی جاتی تھیں۔ اور سیاح مذکور کا بیان ہے کہ وہ ملک اپنے زمانہ کے تمام دوسرے ملکوں سے زیادہ مالدار تھا۔

یمنی عربوں کے ان کارناموں میں جنکے ذکر سے تاریخ کے صفحے بھرے پڑے ہیں اور جنکو فن تعمیر کے عجائبات میں شمار کرتے ہیں وہ مشہور بند بھی ہے جسکو سدّ مارب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے عرب والوں نے ولادت مسیح سے تقریباً دو صدی قبل اس بند کو ایسے طریق سے تعمیر کیا تھا جسطرح کہ محمد علی پاشا حاکم مصر نے ڈیلٹا کے سرے پر قناطر خیریہ تعمیر کرائے تھے۔ ان پلوں اور اس بند میں صرف اس قدر فرق تھا کہ ان کے اندر در بنائے گئے ہیں اور وہ بند بے در تھا۔ اس کی صورت مثل ایک دیوار کے تھی جو دو پہاڑوں کے مابین قائم کی گئی تھی اور اس پانی کو روکنے کا کام دیتی تھی جو ان پہاڑوں کے بیچ میں بہتا تھا وہ پانی اس بند کے ذریعہ سے بلند ہو کر دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں کو لگکے انتہائی سروں تک سیراب کر دیتا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ بند ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا (۹ میل مربع) بنایا گیا تھا اور اہل عرب نے اسکے اندر بہت سی شاخیں اور نہریں بھی تعمیر کی تھیں۔ اس بند سے ستر وادیوں کو لاکر ملا دیا تھا جن سب کا پانی آکر ایک دوسرے میں گرتا اور جمع ہوتا تھا اتنا بڑا اور عظیم الشان بند تعمیر کرنا فن انجنیرنگ کی کامل مہارت اور بہت بلند ہمت کا محتاج ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس بند کی بنیاد اسقدر مستحکم تھی کہ اسنے کئی صدیوں تک پانی کے صدموں کو برداشت کیا اور ہوا کی مخالفتوں کو جھیلا۔ آخر جبکہ قحطانی عربوں کی حکومت کمزور ہو گئی اور اسکی حالت ردی ہو گئی تو اسمیں اتنی طاقت نہ رہی کہ اس بند کو نئے سرے سے تعمیر کرائے یا اس کی پوری طرح مرمت ہی کرا سکے لہذا وہ منہدم ہونیکے قریب پہنچ گیا اہل عرب نے دیکھا کہ اب چند دنوں میں یہ بند ٹوٹ جائیگا تو وہ دوسری صدی عیسوی کی وسط میں اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہونے لگے۔ اسی پرہیبت قوم کے یادگار گھرانے ملک شام میں بنی غسان سرزمین عراق میں بنو بند، مدینہ میں اوس، منا میں ازد، اور قرب و جوار مکہ میں بنو خزاعہ کے کارناموں سے مشہور تھے ان گھرانوں

کے ترک وطن کر چکنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ بند بھی ٹوٹ گیا اور اسکا پانی سارے ملک میں پھیل گیا
اسوقت باقیماندہ لوگوں نے بھی وطن مالوف کو خیرباد کہا اور دوسرے مقامات میں جا کر آباد ہو گئے اس بند
کے ٹوٹنے کو "سیل عرم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس عظیم الشان سیلاب کا
زور اپنے ساتھ سبا کی حکومت کو بھی بہا لے گیا اور اسکا خاتمہ کر دیا۔ ملک روم کے مشہور سیاح استرابون نے
پہلی صدی قبل مسیح مآرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک عجیب شہر تھا اسکے مکانوں کی چھتیں
سنہری پتروں اور ہاتھی دانت کے ٹکڑوں سے مزین تھیں اور انمیں اعلےٰ درجہ کے جواہرات بھی جڑے ہوئے
تھے۔ وہاں بہت سے خوشنما اور بیش بہا ظروف اس قسم کے نظر آئے جنھوں نے عقل دنگ کر دی اس بیان کو پڑھکر
ہمیں ان قصوں میں بھی کسیقدر راستی کی بو آنے لگی ہے جنکو اہل عرب نے "ارم ذات العماد" کے بارہ میں نقل کیا ہے۔



خط حمیری

ہمارے خیال میں آثار قدیمہ کے متلاشی اگر حمیر اور سبا کے حکمران گھرانوں کے دارالسلطنتوں، مآرب
اور صنا وغیرہ کے کھنڈروں کو کھودتے کریدتے تو یقین ہے کہ ان کو ایسے قیمتی نشانات دستیاب ہوتے جو دنیا
پر ایک نئی تاریخ کا راز ظاہر کر دیتے۔ جس طرح وادی نیل کے آثار نے فراعنہ مصر کی تاریخ پر سے پردہ الٹ
دیا ہے اور جس طرح کہ وادی فرات کے آثار نے اشور اور بابل کے حکمرانوں کی تاریخ منکشف کر دی ہے۔ مگر یہ صورت

اسی وقت ممکن ہے جبکہ دولت علیہ مصر توجہ فرمائے اور علمی تحقیقات کرنے والوں کو اس ملک میں سرگرم تلاش و تحقیقات ہونے کیلئے روانہ کرے۔

اسلام سے پیشتر جن عربی قوموں نے تمدن میں نمایاں حصہ لیا ہے انہیں میں سے ایک نبطی قوم بھی ہے اسکی وجہ تسمیہ نبایوط بن اسماعیل کیجانب منسوب ہے۔ اور نیز انکی نسل سے ہونا۔ یہ قوم شہر بطرا (Petra) کی رہنے والی تھی جو فلسطین اور جزیرہ سینا کے کسی قدر حصے کے مابین واقع تھا؛ اس کی حکومت جزیرہ سینا کی اس حصہ پر جو اُن کے مسکن میں داخل تھا معہ آس پاس والے دوسرے حصوں کے پھیلی ہوئی تھی جو جزیرہ عرب کے ایک سرے سے وسط ملک حجاز تک حمت ہوئے نبطی قوم مشرقی اور مغربی ملکوں کے اندر عقد تجارت کا واسطہ تھی وہ اپنے عروج کے زمانہ میں رومن امپائر کی ہمعصر تھی اور اکثر حالتوں میں اس نے بعض رومانی جنرلوں کی قوت بازو بنکر انکے دشمنوں سے جنگ کی ہے؛ نبطیوں کے ایک حکمران ملک حارث نام کو پہلی صدی قبل مسیح میں کچھ زمانہ کیلئے دمشق کی سلطنت بھی مل گئی تھی۔ یہ واقعہ غسانی حکمرانوں کے وجود سے صدیوں قبل کا ہے دوسری صدی عیسوی کے ابتدائی دور تک نبطیوں کی حکومت کا عروج اپنے کمال پر رہا اور اس کے بعد رومن امپائر کی زبردست قوت نے اپنا تسلط جما کر ان کو تباہ و برباد کردیا اس قوم کی عمارتوں کے کھنڈر آج تک بلاد بطرا میں موجود ہیں جنپر نبطی خط میں لکھے ہوئے کتبے دستیاب ہوتے ہیں؛ نبطی خط بھی حمیری خط کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

خط نبطی

عمالقہ کی قوم بھی منجملہ انہیں عربی اقوام کے ہے جنہوں نے قدیم زمانہ کے اندر تمدن کے لحاظ سے اچھی ترقی کی؛ یہ قوم اپنی ہیبت اور جلال میں مشہور اور بےمثل گذری ہے اور وہ مشہور ملوک رعاۃ (چرواہے سلاطین) اسی قوم سے تھے جنکی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مصر کا ملک فتح کرکے اُسپر کئی صدیوں تک حکمرانی کی؛ ان قوموں کی حکومتوں کے علاوہ قحطانی عربوں کی وہ نو آبادیاں بھی جو ان لوگوں نے سیل عرم کے بعد دوسرے ملکوں میں قائم کی بہت کچھ قابل لحاظ ہیں؛ جن کے بڑے بڑے مشہور شہروں میں سے غسانی خاندان کا آباد کیا ہوا شہر بصریٰ حوران کے ملک میں؛ اور منذری گھرانے کا بسایا ہوا شہر حیرہ عراق کے بلاد میں واقع تھا اور ان دونوں شہروں کی آبادی اور رونق کے تذکرے آجتک باقی ہیں؛ اب ہم ایک سوال کرتے ہیں جسکے جواب

میں ہم کو امید ہے کہ انصاف پسندی کو ملحوظ رکھا جائیگا۔ وہ سوال حسب ذیل ہے۔

"کیا اسقدر باتوں کے معلوم کر چکنے کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اہل عرب فطرتہً تمدن سے دور رہیں، یا تھے؛ اور ان کو تمدن میں کسی طرح کی مداخلت نہیں تھی۔"

ہم کو اس امر سے مطلق انکار نہیں ہے کہ اسلامی تمدن کی بنیاد رومانی اور فارسی تمدن کے کھنڈروں پر قائم ہوئی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی ضرور ہے کہ اس معاملہ میں اہل عرب کی بھی وہی حالت تھی جو یونانی رومانی، فارسی اور تمام دوسری عظیم الشان حکومتوں کی حالت رہ چکی تھی۔ یونانیوں نے ابتداءً اپنے تمدن کے اصول مصر والوں سے حاصل کئے؛ پھر رفتہ رفتہ انہیں وسعت اور اضافہ کر کے طبعی تاثیرات کے اقتضا سے اسے اپنا بنا لیا کہ خاص انہیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رومانیوں نے اہل یونان سے اخذ کیا۔ مگر انہوں نے اصل میں بہت کم تغیر و تبدل کو دخل دیا[1] فارس والے بھی دوسروں کی شاگردی میں داخل رہے انکے تمدن کی بنیاد اشوری، بابلی اور کلدانی قوموں کے تمدن کے کھنڈروں پر قائم کی گئی جو ان سے قبل گذر چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی فارس والوں نے اپنے تمدن میں یونانی لوگوں کا بھی چربہ اتارا تھا، مگر ان مذکورہ بالا قوموں اور اہل عرب کے تمدن میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ان قوموں نے حضارت میں کئی کئی صدیوں کے بعد کچھ نمود دکھائی اور عرب والوں کی دولت کو قائم ہوئے پوری ایک صدی بھی نہیں گذری تھی کہ انکے تمدن کا تمام عالم میں ڈنکا بج گیا، دنیا پر ان کی عقلی قوتوں کا اظہار ہو چلا اور دوسری اور تیسری صدی میں تو انہوں نے ایسی ترقیاں کیں کہ انکے علوم و آداب کے چشموں نے سارے جہان کو سیراب کر دیا۔

اسقدر بیان پر اتنا اضافہ اور بھی کرنا چاہیئے کہ جرمنی قومیں جنہوں نے آجکل اس آخری زمانہ میں دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر لی ہے اور اپنے تئیں بہت طاقتور حکومت بنا لیا ہے یہی قوم تھی جسنے اسلام سے قبل اور بعد بہت سی صدیاں اس حال میں بسر کی ہیں کہ رومن امپائر پر چھاپے مارتی رہتی تھی اس طریقہ سے انہوں نے سلطنت روما کے بہت سے شہر بھی فتح کر لئے اور انمیں سے بعض بعض منچلے لوگ خاص شہر رومیہ میں بھی داخل ہو گئے؛ لیکن اس کی ان فتوحات کا نتیجہ بیکار لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان لوگوں کی فتوحات کا سیلاب پانچویں صدی عیسوی میں نہایت زوروں پر رہا۔ انہوں نے رومن امپائر کا

[1] جس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ یونانی اور رومانی قومیں پاس پاس ملکوں کی رہنے والی تھیں اور ان کے طبائع میں ہمجنسی کی وجہ سے بہت کم فرق تھا۔ مترجم۔

شمالی اور مشرقی حصہ بالکل پامال کر ڈالا، ہونکاریا، رومانیا، اور تمام یوروپین ٹرکی کو فتح کرکے
وہاں ایک زبردست حکومت قائم کی، اس حکومت کا نام، خاقانوں کی حکومت، مشہور ہوا۔ اور یہ دو صدیوں
تک پوری طرح قائم رہی، جس طرح عرب والوں نے مصر، عراق، اور شام کو فتح کرکے وہاں اپنی حکومتیں قائم
کی تھیں، مگر کوئی نہیں بتا سکتا، کہ ہونی لوگوں نے اپنی جانب سے کسی تمدن کی بنیاد رکھی ہو، یا انہوں نے
اسی حضارت کو باقی رکھا ہو جو اُن کی فتوحات سے قبل انکے ممالک میں پائی جاتی تھی، اس مقام پر یہ سوال
کرنا غیر مناسب نہوگا کہ ہونی، لوگوں نے باوجود اس کے کہ وہ لوگ عرب کی بنسبت یونانی تمدن
کے مرکز سے قریب تھے، کیوں اس میدان میں قدم نہیں رکھا؟ چھٹی صدی عیسوی کے اندر سلافی
قوم کے لوگوں نے رومن امپائر پر کس زور شور سے حملہ کیا؟ وہ بڑھتے ہی چلے گئے، یہانتک کہ قسطنطنیہ
کے دروازوں تک جا پہنچے، باوجود اس بات کے وہ جیسے گئے تھے ویسے ہی خالی واپس آگئے اور تمدن
کے میدان میں ایک قدم تک نہیں رکھا اسی طرح سے اور بھی بکثرت چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور قوموں
نے تاتاری اور مغلی اقوام میں سے ایسے ہی جوش وخروش کے ساتھ فتوحات کا ڈنکہ بجایا، لیکن ہو،
تیمور لنگ وغیرہ کی فوجوں نے عربی حکومت کو کمزوری کے زمانہ میں زیروزبر کردیا، اپنا مطیع بنا کر
وہاں کے بادشاہوں کو اپنا حلقہ بگوش کیا، لیکن انہوں نے کوئی تمدن نہیں قائم کیا، اور نہ اسی تمدن کو
باقی رہنے دیا جو اُنسے پہلے رائج تھا، کیا یہ باتیں اس امر پر دلالت نہیں کرتیں کہ اہل عرب میں تمدن قبول کرنیکی
ایک خاص استعداد تھی اور وہ حضارت (شہری زندگی یا آبادکاری) کے لئے فطرتاً موزوں تھے۔

حجاز میں جاہلیت کا زمانہ

جزیرہ عرب کے جنوبی اور شمالی حصوں کے باشندوں نے تمدن میں بہت کچھ نمایاں ترقیاں کیں۔ لیکن
وسط ملک کے رہنے والے اہل حجاز اپنی اسی جنگلی اور وحشیانہ زندگی میں بسر کرتے رہے، کیونکہ وہاں کی
سرزمین خشک اور بے آب وگیاہ ہونیکے علاوہ ملک اس عہد کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ساتھ ٹکر کھانے سے
بھی بوجہ بعد مسافت محروم تھا اس کے وسط صحرا میں واقع ہونے اور راستہ کے دشوار گذار ہونیکے باعث
سے بڑے بڑے فاتحان دنیا بھی وہاں نہ جاسکے، مثلاً چودہویں صدی قبل مسیح میں رعمسیس دوم اور چوتھی صدی

قبل مسیح میں اسکندر اعظم اور پہلی صدی عیسوی میں بعہد قیصر آگسٹس ایلیوس عالوس جیسے بلند ہمت فاتح بھی جزیرہ عرب کے اس صوبہ (حجاز) کا رخ نہ کرسکے اور نیز فارس کے اولوالعزم بادشاہوں کے عروج حکومت میں بھی کوئی وہاں نہ جاسکا، حجازی عربوں کو اس قدرتی حفاظت نے کچھ ایسا مطمئن اور بے کھٹکے بنادیا کہ وہ اپنی حالت میں ہی خوش رہنے کے عادی اور گدڑی میں مست کے مصداق ہو گئے؛ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان اگر کسی خطر یا بے چینی پیش آنے کے اصلاح کا خواہشمند نہیں ہوا کرتا؛ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ فطرۃً نفسانیت رکھنے والا اور جاہ طلب پیدا کیا گیا ہے اسی سبب سے خود اہل عرب ہی کے مابین بہت سی نزاعیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور انکا ذریعہ معاش صرف باہمی جنگ اور لوٹ مار بن گیا؛ اسی شغل نے انہیں اپنی طرف اسقدر مائل کرلیا کہ وہ کسی دوسرے کام کی جانب متوجہ ہونا بھول ہی گئے؛ پھر بھی وہ جاہلیت ہی کے زمانہ سے خودداری؛ ایفاء عہد؛ حوصلہ مندی اور کرم کی عمدہ صفات کے ساتھ متصف تھے اور ان کی یہ حالت اس امر پر دلالت کرتی تھی کہ آئندہ زمانہ میں کسی بڑی عظمت و شوکت حاصل ہونے کی ان میں استعداد و صلاحیت موجود ہے؛

اہل حجاز نے بیشمار صدیاں اپنی اسی بدویانہ زندگی میں بسر کیں جنکی صحیح تعداد صرف خدا ہی کو معلوم ہوگی اس زمانہ میں وہ اپنی اسی فطرتی جنگلی زندگی کے عادی رہے؛ البتہ انہوں نے کسی قدر تمدن و تہذیب کی تعلیم ان لوگوں سے حاصل کی تھی جو غیر ممالک سے ترک وطن کرکے حجاز میں آن بسے تھے؛ یہ جلاوطن لوگ یہودی تھے؛ جو حضرت موسےٰ کے زمانے سے لیکر بعد کے زمانہ تک خاصکر اخیر قرون قبل مسیح اور پہلی عیسوی صدیوں میں اپنے رومانی حکام کے جور و ظلم سے بھاگ کر عرب کے خشک صحراؤں میں پناہ لینے آئے تھے اور بالخصوص بیت المقدس کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ آگئے تھے اور اسیطرح بسا اوقات کچھ نبطی لوگ بھی حجازیوں کے ملک میں آتے رہے جو متمدن دنیا کے رہنے والے تھے؛ ان تارک وطن لوگوں نے اپنے رومانی حکام کے ظلم و ستم سے دق ہوکر گھر بار چھوڑ دینے کے بعد مکہ؛ مدینہ؛ اور طائف کو اپنا مسکن بنایا؛ لیکن یہودیوں کی بابت غالب گمان یہ ہے کہ وہ اکثر مدینہ ہی میں رہتے تھے کیونکہ اس میں اوس اور خزرج کے نامی قبائل اُن کے ہم مذہب تھے؛

حجازی عربوں پر طرز معاشرت اور دین کے لحاظ سے یہودیوں کا بہت کچھ اثر پڑا؛ چنانچہ عربوں نے ان سے بہت سی ایسی باتیں سیکھ لیں جنکو وہ پہلے مطلق نہ جانتے تھے مثلاً حج، قربانیاں؛ نکاح؛ طلاق؛ ختنہ

اور تہواروں کے دن جلسے کرنا وغیرہ یہودیوں نے اُن کو توراۃ کے چند قصے بھی پڑھا دیئے اور تلمود کی کچھ فصلیں بھی تعلیم کیں اور اُن میں اپنی عادات و رسومات بہت کچھ پھیلا دیں۔ علاوہ بریں سیل ارم کے واقعہ کے بعد یمن کے بھی بہت سے لوگ عرب میں ہجرت کر آئے تھے۔ پس اس خلط ملط کی وجہ سے عرب کے دو گروہ بن گئے ایک تو اہل بادیہ جو اپنی نیچرل سادہ زندگی پر قانع رہے۔ یہ عرب رحل۔ یعنی خانہ بدوش کہلاتے تھے۔ اور دوسرا گروہ شہریوں کا جو مکہ۔ مدینہ۔ اور طائف میں رہتے تھے۔ یہ لوگ حضر یعنے شہری عرب کے نام سے مشہور ہوئے۔

چونکہ مکہ میں حج ہوتا تھا اور لوگ دور دراز ممالک سے کعبہ کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اسلئے حجاز کے شہروں میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ متواتر صدیاں گزرنے کے بعد وہ تجارت کی منڈی بھی بن گیا۔ کیونکہ ہر سال خاص خاص موسموں میں وہاں حجاج کا ہجوم ہوتا تھا اور خرید و فروخت بکثرت ہوتی تھی۔ لہذا جتنے زبردست قبائل کے سرداران قوم تھے۔ ان سب کی نگاہیں اسپر پڑنے لگیں اور وہ اسے اپنے قبضے میں کرنیکے خواہشمند ہوئے۔ اپنے ابتدائی دور میں یہ شہر خاص حجاز کے باشندوں (بنو اسماعیل) کے قبضہ میں تھا اور وہی لوگ کعبہ کے خادم یعنے حاذب تھے۔ مگر جبکہ دوسری صدی عیسوی میں سیل ارم کے بعد ملک یمن سے ہجرت کرکے بنو خزاعہ مکہ میں آئے تو انہوں نے اس شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور حجاز کے اصلی باشندوں کو اپنا محکوم بنا لیا۔ کیونکہ ان کے دماغوں میں تو اپنی حکومت یمن کے زمانہ سے بڑے سرداری سمائی ہوئی تھی۔ ان نوں اسماعیلی (یا عدنانی) لوگ بہت کمزور تھے تاب مقابلہ نہ لا سکے۔ مگر تاریخ عالم کے اصول نے ان پر بھی اسطرح اپنا حکم جاری کیا جیسا کہ اور قوموں پر ہوتا رہا ہے۔ پس چند صدیوں کے بعد بنو خزاعہ پر گردش زمانہ کا اثر ہوا انہیں کمزوری آئی۔ اور عدنانیوں کا زور ہوا۔ انکی تمام قوم میں سے ایک گھرانہ کنانہ کا علیحدہ اور ممتاز ہو گیا اور کنانہ کے گھرانے میں سے قبیلہ قریش نمودار ہوا۔

تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں اہل قریش کا سردار اور رئیس قصی بن کلاب بن مرہ نامی ایک شخص حکیم دانا۔ صاحب تدبیر و رائے تھا۔ اس نے متولی کعبہ کی بیٹی سے شادی کی۔ جو قبیلہ خزاعہ میں سے تھا۔ قصی کی آرزو اس شادی کے ذریعے سدانتہ[1] کعبہ کا حاصل کرنا تھا۔ قصی کے بہت سے بیٹے پیدا ہوئے جنکی وجہ اسکی عزت اور رعب داب میں ترقی ہوئی۔ نیز اس نے تجارت کا کاروبار پھیلا کر مال بھی خوب جمع کر لیا۔ جتنوں

---

[1] حاجب کعبہ کا منصب جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔ مترجم۔

اس کے خسر کی موت کا زمانہ قریب آیا تو اُسنے اپنی لڑکی یعنی قصی کی بی بی کے واسطے خدمت کعبہ ملنے کی وصیت کی، مگر اس عورت نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ میں عورت ذات ہوں کعبہ کے دروازہ کا کھولنا اور بند کرنا میری طاقت سے باہر ہے (خادم خانہ کعبہ کی اُن کے یہاں خدمت تھی) اسپر اُسنے اپنے ایک بیٹے کو جسکا نام محترش تھا خدمت کعبہ سپرد کیے جانے کی وصیت کی محترش نہائت کمزور اور منخنی سا آدمی تہا۔ اب قصیٰ کو خاصہ موقع ملگیا۔ اور اُسنے ایک مشک شراب کے بدلہ میں وہ معزز منصب محترش سے خرید لیا۔

قبیلۂ خزاعہ کو یہ خبر ملی تو اُنہیں بہت ناگوار گذرا اور بالآخر قبائل قریش و خزاعہ کے مابین جنگ چھڑ گئی بہت سی میدان داریوں کے بعد انجام کار دونوں قبیلوں نے صلح اور فیصلہ پنچائیت پر رضامندی ظاہر کی اور قریش ہی کے ایک معتبر شخص کو پنچ بنالیا۔ اُس نے قصیٰ کے حق میں فیصلہ دیا جسکے بعد ظہور اسلام اور فتح مکہ تک خدمت کعبہ قریش ہی کے گھر لنے میں رہی۔

کعبہ کی خدمت گویا دراصل مکہ کی سرداری ہوتی تھی قصیٰ نے میدان خالی پاکر اپنے عزیز دں قریبوں کو جو قریش ہی کے قبیلہ سے تھے، مکہ میں اکٹھا کرلیا اور خاص شہر اور قرب و جوار میں مقیم کیا، قریشیوں نے قصیٰ کو جملہ امور میں اپنا سردار بھی تسلیم کرلیا۔ قصیٰ نے مکہ کے چار ٹکڑے کر کے اپنے برادروں کو بانٹ دیئے اور سبھوں نے اپنی اپنی ملک میں مکانات تعمیر کر کے سکونت اختیار کی، اب گویا مکہ قریشیوں ہی سے آباد ہو گیا اور ہر ایک معاملہ میں قصی ان کا سردار و امیر بنگیا قصیٰ کے بعد اسکا جانشین اسی کا بیٹا عبد مناف ہوا عبد مناف کے لڑکوں میں دو لڑکے ہاشم اور عبد شمس نامی تھے، عبد مناف کی موت کا وقت قریب آیا تو اسنے خدمت کعبہ کی وصیت ہاشم کے لئے کی عبد شمس کا ایک لڑکا اُمیہ نامی (بنو امیہ کا جد) تھا اُسے اپنے چچا کی ریاست پر رشک آیا اور اس حسد کا انجام یہ ہوا کہ باہم جدائی ہونی قرار پائی، ہاشم تو اپنے بھتیجے سے جدائی پسند نہ کرتا تہا، مگر قریشیوں نے اُسے دق کر کے مجبور کر دیا، جسکی وجہ سے آخر کار اس نے پچاس اونٹنیاں دینے اور بیس سال تک مکہ سے باہر رہنے کی قید پر باہم جدائی منظور کی، اُمیہ نے اسپر رضامندی ظاہر کی اور خزاعی کاہن کو حکم قرار دیا، جو عسفان میں رہتا تہا دونوں نے اس سے فیصلہ چاہا تو اس نے ہاشم ہی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہاشم نے شرط کے مطابق اونٹوں کو نیک قربانی کی اور دعوت عام دی، امیہ ناکام ہو کر بیس سال کیلئے ملک شام کو چلا گیا، یہ پہلی عداوت تھی جو ہاشم اور اُمیہ کے مابین واقع ہوئی اور ان دونوں کی اولاد میں عہد اسلام تک اسکو بطور وراثت قائم رکھتی رہیں، ہاشم کے بعد اسکے فرزند عبد المطلب متولی کعبہ ہوئے جو پیغمبر اسلام کے جد تھے

عرب کے قبائل میں قریش کے گھرانے کا رتبہ ایسا تھا جیسا بنی اسرائیل میں لادیوں کا مرتبہ تھا۔ انہیں بھی وہی امتیازات حاصل تھے جو ان کو اپنی قوم میں تھے یہ اختیارات و مراتب عیسائیوں کے یہاں کے کاہنوں کے مراتب سے ملتے جلتے تھے۔

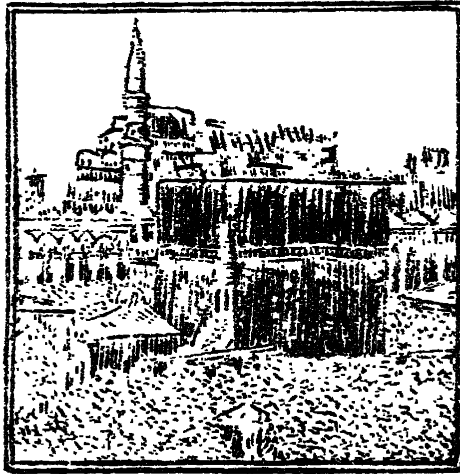
وہ سب پر حکمران تھے اور ان پر حاکم بالادست کوئی شخص نہ تھا۔ جس گھرانے میں چاہتے شادی بیاہ کرتے۔ اور اس بارہ میں انہیں کسی شرط کا پابند ہونا نہ پڑتا۔ اور اپنی لڑکیاں کسی غیر گھرانے والے سے اسوقت بیاہتے جبکہ اُس پر پکے اور کٹر دیندار بننے کی شرط لگا دیتے۔ فرائض و ارکان حج کا تقرر انہوں نے ہی کیا اور اُسے لوگوں کیلئے لازم انہیں نے بنایا تھا اور انہیں ہر امر میں خاص اختیارات و حقوق حاصل تھے۔

جاہلیت میں عرب کی حکومت

عرب سے ایک خاص صورت پر ہماری مراد حجاز کے باشندے ہیں۔ اور انہیں سے بھی مخصوص طور پر قبیلۂ قریش کے لوگ کیونکہ انہیں ہی اسلام کا ظہور ہوا جس کی وجہ سے تمدن اسلامی کی بنیاد پڑی جسے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں تمام اہل بادیہ (صحرائی عربوں) کے یہاں حکومت کا انداز یکساں تھا جو صرف انہیں متمدن دنیا کے رہنے والوں میں جنہیں شخصوں سے پوری ہوتی ہیں صحرائی قوموں میں وہ سب تنہا ایک ہی سردار کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ وہی امیر یا بادشاہ بھی ہوتا ہے وہی قاضی وہی صاحب خزانہ اور سردار فوج وغیرہ غرضکہ تمام کاروبار اسی شخص واحد کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اہل عرب کے یہاں جو شخص ان میں سب سے زیادہ طاقتور عقیل اور سب سے بڑھ کر صاحب تدبیر و رائے ہوتا تھا بلاکسی قسم کی سازشوں اور تعصب کے اسی کو امیر بناتے تھے اور اگر انہیں سے کئی شخص عقل و تدبیر اور زور و قوت میں برابر ہوتے تو اُس وقت ان سب میں سے زیادہ عمر والے اور صاحب جاہ شخص کو منتخب کر لیا کرتے تھے اور جب کئی قبائل کے لوگ متفق ہو کر کسی لڑائی پر آمادہ ہوتے اور انہیں ایک ایسا سردار درکار ہوتا جو اُن سب لوگوں پر اثر رکھے اسوقت یہ تدبیر کرتے کہ سب سرداروں کے نام پر قرعہ ڈالتے تھے جس کے نام چھٹی نکلتی اسی کو بلا عذر افسر عام مان لیتے اس صورت میں خوردی اور بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے تھے مذکورہ

بالا حالت صحرائی اور خانہ بدوش عربوں کی تھی جو جنگ و جدل اور لوٹ مار کے عادی تھے، باقی رہے شہری عرب اور وہ اہل مکہ تھے جن کے یہاں خانہ کعبہ کا خادم سرداری کا مستحق ہوتا تھا اور جب خدمت بیت اللہ قریش کے گھرانے میں آ گئی تو اسی وقت سے وہ ہر معاملہ میں سردار و افسر شمار ہونے لگے۔



(کعبہ)

کعبہ، تجارت، اور قریش

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ قریشی لوگ شہر کے رہنے والے اور تجارت پیشہ تھے، انکی تجارت کا قیام و بقا ان حاجیوں کی آمد پر تھا جو تہواروں اور موسموں میں مکہ آیا کرتے تھے۔ لہذا انکے لیے مقتضائے مصلحت یہی تہا کہ وہ آمدورفت کی راہ کو آسان بنانے اور لوگوں کو حج کی رغبت دلانے میں کوشش کرتے رہیں جن امور نے قبائل عرب کو زیارت کعبہ پر آمادہ کیا تھا ان میں سے ایک سبب اور بڑا سبب یہ تہا کہ ہر قبیلہ کا ایک خاص بت ہوتا تہا جسکی زیارت اور اسپر قربانی چڑہانے کیلئے وہ قبیلہ مقررہ موسم میں آیا کرتا تہا، یہانتک کہ خانہ کعبہ میں بتوں کی تعداد تین سو سے بڑھ گئی تہی جنمیں چھوٹے بڑے ہر قسم کے بت تھے۔ کوئی آدمی کی صورت کا تہا اور کوئی جانور کی

شکل کا، اور چند نباتاتی اشکال کے تھے،

طائف سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک بازار تھا جس کے اندر ماہ ہائے حرام کے زمانہ میں لوگوں کا جماؤ ہوتا تھا۔ لوگ وہاں کھجوروں کے جھنڈوں میں اپنے اپنے خیمے استادہ کرتے اور خرید و فروخت اور تبادلۂ ال میں مصروف رہتے۔ یہ بازار مشہور سوق عکاظ تھا۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات پر عربوں کے اور بھی میلے ہوا کرتے تھے، لیکن انمیں صرف قرب و جوار کی بستیوں کے باشندے اکٹھے ہوتے، مگر عکاظ میں ہر جانب سے جوق جوق باشندگان عرب آتے تھے اور ہر قبیلہ و حصہ ملک کے رہنے والے شریک ہوتے تھے۔ قریش والوں نے عکاظ میں لوگوں کے بکثرت آنے کے اسباب میں اتنی اور بھی زیادتی کر دی تھی کہ انہوں نے اسے ادب (لٹریچر) اور شاعری کا اکھاڑا بنا دیا تھا جہاں پر عرب کے قبیلے اپنے اپنے باکمال شاعروں اور مقرروں کو پیش کرتے جو اشعار پڑھتے اور مباحثہ و مناظرہ کر کے اپنا فخر جتایا کرتے تھے اور جس کا کوئی عزیز یا برادر قیدی ہوتا وہ اس کیلئے فدیہ دینے کی کوشش کرتا، اگر کسی کو حق حکومت حاصل ہوتا اور وہ اپنے حق کو نہ پاتا تو اس موقع پر وہ بھی اپنے استحقاق کو عیاں کرتا جس کی وجہ سے اُسے حکومت حاصل ہو سکے، آیام موسم یعنے میلہ کے دنوں میں ایک خاص شخص کو عکاظ کا والی (حاکم) بنا لیتے تھے جو باہمی اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ کرتا۔ یہ حاکم اکثر بنی تمیم کے گھرانے سے ہوتا تھا۔ لوگ عکاظ کے میلہ سے فراغت پا کر عرفات میں ٹھہرتے تھے، اور وہاں سے مکہ جا کر ارکان حج ادا کرنیکے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے،

قبیلہ قریش کے لوگ تجارت کے لئے سال میں دو سفر کیا کرتے تھے، جاڑوں کا سفر یمن کی جانب اور گرمیوں کا بصرہ کی جانب جو صوبہ حوران ملک شام کا ایک عمدہ شہر اور تجارتی منڈی تھا، گویا کہ مکہ یمن اور شام کے مابین قیام تجارت کا ذریعہ تھا، تجارت کے راستے یوں تو نہایت خطرناک رہتے تھے، اقوام عرب کی لوٹ مار سے بچنا مشکل بلکہ محال تھا۔ لیکن اہل قریش اس سے محفوظ تھے کیونکہ بوجہ خادم کعبہ ہونیکے لوگ ان کی عزت اور توقیر کرتے تھے انہیں نقصان کیونکر پہنچاتے؟ اہل قریش اکثر اوقات فارس اور حبشہ کا سفر بھی کیا کرتے تھے، اور ملک شام سے کپڑے اور غلہ فارس سے شکر اور موم وغیرہ اشیائے تجارت لایا کرتے تھے

بیان بالا سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اہل مکہ کا ذریعہ معاش اور سرچشمہ گزران تمامتر کعبہ تھا، اگر وہ نہ ہوتا تو اہل مکہ کیلئے اس وادی میں رہنا جسمیں نہ کھیتی ہو سکتی تھی اور نہ پانی میسر تھا غیر ممکن ہوتا بکثرت سفر کرتے رہنے اور اطراف عراق و شام کی متمدن دنیا سے ملتے جلتے رہنے کی وجہ سے اہل قریش تمام باشندگان عرب میں سب سے

زیادہ عالم تجربہ کار اور صاحب فہم ہو گئے تھے۔ اور چونکہ خانہ کعبہ کو ان کے بسر اوقات کے اسباب سے بہت کچھ تعلق تھا۔ لہذا انہوں نے اسکی حالت درست رکھنے میں خوب توجہ سے کام لے کر لوگوں کیلئے وہاں کا آنا آسان بنا دیا تھا۔ اہل قریش نے خانہ کعبہ کے آس پاس پانی کی سبیلیں لگا رکھی تھیں اور کھانا کھانے کیلئے مکانات بنائے تھے۔ نیز اس زمین کو جو خانہ کعبہ کے جوار میں تھی حرم (قابل عزت) بنا کر اسکی حدود میں جنگ وقتل کو حرام کر دیا تھا۔ اور اپنے خاندان میں سے کسی کو سبیل کا متولی مقرر کیا۔ اور کسی کو کھانا کھلانے کا مہتمم۔ غرض اسی طرح تمام خدمات اپنے آدمیوں کے سپرد کر رکھی تھیں۔ یہ خدمتیں اور ضرورتیں روز بروز بڑھتی ہی گئیں یہاں تک کہ اسلام سے پہلے پہلے پندرہ سولہ خدمتیں معین ہو چکی تھیں۔ جن سے اس زمانہ کی حکومت اور سلطنت کے کاروبار مراد ہیں جو قبیلہ قریش کے کنبوں نے آپس میں تقسیم کئے ہوئے تھے۔ قریش کے زیادہ تر مشہور کنبے یہ تھے۔

ہاشم۔ امیہ۔ نوفل۔ عبدالدار۔ اسد۔ تیم۔ مخزوم۔ عدی۔ جمح۔ اور سہم۔ انہیں سے ہر ایک کے واسطے ایک ایک خدمت یا زائد مقرر تھی جو ذیل میں درج ہوتی ہیں۔

(۱) سدانۃ۔ جسے حجابۃ بھی کہتے تھے اس خدمت کا والی کعبہ کا حاجب ہوتا تھا۔ خانہ کعبہ کی کنجی اسی کے پاس رہتی تھی۔ وہ لوگوں کے اندر جاتے وقت کعبہ کا دروازہ کھولتا تھا اور پھر اسے قفل لگا دیتا۔ اس منصب کو انکے نزدیک اول درجہ کی عزت حاصل تھی۔ یہ طریقہ خدمت عربوں نے یہودیوں سے سیکھا تھا۔ کیونکہ ان کے یہاں ایک خاص کاہن ہیکل کی حفاظت پر مقرر ہوا کرتا تھا جسے وہ "دربان" کہتے تھے۔ اور عقد فرید کے مصنف نے "سدانۃ" اور "حجابۃ" کو دو علیحدہ خدمتیں بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) سقایۃ۔ (سبیل) اس خدمت کا متولی مکہ میں پانی کے کمیاب ہونیکی وجہ سے حاجیوں کو پانی پلانے کی فکر رکھتا اور آب رسانی کے اہتمام میں مصروف رہتا تھا۔ وہ چمڑے کے حوض بنا کر کعبہ کے آس پاس رکھتا اور کنوؤں سے میٹھا پانی مشکوں اور پکھالوں میں بھروا کر اونٹوں پر بار کر کے منگواتا اور ان حوضوں میں ڈلواتا یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جبکہ زمزم کا کنواں کھودا گیا اس کے بعد وہ اسی کے پانی کی سبیل لگانے لگے۔ سقایۃ کی خدمت بنی ہاشم کے کنبہ میں تھی۔

(۳) رفادۃ۔ یہ ایک رقم ہوتی تھی جسے قریش کے لوگ ہر موسم میں اپنے مالوں میں سے نکال کر صاحب رفادۃ کے پاس جمع کر دیتے تھے۔ وہ اسی آمدنی سے کھانے پکوا کر محتاجوں کو کھلاتا تھا۔ سب سے پہلے جس نے رفادۃ کا

حکم جاری کیا وہ شخص قصی تھا جس کا بیان اوپر آچکا ہے۔ پہلے رفادۃ کا اہتمام بنی نوفل کے گھرانے میں تھا اور کچھ عرصہ بعد بنی ہاشم کے گھرانے میں آگیا۔

(۴) **عقاب**:- یہ قریش کے جنگی نشان کا نام تھا۔ جب وہ کسی لڑائی پر تیار ہوتے تو اسے نکالتے اور جس شخص کو باتفاق باہمی نشان بردار بناتے اس کے سپرد کردیتے تھے ورنہ وہ اسی شخص کے پاس رہنے دیتے تھے جس کے یہاں نشان کا رہنا مقرر تھا۔ اور وہ مستقل علم بردار بنو اُمیہ میں سے تھا۔

(۵) **ندوہ**:- یہ ایک گھر تھا جسے قصی نے کعبہ کے ایک پہلو میں تعمیر کیا تھا اس میں اہل قریش کے نامی لوگ جمع ہو کر مشورہ کرتے تھے۔ اس گھر میں وہ شخص داخل نہ ہو سکتا تھا جس کی عمر چالیس سال سے کم ہو۔ یہ بھی شرط تھی کہ کوئی عورت یا مرد اس گھر کے سوا اور کہیں شادی نہ کرے۔ دولہا اور دلہن دونوں کو اس میں لیجا کر عقد باندھتے تھے اور لڑائی پر چلنے کے لئے فوج کا نشان بھی اسی گھر میں مرتب کیا جاتا تھا بالغ لڑکیوں کو زنانہ لباس بھی اسی گھر میں پہنایا جاتا۔ مالک مکان اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے قطع کرتا اور اُسے پہناتا تھا جب ان کی (قریش کی) لڑکیاں سن تمیز کو پہنچتی تھیں تو یہ رسم ادا کی جاتی تھی دارالندوہ بنی عبدالدار کے قبضہ میں تھا۔

(۶) **سپہ سالاری**:- امیر قافلہ کا یہ بھی عہدہ تھا۔ اس خدمت کا عہدہ دار تجارت اور جنگ کے سفروں میں سواروں کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ سپہ سالاری کی خدمت بنی اُمیہ کے گھرانے میں تھی اور آغاز اسلام میں اس خدمت کی ذمہ داری ابوسفیانؓ معاویہؓ کے والد کے سپرد تھی۔

(۷) **مشورۃ**:- یہ خدمت جس کے سپرد ہوتی تھی اس سے تمام اہم کاموں میں رائے لیجاتی تھی یہ عہدہ بنی اسد کے کنبہ میں تھا اور جب تک قریش کسی بات کو ان کے سامنے پیش کر لیتے اسپر ہرگز متفق نہ ہوتے تھے۔

(۸) **اشناق**:- خون بہا اور تاوان کی وصولی کا نام تھا۔ جب کوئی شخص کسی خون بہا یا تاوان کو برداشت کرکے اس معاملہ میں قریش سے رائے دریافت کرتا تو وہ اس کی تصدیق کرتے۔ اور اس خدمت کا تعلق "تیم" کے کنبہ سے تھا۔

(۹) **قُبّہ**:- یہ ایک خیمہ تھا۔ جب لڑائی کو نکلتے تو اُسے استادہ کرکے اس میں وہ سامان جمع کرتے جس کی ضرورت فوج کی آراستگی کے لئے ہوتی تھی۔ اور جو ہمارے یہاں کے اُس امر سے بہت کچھ مشابہ تھا جس کو ہم اپنی اصطلاح میں "مہمات حربیہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں (کمسریٹ یا میگزین)۔

(۱۰) اعنّہ: گھوڑوں کی باگوں کو کہتے ہیں۔ اس منصب کا مالک حالت جنگ میں قریش کے گھوڑوں کا نگراں ہوتا تھا اور ان کی ضروریات کی فکر کرتا تھا۔

(۱۱) سفارت: یہ اس قسم کی خدمت تھی کہ جب اہل قریش کسی دوسرے عربی قبیلہ سے جنگ کرتے اور اس سے صلح کی گفتگو کرنا چاہتے تو کسی سفیر کو بھیجتے تھے؛ اور اگر کوئی خاندان کسی قسم کا فخر جتانیکے ساتھ اُن سے منافرہ کرتا تو سفیر ہی کو منافر بناتے اور اس کے حکم کو تسلیم کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کے سب سے پچھلے سفیر عمر بن الخطابؓ (اسلام لانے سے قبل تک) تھے۔

(۱۲) ایسار: فال کے تیروں سے استخارہ وغیرہ کے طور پر باہم تقسیم کرنیکے عمل کا نام تھا؛ جب جنگ یا سفر کے واسطے کسی اہم کام کی بابت تقسیم کرنا چاہتے تو ان ہی جوئے کے تیروں سے کرتے جیسا کہ آجکل چٹھی یا لاٹری ڈالنے کا طریقہ جاری ہے؛ اس خدمت کی تولیت بنی جمح کے گھرانے میں تھی۔

(۱۳) حکومت: یہ اُن کے یہاں لوگوں کے مابین واقع ہونیوالے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصل کرنیکا نام تھا؛ جو اسلامی عہدۂ قضا یا تحکیم (پنچائت) کے مشابہ تھی۔

(۱۴) اموال محجرۃ: یہ اس قسم کے مال ہوتے تھے جنہیں وہ لوگ اپنے دیوتاؤں کے نام پر نامزد کر دیتے (چڑھا دیتے تھے) انہیں نقد اور زیور سب کچھ شامل ہوتا تھا اور بسا اوقات بیت المال کے مشابہ ہوتا تھا؛ اس کی ولائیت بنی سہم کے گھرانے میں تھی۔

(۱۵) عمارۃ: اس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ خانہ کعبہ کی مسجد (بیت الحرام) میں کوئی شخص گالی یا بری بات زبان سے نہ نکالے اور وہاں چیخنے چلانے نہ پائے۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ان ضرورتوں میں سے بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جو عموماً مفید یا اہم نہیں ہیں؛ لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریشیوں نے ان ضرورتوں کی تعداد عمداً بڑھا دی تھی تاکہ ایک ایک خدمت سب کے سپرد کرنے سے قریش کے تمام کنبوں کو راضی رکھیں؛ انہیں ڈر تھا کہ مبادا نفس باہم رشک اور عداوت پیدا ہو جاوے جو باعث تباہی ہے اور نیز خانہ کعبہ کی کمالی بزرگی و تعظیم کے لحاظ سے بھی ایسا کیا تھا۔ اس لئے کہ خانہ کعبہ کی عزت و عظمت ان کے لئے باعث منفعت تھی اس کی وجہ سے لوگ وہاں بکثرت آتے تھے جن سے وہ ہر قسم کا فائدہ اٹھاتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اہل قریش نے ان خدمتوں میں انتظام ملک اور دین، نظم حکومت و جنگ

وغیرہ سب باتوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ لیکن انہیں اپنے ہی قبیلہ میں تقسیم کر کے ایک جمہوری حکومت کی صورت بنا لی تھی۔ یا وہ ایک خاص قسم کی حکومت تھی جس کی نظیر متمدن اقوام میں نظر نہیں پڑتی۔ البتہ وہ لبا اتفاق بعض وجوہ سے حکومت شوری دگورنمنٹ باجلاس کونسل یا پارلیمنٹ سے مشابہ تھی۔ مگر اس پارلیمنٹی حکومت میں ایک افسر ہوا کرتا ہے جو بادشاہ یا شہنشاہ ہوتا ہے۔ اور اس قریشی طرز حکومت میں بجز اس کے دار الندوہ کے مالک خانہ کعبہ کے خادم کو تھوڑی ہی ریاست حاصل ہوتی تھی اور کوئی ایسی وجہ مشابہت نہ تھی

اسلام سے پہلے عربوں کا ترقی کیلئے اُبھرنا

اسلام سے پیشتر کی تاریخ عرب اگرچہ مبہم اور پیچیدہ ہے لیکن اسے بغور دیکھا جائے تو بہت سے ایسے امور واضح ہوتے ہیں جو غور و فکر کی جولانگاہ بن سکتے ہیں۔ +

انہیں امور میں سے جنہیں سوچ سمجھ کر کسی بات کا اعتبار کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے ایک بات یہ بھی کہ باوجود عرب کے مختلف قبیلوں اور گھرانوں پر منقسم ہونے کے پہلی صدی قبل ہجرت سے آگے ان میں بہت کم کوئی مشہور شاعر یا خطیب یا حکیم یا کاہن پیدا ہوا۔ اس بارہ میں یہ اعتراض بھی نہیں ہوسکتا کہ جو نامور لوگ پہلے گزرے ہوں، ممکن ہے کہ ان کے حالات بوجہ فن تاریخ کے مدون نہ ہونے کے تلف ہوگئے ہونگے کیونکہ اہل عرب کو بہت سی صدیوں پہلے کے حالات مثلاً قوم عاد اور ثمود کے قصے تو یاد ہیں اور جو لوگ دو ایک صدی قبل از ہجرت مشہور ہو گزرے ہیں ان کے حالات بالکل بھول جائیں لہذا اگر اسلام سے پہلے اخیر کی صدیوں میں کوئی شاعر یا خوش بیان شخص گزرا ہوتا تو اس کے اخبار بالکل ضائع نہیں ہوسکتے تھے اسلام سے ایک صدی پہلے نامور شاعروں اور خوش بیان لوگوں کا پیدا ہونا اور یکایک اہل عرب کا میلان خاطر اس جانب ہوجانا ہم نے اسی کا نام اسلام سے پہلے عربوں کا ترقی کی جانب ابھر چلنا رکھا ہے علاوہ بریں ان ایام میں صرف شاعری اور زباندانی ہی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اُن دنوں عرب میں ایک قسم کا دینی خیال بھی موجزن تھا جس کی وجہ سے لوگوں کی فکریں منتشر اور عقائد خلط ملط ہو رہے تھے اہل جاہلیت یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ہم کس کی نماز پڑھتے ہیں (دعا مانگنا) اور کس سے وسیلہ پکڑنا چاہتے ہیں ان میں سے کوئی ایک شخص ایسا بھی ہوتا تھا جو

قربانی بت پر چڑھاتا اور نام خدا کا لیتا تھا۔ پتھروں آگ اور بتوں کے پوجنے والے بھی انہیں موجود تھے اور توحید کے ماننے والوں اور مشرکوں کا بھی وجود تھا؛ اس کے سوا اور بہت سی نئی نئی عبادتوں کے طرز نکلے تھے؛ آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اسی دوران میں شراب کے حرام ہونے اور بتوں سے بدعقیدہ ہونے کے خیالات کا ظہور ہوگیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ نبوت کی جانب سے کوئی بہتری حاصل ہونے کے امیدوار ہو رہے تھے اور ان کی مجلسوں میں اسی قسم کے تذکرے ہوا کرتے تھے مختلف قبیلوں کے کئی شخصوں نے نبوت کا جھوٹا دعوے بھی کر دیا تھا اور بعضوں نے دعوے کرنے کا قصد کیا تھا؛ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کے دینی معاملہ کی جانب سے متنبہ ہو جانے پر صاف صاف دلالت کرتی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ لوگ انجام کار کی فکروں میں مبتلا تھے؛

(اس اٹھان کا سبب کیا تھا؟) اس سے پہلے ہم عدنانی عربوں کے ترقی کیلئے مستعد ہونے کی کیفیت اور ان کی قابل تمدن ہونے کی صورت بیان کر چکے ہیں اس ذہانت اور تیز فہمی ہونے کی وجہ سے جو فطرتاً انہیں عطا ہوئی تھی انہیں اس قسم کی استعداد موجود تھی جو انہیں ادنے توجہ ہونے کے ساتھ ہی ترقی یافتہ اور متمدن قوم بنا دیتی۔ مگر چونکہ وہ لوٹ مار میں مصروف اور عزت و شان کی طلب سے بوجہ متمدن دنیا سے دور ہونے کے قاصر تھے لہذا ان قوتوں کو کام میں نہ لا سکتے تھے قاعدہ کی بات ہے کہ انسان کی قوتیں اسی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں جبکہ وہ مصیبت کے شکنجے میں کسا جاتا ہے اور گردش زمانہ کے پنجوں میں پھنستا ہے اور یہی تمام فطری اور طبعی قوتوں کی کیفیت ہے اس لئے ایک تنہا شخص غالباً اسوقت تک عزت اور ناموری کا خواہاں نہیں ہوتا جبتک کہ اس کو فقر و فاقہ کی مصیبت تنگ نہ کر دے یا کوئی اس کا ہمچشم اس سے کسی ایسے معاملہ میں لاگ ڈانٹ نہ کرے جس میں اسے اپنے اس ہمسر سے بڑھ جانے کا خیال پیدا ہو؛

قوموں کی ترقی کی جانب مائل ہونے کے اسباب خارجی لڑائیاں اور باہمی خانہ جنگیاں ہوتی ہیں مگر اوّل الذکر صورت یعنی غیر اقوام سے جنگ و جدل کا چھڑ جانا اس معاملہ میں زیادہ موثر ہے کیونکہ اس صورت میں نہیں دوسری قوموں سے ملنا جلنا پڑتا ہے اور یہ باہمی میل ملاقات تبادلہ خیالات کا ذریعہ بن کر ان کو دوسروں کے عادات و اخلاق سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ اور غیروں کے مقابلہ میں برتری دکھانے کا جوش دلاتا ہے تاریخ عالم میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں؛

اسلام سے قبل کی دو صدیوں میں حبش والوں میں یمن پر حملہ آور ہونے اور ادھر سے پلٹ کر اس کے ایک صدی ہجرت سے قبل کے وسط میں حجاز پر فتح مکہ کی نیت سے چڑھ آنے اور کعبہ پر قبضہ کرنے کی کوشش سے

حجازی عربوں کو جس مصیبت اور دقت کا سامنا کرنا پڑا، وہ دباؤ آخر کار ان کی ترقی کی طرف توجہ کرنیکا ذریعہ
بن گیا اور غیر قوم کی بیجا مداخلت اُن کے غیر متمدن دلوں کو چوٹ دی گئی، اُسی وقت سے اُن میں ترقی کی روح پھونک
گئی جس حالت میں حبش والوں نے مکہ پر فوجکشی کی ہے اور خانہ کعبہ کو گرا دینے کا ارادہ کیا ہے ان دنوں خانہ کعبہ
کی خدمت اور قریش کی ریاست نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جد امجد عبد المطلب کو تفویض تھی حبشیوں کا
ٹڈی دل لشکر اور سامان جنگ اُن کے زبردست ہاتھیوں کی قطار یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنکو اہل مکہ دیکھنے
کے عادی نہ تھے، کیونکہ قبائل عرب کے دلوں میں خانہ کعبہ کی جو قدر و منزلت تھی وہ ان کو اغیار کے حملوں سے
محفوظ رکھنے کے لئے ایک مستحکم قلعہ کا کام دیتی تھی، مکہ والوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہ گذرتا تھا کہ ہم پر کسی
دشمن کی چڑھائی ہو گی، لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ حبشی فوجیں سر پر ہی آگئیں تو انکو اس خطرہ کی نمود دکھائی
پڑی جو در پیش تھا اور انہیں اتحاد باہمی کی جانب اپنا محتاج ہونا محسوس ہو گیا۔ تاکہ متفقہ قوت سے بیرونی دشمن
کی مدافعت کر سکیں، اُنہوں نے آپس میں اتحاد قائم کیا اور آخر کار حبشیوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ مگر اسی واقعہ نے
انہیں غفلت کی گہری نیند سے بھی اُٹھا دیا، ان کے ہوش درست ہو گئے اور اسی وقت سے انکی فطری قوتیں
اور خوبیاں نمایاں ہونے لگیں، مکہ والوں کے دلوں میں اس حملہ کا سخت اثر ہونا اس بات سے پایا جاتا ہے
کہ انہوں نے اس کے بعد زمانہ میں اس حادثہ صعب کو بطور سنہ کے استعمال کیا اور اسی کا نام "عام الفیل"
(ہاتھیوں کا سال) رکھا تھا، زمانہ کی اسی ایک گردش اور گڑبڑ نے جو عرب والوں کو پہنچی تھی ان کے کان کھولدیئے
تھے اور اس کا نتیجہ صرف یہی ہوا کہ اُنہوں نے محض کسیقدر دینی اور ادبی (لٹریری) ترقی: بس کیا ہو؟ نہیں
بلکہ اس حادثہ نے عرب کے ملک میں بہت سے ایسے آدمی پیدا کر دیئے جو سپہ سالاری، انشاء، قوت اور حکمرانی میں
نامور ہوئے اور بعد میں اسلام کے نہائت تیزی کے ساتھ پھیلنے میں ان کے وجود کا بہت کچھ اثر ہوا، اس کی
بھی وہی صورت ہے جیسی کہ ملک فرانس کی بدامنی نے نپولین بونا پارٹ اور اسکے قوت بازو افسروں کو پیدا کیا
اسکے علاوہ کچھ "عام الفیل" ہی میں ان کے اٹھان کی ابتدا نہوئی تھی بلکہ یہ ترقی اور اصلاح کی حالت
اسی وقت سے شروع ہو چلی تھی۔ جبکہ حبش والوں نے یمن پر حملہ کیا ہے اور ان کے حجاز کی جانب پیشقدمی کرنے
پر وہ ترقی کی صورت کامل طور پر جادہ گر ہو گئی، خلاصہ یہ ہے کہ کچھ ہی سبب کیوں نہوں مگر یہ ضرور ہے کہ عرب کے
ملک میں اسلام سے کچھ زمانہ قبل سے ایک قسم کی لٹریری اور دینی ترقی کا اقدام (آغاز) ہو رہا تھا اور یہ صورت گویا قبول
اسلام کی تمہید تھی اور اسکی امداد پر آمادگی عیاں کرنیکا مقدمہ، اور اس قسم کی تحریکیں اکثر حالتوں میں دینی دعوتوں سے

پہلے پیدا ہوجایا کرتی ہیں تاکہ لوگوں میں اس مذہبی اور روحانی دعوت کے قبول کرسکنے پر آمادگی و صلاحیت پیدا ہو جائے یہ ایک قدرتی قانون ہے۔

اسلام کی دعوت

جسوقت نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب شریعت اسلامی نے ظاہر ہوکر لوگوں کو توحید کی جانب بلایا ہے اسوقت حجاز کی یہ حالت تھی جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ نبی موصوف نے سنہ ۶۰۹ء میں جبکہ ان کی عمر چالیس سال کی تھی اس دعوت کا اعلان کیا۔ اس موقعہ پر ان کے تمام اوصاف و عادات کے بیان کرنیکی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ہم صرف اس قدر حالات بیان کئے دیتے ہیں جن کا تعلق اس مضمون سے ہے کیونکہ ہمیں ایسے اسباب کا بھی ذکر کرنا پڑے گا جنہوں نے اس دعوت کے ظہور کا ساتھ دیا اور اسکی اشاعت میں امداد کی۔

صاحب دعوت اسلامی اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے اور جس وقت آپکی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ والدہ ماجدہ نے بھی دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد آپ کی کفالت آپکے دادا عبد المطلب نے کی۔ کعبہ شریف کی خدمتوں میں سے سقایتہ (سبیل) اور رفادۃ کی خدمت عبد المطلب ہی کے سپرد تھی۔ اور قریش کے گھرانے میں ان کا بہت بڑا مرتبہ تھا۔ لیکن دو ہی سال کے بعد انہوں نے بھی وفات پائی۔ اور نبی اسلام کی پرورش اور پرداخت ان کے چچا ابو طالب نے اپنے ذمہ لی۔ ابو طالب نجیب اور معزز آدمی تھے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے گھر میں مثل ان کے ایک بیٹے کے پرورش پا کر جوان ہوئے۔ ابو طالب بھی اور قریشی لوگوں کی طرح تجارت پیشہ تھے۔ اسلئے جب وہ بغرض تجارت کہیں سفر کو جاتے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لیجاتے چنانچہ آنحضرت تھوڑی ہی عمر کے زمانہ سے نیک چلنی سمجھداری اور عمدہ عادتوں اور سچی خوبیوں کے ساتھ مشہور عام ہو گئے جسکی وجہ سے اہل قریش نے انہیں "امین" کا لقب دیا تھا۔ وہ تمام مکہ میں اس لقب کے ساتھ مشہور و معروف ہوئے تو بی بی خدیجہ بنت خویلد کو جو صاحب مال و منال اور بڑی تاجرہ تھیں ان کے حالات کی اطلاع ہوئی انہوں نے آپ کو بلوا کر اپنا مال بغرض تجارت سپرد کیا۔ انہوں نے اپنی خوش سلیقگی سے تھوڑی ہی مدت میں بہت سا نفع حاصل کیا بی بی خدیجہؓ کو ان کی دانائی اور کارگذاری بہت پسند آئی اور انہوں نے آپ سے نکاح کا پیغام دیا۔ آنحضرت نے ان سے نکاح کر لیا اور ان کی دولت سے فائدہ اٹھا کر اطمینان حاصل کیا۔ اب وہ

خوشحال ہو گئے تھے، اور مکہ کے تمام لوگ ان کو عزیز رکھتے اور ان کی حرمت کرتے تھے۔

جس وقت آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو وہ لوگوں سے کنارہ کش اور گوشہ نشینی کی جانب مائل ہوئے پہاڑوں کے غاروں میں جا کر عبادت کرنے لگے، جیسے تارک الدنیا گوشہ گزینوں کی عادت ہوتی ہے اسی سال کے ماہ رمضان میں وہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر کوہ حراء کے غار میں رہتے تھے اور بی بی خدیجہؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں کہ اسی مہینہ میں انہوں نے پہلا خواب دیکھا اور جلد جلد اپنی بیوی کے پاس آ کر ان سے کہا کہ انہیں جبرائیلؑ دکھائی دیئے۔ اور اشارہ کیا کہ یہ آیتہ پڑھیں "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" الآیۃ۔ جس کو انہوں نے پڑھا اور یہ صورت بھی پیش آئی کہ جب غار سے باہر نکل کر پہاڑ کے وسط میں آئے تو انہوں نے ایک آسمانی آواز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اے محمد تم خدا کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں۔" اس آواز کو سن کر وہ لرزنے لگے اور خوفزدہ ہو کر دوڑتے ہوئے خدیجہؓ کے پاس گئے اور انہیں اس واقعہ کی خبر دی۔ خدیجہؓ کے ایک چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل نامی کتب سماوی کے بڑے عالم اور اہل تورات و انجیل کی صحبت کا فیض اٹھائے ہوئے شخص تھے۔ مکہ میں مذہب اور نبوتوں کے متعلق انکے جید عالم ہونے کا شہرہ تھا بی بی صاحبہ ان کے پاس گئیں اور واقعہ مذکورہ کی اطلاع کی۔ ورقہ بن نوفل نے کہا "جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے اسی کی (خدا کی) قسم کہ اگر اے خدیجہ تو مجھ سے سچی بات کہہ رہی ہے تو بلاشبہ وہ ناموس اکبر آیا تھا جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتا تھا اور کوئی شک نہیں کہ محمدؐ اس امت کا نبی ہے۔"

بی بی خدیجہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس واپس آئیں اور ورقہ کی گفتگو سے انہیں مطلع کیا جسے سن کر ان کا دل مطمئن ہوا۔ اور وہ شہر مکہ میں واپس آ گئے مگر حالت یہ تھی کہ انہیں اپنی دعوت کا اعلان کرنے کی جرأت نہ پڑتی تھی، اولاً وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے میں چونکہ قریش کے معبودوں اور انکے بتوں کے عیب بیان کرنے ہونگے اور ان بتوں کی وقعت کے جانے سے ان کی تمام عزت و حرمت دولت و تجارت خاک میں ملجائیگی اور ان کی ساری امیدوں کا خون ہو جائیگا جسکی وجہ سے وہ تباہی میں مبتلا ہونگے اسلئے چاہتے تھے کہ اظہار دعوت کریں مگر ہمت نہ بندھتی تھی۔ ثانیاً انہیں یہ بھی توقع نہ تھی کہ اگر وہ قریشیوں یا اہل مکہ کو اپنا نبی مرسل ہونا جتائیں گے تو وہ لوگ ان کو سچا سمجھینگے، اس وجہ سے انہوں نے خفیہ طور پر اندر ہی اندر اپنی دعوت پھیلانے کا قصد کیا اور اپنے سب سے زیادہ نزدیکی لوگوں میں اس کی ابتدا کی، تین سال اسی صورت پر گذر گئے اس میں بہت تھوڑے لوگ ان کے گرد جمع ہوئے منجملہ انکے ایک علی بن ابیطالب انکے چچا کے بیٹے تھے جو اسوقت بچے ہی

تھے؛ اور ابو بکر صدیق رضؓ جو قریش کے چیدہ لوگوں میں سے تھے، اور ابو عبیدہ رضؓ بن الجراح وغیرہ۔ پھر انہوں نے کھلے بندوں لوگوں کو اسلام کی جانب بلانے کا ارادہ کیا اور اس شکل کی ابتداء خاص اپنے کنبے سے کی؛ اپنے چچیرے بھائی علی بن ابیطالب کو حکم دیا کہ خاندان کے لوگوں کی دعوت کریں اور اپنے چچاؤں اور انکی اولادوں کو بلائیں جو تقریباً چالیس شخص تھے؛ علیؓ نے ان لوگوں کو اپنے والد ابیطالب کے گھر میں بلایا جب وہ سب کھانا کھا چکے تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے اُن سے کچھ کہنا چاہا انکے کنبہ والوں کو انکے خفیہ طور پر بہ ثبات اسلام کرلتے رہنے کا حال معلوم ہو چکا تھا اور وہ سب انہیں بہ نگاہ حقارت دیکھتے تھے جب آپ کچھ فرمانے پر آمادہ ہوئے تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اب ہم لوگوں کو بھی بتوں کے چھوڑ دینے اور خدائے واحد کے عبادت کرنیکی ہدایت کرینگے، اسلئے انکے چچا ابولہب نے جو ان کا سخت مخالف اور تکلیف دینے والا تھا جلدی سے انہیں چپ کرادیا وہ خاموش ہو گئے؛ اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے: حضرت محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کچھ کہہ نہ سکے لیکن وہ بددل نہیں ہوئے اور اُن کے استقلال میں کچھ کمزوری نہ آئی بلکہ انہوں نے دوبارہ اور دعوت دی اور دل میں ٹھان لیا کہ اسدفعہ اپنا خیال ضرور ظاہر کریں گے جبوقت سب مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تو آنحضرتؐ نے فرمایا " میں نہیں جانتا کہ عرب میں کوئی آدمی اپنی قوم کے لئے اس سے بڑھکر سوغات لایا ہو جو میں تمہارے لئے لایا ہوں، اسمیں شک نہیں کہ میں تمہارے واسطے دین و دنیا کی بھلائی لایا ہوں اور خدا نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی جانب بلاؤں؛ اب تم لوگوں میں سے اس معاملہ میں کون شخص میری مدد کریگا تاکہ میں اسے تم میں اپنا بھائی اور وصی اور خلیفہ بناؤں " بنو عبدالمطلب گفتگو سنکر چپ بیٹھے رہے۔ ان کا یہ تمام سکوت بخیال حقارت تھا؛ لیکن علیؓ آگے بڑھے اور انہوں نے کہا؛ " اے نبی اللہ میں اسپر آپکا وزیر ہونگا " نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کی گردن پکڑ کے ارشاد فرمایا " تمہاری جماعت میں یہ میرا بھائی اور وصی اور خلیفہ ہے اس کی بات مانو اور اسکی اطاعت واجب جانو " یہ کلام سننے کے بعد بنو عبدالمطلب ہنستے ہوئے اٹھے اور ابیطالب سے کہنے لگے " لیجئے آپکے بھتیجے صاحب آپکو حکم دیتے ہیں اپنے بیٹے کی اطاعت اور فرمانبرداری کیجئے ! " یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے، مگر انکے اس حقارت آمیز برتاؤ نے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارادوں میں کوئی کمزوری نہیں آنے دی اور نہ ان کو اپنی قوم سے الگ ہونے کی ترغیب دی بلکہ بجائے اس کے کہ وہ ڈرکر ادر پہلو بچاکر بیٹھ رہتے بس کرتے اور خموش بیٹھے رہتے انہوں نے دل کھولکر برسر عام بتوں کو برا کہنا اور اپنے خاندان والوں اور بزرگوں کو گمراہ و کافر کہنا شروع کردیا۔

بنو عبد المطلب کو معلوم ہوا کہ اب تو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے علانیہ بتوں کو برا کہنا شروع کر دیا ہے تو وہ متفق ہو کر انکی عداوت پر تل گئے اور انہیں اذیت دینے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابیطالب کی کفالت میں تھے لہذا وہ لوگ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم وہ ابیطالب کے پاس آئے ابو سفیان (معاویہ کا والد) بھی انکے ہمراہ تھا اور انہوں نے کہا "ابا طالب! تمہارے بھتیجے نے ہمارے دین میں عیب نکالا ہے۔ ہمارے احلام کو سفاہت قرار دیا ہے۔ اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ بنایا ہے تم اسے منع کر دو کہ وہ ہم سے ایسی باتیں نہ کہے ورنہ اسکا ساتھ چھوڑ دو ہم خود اس سے سمجھ لیں گے" ابو طالب نے اسوقت ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور اُسنے کہہ دیا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کر دونگا۔

مگر پھر بھی قریشیوں نے آنحضرت کو برابر اپنے دیوتاؤں کے حق میں برا ہی کہتے دیکھا۔ وہ لوگ دوبارہ ابیطالب کے پاس پہنچے اور نہایت غیظ و غضب سے کہنے لگے "اگر تم اپنے بھتیجے کو منع نہ کروگے تو ہم تم سے اور اس سے لڑینگے یہانتک کہ مارینگے یا مرینگے" ابیطالب کو یہ بات شاق گذری اور اسکے نتیجہ کو وہ سمجھ گئے کہ بہتر ہو گا جبوقت اہل قریش ان کے پاس سے چلے گئے تو وہ اپنے بھتیجے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے بولے "پیارے بھتیجے تمہاری قوم کے لوگ آج ایسی بات کہہ گئے ہیں" حضرت کو گمان ہوا کہ چچا میرا ساتھ چھوڑ دینگے اس خیال سے انہیں صدمہ گزرا۔ اور انہوں نے جواب دیا "چچا صاحب! اگر وہ لوگ میری داہنی طرف آفتاب اور بائیں طرف ماہتاب لا رکھیں گے۔ تب بھی میں اس بات کو نہ چھوڑونگا" اور روتے ہوئے واپسی کا قصد کیا۔ اُن کے چچا نے یہ حالت دیکھکر ان کو بلا لیا اور کہا "جو دل چاہے کہے جاؤ واللہ میں قیامت تک بھی تمہیں ان کے ہاتھوں میں نہ دونگا"۔

اس اثناء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور دعوت آہستہ آہستہ پھیلتی جاتی تھی۔ چیدہ چیدہ لوگوں کی ایک مختصر جماعت مشرف باسلام ہو چکی تھی جنکی اسلامی تاریخ میں بڑی شان و عظمت ہے انہیں لوگوں میں سے چند یہ بھی ہیں۔ ابوبکر صدیق۔ عثمان بن عفان۔ زبیر بن العوام۔ عبد الرحمن بن عوف۔ حمزہ بن عبد المطلب اور عمر بن الخطاب۔ مگر ان دو پچھلے شخصوں کے اسلام لانیکی نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہ دونوں وجیہہ اور زورآور لوگوں میں سے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور سب چچا اور کنبہ کے لوگ اجب سے بات سے ناامید ہو گئے کہ ابیطالب کے ذریعے کوئی کام بنجائیگا تو انہوں نے خود ہی سلوک اور آشتی کیساتھ آنحضرت کو راضی کرنیکی ایک چال چلی اور

ان میں سے بڑے بڑے لوگوں نے ندوہ میں جمع ہوکر آپ کو بلا بھیجا، وہ آئے تو بڑی خاطر تپاک سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان سے کہا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم نے تجھ سے کچھ کہنے کے لئے تم کو یہاں بلایا ہے، سنو واللہ ہم کو عرب کے تمام ملک میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا، جس نے اپنی قوم پر ایسی بلا نازل کی ہو جیسی کہ تم نے اپنی قوم پر آفت ڈہائی ہے اور اسے ذلیل بنایا ہے تم نے باپ دادوں کو گالیاں دی ہیں، دین میں عیب نکالے ہیں دیوتاؤں کو برا کہا ہے حلام کو سفیہہ قرار دیا ہے اور گروہ کی متحدہ قوت کو توڑ دیا ہے غرضکہ کوئی بری بات ایسی نہیں رہ گئی جکہ تم ہمارے اور اپنے مابین نہیں چھکے (یعنی ہم سے کوئی برائی کرنے کو اٹھا نہیں رکھی) اگر ان باتوں سے تمہاری غرض طلب مال ہے تو ہم سب مل کر اپنے مال ومتاع میں سے تمہیں اسقدر جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے بڑھ کر مالدار ہو جاؤ، اگر ہمارے قبیلہ میں شرف وعزت کا خیال ہے تو ہم تم کو اپنا سردار بنا لیں، بادشاہت کا خیال ہو، تو اپنا بادشاہ مان لیں، اور اگر یہ صورت جو تم کو پیش آیا کرتی ہے جنون اور دیوانگی کے قسم سے ہے، تو ہم کسی حاذق طبیب کی تلاش میں اپنے اپنے مال کو خرچ کرنے پر تیار ہیں، تمہارا علاج کرائنگے جس سے تم کو صحت ہو جاویگی اور صحت نہوئی تو پھر تم کو اس معاملہ میں معذور خیال کیا کریں گے،

حضرت نے اسکے جواب میں فرمایا، "نہ تو میری وہ حالت ہے جو تم نے بیان کی اور نہ میرا مقصود مال ومنال اور جاہ وعزت کی طلب ہے، بلکہ خداوند کریم نے مجھ کو پیامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے، مجھپر ایک کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تم اس کے انعام کی خوشخبری دوں اور اس کے عذاب سے ڈراؤں، لہذا میں اپنے پاک خدا کے احکام تمہیں پہنچاتا اور نصیحت کرتا ہوں، اگر تم میری بات اور رسالت کو قبول کرلوگے تو یہ امر تمہاری دنیوی اور اخروی بہتری کا سبب ہوگا، ورنہ اگر میرے قول کو رد کرو گے تو میں اس وقت تک صبر کرونگا، جبتک کہ خود اللہ پاک میرے اور تمہارے معاملہ کا کوئی فیصلہ نہ کر دے،

اہل قریش نے آنحضرت کو ہدایت اسلام سے روکنے میں اپنی کوششیں ضایع ہوتی دیکھ کر ایک نیا طرز اختیار کیا انہوں نے مسلمانوں کو جو بہت تھوڑے سے تھے ستانا اور طرح طرح سے دق کرنا شروع کر دیا، پہلے تو مسلمانوں نے ان ظلموں اور تکلیفوں کو جو انہیں قریش کے ہاتھوں سے پہنچتی تہیں صبر کے ساتھ سہا، لیکن کہاں تک برداشت کرتے آخر تنگ آگئے، اور قریش کی سخت اذیتوں اور قسم قسم کی اہانتوں کے تحمل سے عاجز ہو گئے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے یہ حالت دیکھ کر ان مسلمانوں کو جن کا کوئی کنبہ نہ تھا کہ انہیں دشمنوں سے بچاتا

حکم دیدیا کہ مکہ سے نکل کر ملک حبش کو چلے جاویں، اُن بیچاروں نے آگے پیچھے ترک وطن کیا اور ملک حبش کو چلے گئے، مہاجرین کی تعداد عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف (۸۳) تراسی مردوں تک پہنچی تھی اور یہ پہلی ہجرت (ترک وطن) تھی جو آغاز اسلام میں ہوئی، یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ مکہ سے حبش کا سفر کرنے میں کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے کیونکہ خشکی کے رستہ کو طے کرکے دریائی سفر کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے، اور خاص کر ان دنوں میں تو یہ سفر اور بھی تکلیف دہ ہوگا اور ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ اسباب، مال، دولت، اور بال بچوں کا ساتھ لے جانا، کس قدر دقتوں کا سبب رہا ہوگا یہ بات اسپر دلالت کرتی ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد کس مضبوطی سے جما ہوا تھا۔

دعوت اسلام کی تاریخ میں مدت دراز تک مطالعہ کرتے رہنے اور غور کرنے سے جو بات ہمارے خیال میں جم گئی ہے اس کے بیان کرنے کیلئے ہمیں اس مقام پر تھوڑی دیر کیواسطے اصل مدعا کے بیان سے رک جانا اور روئے سخن دوسری جانب پھیر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہمارا وہ خیال حسب ذیل ہے۔

بعض غیر مسلم مورخوں نے کہا ہے کہ صاحب شریعت اسلامی سرداری اور وجاہت دنیاوی کی طمع میں اس دعوت پر اٹھے تھے۔

مگر ہم اس قول کی گنجائش نہیں پاتے خود دعوت اسلام کی تاریخ صاف صاف دلالت کر رہی ہے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) بالکل سچائی اور خلوص کے ساتھ اس ہدایت پر آمادہ ہوئے تھے وہ اپنی رسالت کی صحت کا یقین کامل رکھتے تھے اور لوگوں کو اس خیال کے ساتھ اسلام کی ہدایت کرتے تھے کہ حق سبحانہ تعالےٰ نے انہیں اسکی اشاعت کے لئے بھیجا ہے، اگر اُن کا یہ خیال نہ ہوتا تو وہ ان قسم قسم کی تکلیفوں اور اذیتوں پر جو اس دعوت کی راہ میں اُنہیں پہنچیں صبر نہ کرتے، پھر یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ اسلام کی ہدایت شروع کرنے سے پہلے وہ تمام اہل مکہ کے نزدیک قابل عزت تھے، مکہ کے رہنے والے سب کے سب انہیں دل سے عزیز رکھتے اور انکی حرمت کرتے تھے۔ اور بی بی خدیجہ رضہ سے نکاح کرکے اُنکے مال سے تجارت کرنے کے باعث وہ کافی طور پر مالدار اور آرام کی امیرانہ زندگی بسر کرنیکے قابل ہوگئے تھے مگر ہدایت اسلام کو ظاہر کرنیکے بعد ہی وہ سب کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ وہی مکہ کے لوگ جو پہلے ان کی خاطر کرتے تھے اب اُنکے سخت دشمن اور خون کے پیاسے ہوگئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے اور اہانت کرتے رہتے، اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مند جنہوں نے کیوجہ سے کہ بنی ہاشم کے بھی دشمن بنگئے اور اپنے جتھے میں عہد و پیمان

کر لیا کہ بنی ہاشم کے کنبہ میں شادی بیاہ نہ کریں گے اور ان کے ساتھ خرید و فروخت کرنا بند کر دینگے اس کے متعلق ایک اقرار نامہ لکھ کر کعبہ کے اندر باحتیاط رکھدیا جسکی وجہ سے بنو ہاشم مکہ سے نکل کر پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور تین سال تک کوہستانی دروں میں مقیم رہے۔ اگر مکہ میں آتے تو چھپکر آتے تاکہ کسی کو خبر نہو سکے البتہ بنو ہاشم میں سے جن لوگوں سے اہل قریش کا ساتھ دیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کا اظہار کیا تھا وہ ان باتوں سے بری رکھے گئے۔ مثلاً ابی لہب وغیرہ۔

پس نظر بحالات بالا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہو سکتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے چچا ابی طالب کی حمایت میں ہونیکے باعث ثابت قدم رہ سکے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اسقدر استقلال دکھلاتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت اپنے چچا کے انتقال کے بعد پہلے سے بھی بڑھکر استقلال و استقامت کے ساتھ ہدایت حق کا کام انجام دیتے رہے اور لوگ بہ نسبت پہلے کے اب انہیں بہت زیادہ تکالیف دیتے تھے خصوصاً بی بی خدیجہ رضہ کے انتقال کے بعد پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ ناقابل بیان تھیں ان دونوں حامیان نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہجرت سے تین سال پہلے ہو گیا تھا۔ انکی وفات سے جو پے درپے مصیبتیں نازل ہوئیں اُن کے علاوہ سخت آفت قریش والوں کا ظلم و ستم تھا اور خاصکر خود نبیؐ کے چچا ابولہب اور حکم بن العاص اور عقبہ بن ابی معیط کے مظالم۔ کیونکہ یہ تینوں اُنکے پڑوسی تھے اور گھر سے گھر ملے ہوئے ہونیکی وجہ سے اُن کے کھانے پینے کی چیزوں میں غلاظت پھینکتے۔ اور جب وہ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو خود انپر گندگیوں کی بوچھاڑ کرتے۔ یہانتک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سختی اور ستم پر صبر نہ کرسکے تو اس خیال سے کہ شائد وہاں کوئی شخص حق کی امداد اور ان کی ہدایت قبول کرنے پر آمادہ ہو سکے طائف کو چلے گئے وہاں بھی اسی قسم کا سلوک ہوتا دیکھ کر واپس چلے آئے۔ لیکن اپنی ہدایت میں سے ایک حرف بھی کم نہ کیا طائف والوں نے اسی پر بس نہیں کیا کہ آپ کی بات نہ سُنی بلکہ انہوں نے اپنے یہاں کے بدمعاشوں اور غلاموں کو اُبھارا کہ وہ لوگ آنحضرت کو گالیاں دیں۔ اور ان کے پیچھے پیچھے ہو۔ ہلا کا شور مچا کر انہیں تنگ کریں جسکی وجہ سے لوگ بجا لائے یہانتک کہ بہت سے آدمی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کی پناہ میں لیکر ان بدمعاشوں کو دور کیا۔ حضرتؐ نے اس حالت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ کیسی سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے اپنے معاملہ میں خدا سے فریاد کی اور مکہ کو پلٹ آئے۔ ان پریشانیوں سے بھی اُن کے پختہ ارادے میں کچھ بھی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ مکہ میں انہیں صرف اپنی قوم سے سابقہ پڑا۔ جو اب پہلے سے کہیں بڑھکر انکو ناگوار تھے انہوں نے اس پالیسی کے

بعد اپنی حالت کا اندازہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اپنے اور بیگانے تمام لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور سب اُن کے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر میں ہدایت کرنا چھوڑ دوں تو میرے ہموطن اور عزیز مجھ سے بیحد رضامند ہو جائیں گے۔ اور جیسی چاہئے ویسے خاطر سے پیش آئیں گے کیونکہ وہ لوگ بارہا صاف صاف سب بات کو کہہ چکے تھے۔ مگر انہوں نے ان باتوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی اس تمام استقلال اور مصیبتوں کے بخوشی برداشت کرنے پر بھی ترک اشاعت کرنے سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے دعوے کی سچائی اور اپنے مرسل من اللہ ہونے کا الیقین کامل تھا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے عزیزوں اور ہموطنوں کے راہ راست پر آنے سے ناامیدی ہو گئی انہوں نے حج کے دنوں میں باہر سے آنیوالے قبائل کو وعظ و نصیحت شروع کی اور انہیں اسلام کی جانب بلانے لگے تاکہ شاید کوئی شخص قرآن کی آواز سن لے۔ ان کے کنبے والے اس کام میں بھی رکاوٹ ڈالنے کے تیار ہو گئے۔ خاص کر اُن کا چچا ابولہب۔ اس کی تو یہ حالت تھی کہ جب اور جہاں آپ کو کسی قبیلہ سے اسلام کے بارہ میں کچھ کہتے دیکھتا آ کر اُن کی بات کاٹ دیتا اور لوگوں سے کہتا یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے لات و عزے کی پرستش چھوڑا کر تمہیں گمراہی و بدعت کی وہ باتیں منوانا چاہتا ہے۔ جو اس نے خود نکالی ہیں۔ خبردار اس کی بات کبھی نہ سننا۔ مگر آنحضرت کو ان باتوں نے لوگوں کی ہدایت سے باز نہ رکھا وہ ہمیشہ حج کے دنوں میں دعوت اسلام فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر کار یثرب کے رہنے والوں میں سے چند شخصوں نے انکے ہاتھ پر بیعت کی اور وہ لوگ تھوڑی ہی مدت میں اس شہر کے اندر اشاعت اسلام کا ذریعہ بن گئے۔ ممکن ہے کہ یثرب میں اسلام کی تیزی سے پھیلنے کا سبب ہوا کہ یہودی وہاں بکثرت آباد تھے۔ کیونکہ وہ اہل کتاب اور وحی آسمانی کے معتقد تھے۔ نبوت کے معنے کو سمجھتے تھے۔ انہیں ایسا شخص کوئی بھی نہ تھا جو بتوں کی عبادت کرے۔ نہ ہٹ جانے سے کاروبار تجارت کے بگڑ جانیکا خوف کہا تا ہو بلکہ وہاں کے لوگ بتوں کی عبادت مٹنے کو اس لحاظ سے بہتر جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ہی مکہ کا عروج جاتا رہیگا اور انکے شہر کو رونق حاصل ہو گی بالخصوص جبکہ خود ہادی اسلام وہاں آ گئے اور وہ نئے مذہب کا مرکز بن گیا جسکی وجہ سے لوگ بجائے مکہ کا حج کرنیکے مدینہ کی زیارت کو آنے لگے دولت کمانے کے معاملات و تجارت کے اصول میں یہود کی دنیوی مناسبت طبع اور ہوشیاری مشہور عام ہے۔ علاوہ بریں مکہ اور یثرب ان دونوں شہروں میں جو باہمی چشمک اور ایک دوسرے سے بازی لیجانے اور باہم حسد رکھنے کے اسباب موجود تھے وہ بھی اس امر کا باعث ہوئے کہ مدینہ میں اسلام

کو رونق حاصل ہو کیونکہ مکہ کے رہنے والے عدنانی تھے اور مدینہ کے باشندے قحطانی نسل سے یعنی یمن کے عربوں کی اولاد تھے۔ اسی لئے مدینہ والوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمت دلائی اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ آپ ہمارے یہاں آئیں ہم آپ کی مدد کریں گے غرضکہ آنحضرت صلعم نے ۶۲۲ء میں مدینہ کی جانب ہجرت کی اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے بھی اپنے وطن کو چھوڑ دیا جو آپ کے کنبہ میں سے آپ پر ایمان لائے تھے، یہ لوگ صحابہ کے دوسرے گروہ "انصار" سے تمیز رکھنے کیلئے "مہاجرین" کے نام سے مشہور ہوئے مدینہ والوں کا نام "انصار" اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے شہر میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی۔ اہل اسلام اپنے واقعات کی تاریخ آجتک اسی ہجرت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے مدینہ میں نہایت عمدہ طور سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جس سے ان کی امیدیں تازہ اور انکے دل مضبوط ہو گئے، وہ مکہ والوں سے ان کے ظلم و ستم کا بدلہ لینے پر متوجہ ہوئے اور ان دشمنان اسلام سے وقتاً فوقتاً کئی لڑائیاں لڑے۔ ان جنگوں کا نام "غزوات" مشہور ہے ان میں سب سے بڑا غزوہ بدر کا تھا جس میں مسلمانوں کو کامل فتح نصیب ہوئی اور یہی فتح ان کیلئے دوسرے جنگوں میں فتحیابی کا نیک شگون تھی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے تمام جزیرہ عرب کو گھیر لیا، شہر مکہ بھی فتح ہو گیا۔ اور قبیلہ قریش کے تمام لوگ ایمان لے آئے اس اندرونی انتظام کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خارجی دنیا کی جانب توجہ کی اور بادشاہان عالم کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے جنکے حالات تواریخ میں موجود ہیں اور اپنے موقعہ پر ہم بھی بیان کریں گے۔

ظہور اسلام کے وقت رومیوں اور فارسیوں کی حالت

۷۵۳ء قبل مسیح میں رومتہ الکبریٰ کی بنیاد پڑی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رومانی سلطنت کا وجود قائم ہوا ایک ہزار اور پچاس سال تک شہر رومیہ اس سلطنت کا پائے تخت رہا اور اس عرصہ میں رومانی حکومت کا دور دورہ نو صدی بڑھتا یہاں تک کہ اس نے تمام آباد دنیا کو فتح کر لیا تھا ۳۳۱ء میں پائے تخت "بیزانتیوم" میں منتقل ہو آیا، چونکہ قسطنطین کبیر (اعظم) اس نقل مکان کا باعث ہوا تھا لہذا اس نے اس نئے دارالسلطنت کا نام اپنے نام پر "قسطنطنیہ" رکھا اور آج تک اس کا یہی نام ہے ۳۳۷ء میں قسطنطین اعظم کی موت کے بعد اسکے تین بیٹوں نے ملک کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد وہ تمام ملک پھر ایک ہی لڑکے کے پاس آگیا جسکی

وفات ۳۶۳ء میں ہوئی اس کے بعد یولیان تخت نشین ہوا۔ اور یولیان کے بعد ۳۶۴ء میں جوفیان نامی مالک تخت و تاج ہوا۔ اتفاقاً چند ہی مہینوں کے بعد یہ بھی مر گیا۔ اور چونکہ کوئی وارث نہ تھا لہذا رومانی قوم نے کثرت رائے سے والنتیان نامی ایک شہنشاہ انتخاب کیا۔ والنتیان نے اپنے انتخاب کے بعد کچھ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رومیہ کا شاہنشاہ اپنے بھائی "والنس" کو بنا دیا۔ اس واقعہ کے بعد رومن امپائر کے دو علیحدہ علیحدہ حصے ہو گئے۔ جن میں سے ایک حصہ مشرقی رومن امپائر کا تھا اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ رہا۔ اور دوسرا حصہ مغربی رومن امپائر کا۔ جس کا پایۂ تخت قدیم یعنے رومیہ باقی تھا۔ مگر اول الذکر حصہ کی عمر اور شان و شوکت دونوں باتیں آخر الذکر سے زیادہ ہوئیں۔ اور قسطنطنیہ علم و حکمت کا گھر۔ سلطنت کا مرکز اور مذہب کا مرجع بن گیا۔

مشرقی رومن امپائر کی حدود اربعہ پانچویں صدی عیسوی میں حسب ذیل تھیں:۔

مغرب میں بحیرہ ایڈریاٹک۔ مشرق میں دریائے دجلہ کے سواحل شمال میں لائی جیحد ملک تاتار اور جنوب میں اس کی حدود ممالک حبشہ تک وسیع تھیں قسطنطین اعظم کے بعد اس سلطنت کو سب سے بڑھ کر ترقی کا زمانہ اسوقت نصیب ہوا ہے جبکہ اس کی حکومت قیصر یوسینیانوس کے قبضہ میں آئی (یعنے ۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) یہ قیصر ۳۹ سال حکمران رہا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی پانچ سال ساسانی بادشاہان فارس کے ساتھ جنگ میں بسر کئے اور یہ جنگ بالآخر ایسے عہد نامہ پر ختم ہوئی جس کا نام دائمی صلح کا معاہدہ رکھا گیا تھا اگرچہ بعد کو وہ صلح قائم نہ رہی۔ اس قیصر کو خوش قسمتی سے ایک نہایت دلیر اور مدبر جنرل "بلیزاریوس" نامی مل گیا تھا جو دنیا کے مشہور فاتحوں میں سے گذرا ہے اس جنرل نے اس کے لئے ایطالیا کو فتح کیا۔ رومۃ الکبریٰ کی فصیلوں اس کا پھریرا اڑایا اور شمالی افریقہ وغیرہ ممالک کو مسخر کیا غرضکہ بلیزاریوس قیصر یوستینیانوس کی فتوحات ملکی میں دست و بازو اور اس کی قلمرو کو وسیع کرنے میں بہر طور معین و مددگار تھا۔

فارس اور روم (اور یونان) کے رہنے والوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی۔ شاید کہ پانچ صدیاں قبل از ولادت مسیح اس کا وجود ہوا تھا۔ اس کا اصلی سبب دنیاوی حکومت کی خواہش تھی کیونکہ ازل سے یہی دونوں سلطنتیں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتیں تھیں اس لئے انمیں سے ہر ایک دوسرے کے مقابل اپنے عروج اور زیادتی ملک کی خواہشمند رہتی تھی۔ اس دشمنی کا سلسلہ سکندر اعظم کے زمانہ تک اور اس کے بعد ساسانیوں کے عہد حکومت میں اسلام کے عہد تک قائم رہا۔

قیصر یوستینیان کے زمانہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فارس کے تخت پر کسریٰ نوشیروان کا جلوس

ہوا تھا جو عادل کے لقب سے مشہور ہوا ہے۔ انوشیرواں کو رومیوں سے صلح رکھنا پسند نہ آیا اس نے اپنی فوجوں کو آراستہ کر کے ممالک روم پر حملہ کر دیا۔ سوریا (ممالک شام) فتح کر کے شہر انطاکیہ کو پھونک دیا۔ ایشیائے کوچک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس حالت کو دیکھ کر یوستینیان نے بلیز اریوس کو اس کے مقابلہ پر روانہ کیا جس نے انوشیرواں سے کئی ایک میدان لڑائیاں کر کے اُسے پسپا کیا۔ کسریٰ نے اس خفیف سی شکست سے سنبھل کر پھر دوبارہ حملہ کیا اور آخر کار اُسے پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن وہ شکستہ دل نہیں ہوا۔ اور برابر سنبھل سنبھل کر حملہ کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے ان دونوں سلطنتوں کے بیچ میں متواتر بیس سال تک (۵۴۲ء تا ۵۶۱ء) جنگ قائم رہی۔ اور دونوں بادشاہ دق آ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں صلح پر متفق ہوئے جیسے یوستینیان پر تیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرنا مقرر ہوا۔ اس کے بعد دونوں سلطنتوں کی سرحدیں اسی طرح قائم رہیں جیسے کہ لڑائی سے پہلے تھیں۔

مشرقی رومن امپائر کی تاریخ میں قیصر یوستینیان نہایت نیک نام شہنشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانہ میں اس حکومت کو بہت کچھ عروج اور اثر حاصل ہوا تھا اور اس کے ان کارناموں میں سے جنہوں نے قیام دنیا تک اس کے نام کو زندہ بنا دیا اس کے وہ قوانین اور احکام تھے جو بعد کے زمانہ میں وضع قانون کی بنیاد ہوئے اور آج تک قانون سازی کے اصول ہیں۔ اسی نے یورپ میں حریر کی صنعت کو داخل کیا۔ کئی تعمیر کرائے چھاؤنیاں بنوائیں۔ محلات کی بنیادیں رکھیں۔ اور سب سے زیادہ مشہور چیز جو اس کے نام کو یاد دلاتی ہے ایا صوفیہ کا گرجا ہے جسے عثمانی سلاطین نے فتح قسطنطنیہ کے وقت مسجد جامع بنا لیا تھا اور آج تک وہ جامع ایا صوفیہ کے نام سے مشہور اور ان سیاحوں کے لئے قابل دید عمارت ہے جو قسطنطنیہ آتے ہیں۔

لیکن چونکہ شخصی حکومتوں کی ترقی اور تنزل کا باعث ان کے حکمرانوں کی قابلیت یا نالائقی ہوا کرتی ہے اس لئے اگر ان کا بادشاہ صاحب شان اور عالی ہمت ہوا تو وہ بھی عظیم الشان سلطنتیں ہو گئیں ورنہ یا تو بالکل مٹ گئیں یا برائے نام مختصر سی ریاستیں رہ گئیں۔ یوستینیان کے مرنے کے بعد ایسے لوگ تخت نشین ہوئے جنہیں شاہی اور حکمرانی کے جوہر ہی نہ تھے۔ اور وہ اس قابل بھی نہ ہوئے کہ اتنی عظیم الشان سلطنت کو صرف سنبھالے ہی رہتے اسی وجہ سے اس کی تمام شان و شوکت مٹ گئی۔

یوستینیان کے بعد اس کا بھتیجا یوستین دوم اور اس کے بعد طیباریوس تخت نشین ہوئے اور ان کے بعد شاہنشاہ موریس (موریقوس) کی باری آئی جس وقت موریس تخت پر بیٹھا سلطنت کی

نازک ہو چکی تھی اور اندرونی و بیرونی فسادات کا زور شور تھا۔ موریس نے خیال کیا کہ خانہ جنگیاں شروع کرنے سے سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہیگی اس کی حالت سنبھالنے کے لئے غیر ممالک کی فتوحات کا سلسلہ زیادہ مناسب ہو گا۔ لہٰذا اس نے مشرقی دنیا پر حملہ کرنیکا قصد کر کے اہل فارس کو اپنا شکار تجویز کیا اور فارس والوں سے جنگ چھیڑ دی۔ سات برس تک اُن سے لڑتا رہا۔ لیکن کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا یہانتک کہ ۵۷۹ء میں کسریٰ (انوشیروان) کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ہرمز چہارم۔ اورنگ سلطنت پر جلوس فرما ہوا۔ ہرمز نہایت ظالم اور جابر و جبار تھا اس لئے خود اس کی رعایا باغی ہو کر اسپر ٹوٹ پڑی وہ اس بغاوت ہی کے فرو کرنے میں مصروف رہا۔ اور حدود سلطنت کی حفاظت پر توجہ نہ کر سکا۔ جسکی وجہ سے رومیوں کو میدان صاف ملا۔ اور وہ عراق کیجانب سے بلاتکلف ملک میں قدم بڑھاتے چلے گئے۔ اِدہر سے رومیوں کی قتل و غارت کا زور تھا ہی اُدہر دوسری جانب شمال اور مشرقی حدود ملک پر تاتاری قوموں نے چھاپے مارنے اور لوٹ مار کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ ان دو بیرونی اور ایک اندرونی الغرض تین تین مخالفوں کے پنجوں میں گرفتار ہو کر قریب تھا کہ سلطنت فارس کا وجود صفحہ دنیا سے مٹ جائے۔ مگر خداوند پاک کی مرضی نہ تھی لہٰذا اس نے ملک فارس کو ایک ایسا دلیر اور مدبر جنرل عطا فرمایا۔ جسنے ملکی بغاوت۔ رومی فتوحات اور ترکمانی حملوں کا تھوڑی ہی مدت میں پانسہ پلٹ دیا۔ اس جنرل کا نام بہرام تھا اسکی فتوحات اور اولوالعزمیاں دیکھ کر فارس کے باشندے اسکی جانب مائل ہو گئے اور ہرمز کو تخت سے اتار کر اسکی آنکھوں کو گرم آہنی سیخوں سے پھوڑ دیا اور اسکی جگہ اسکے بیٹے پرویز کو تخت نشین کیا بہرام نے پرویز کی تخت نشینی منظور نہ کی اور اسے ذلیل و خوار کیا۔ پرویز خفیہ طور پر قسطنطنیہ بھاگ گیا اور امپرر موریس سے اپنا ترکۂ آبائی حاصل کرنے کیلئے امداد چاہی موریس نے اسی خوشی ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ واپس کیا پرویز نے لڑ بھڑ کر بہرام کو زیر کیا اور پھر اپنا موروثی ملک لے لیا۔ پرویز موریس کے اس احسان کا ہمیشہ ممنون رہا اور جبتک موریس زندہ رہا پرویز ہمیشہ اس سے احسانمندانہ برتاؤ کرتا اور رومیوں کا دوست بنا رہا۔ ۶۰۲ء میں موریس قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا فوقاس تخت نشین ہوا۔ مگر یہ جاہل اور ظالم تھا جسکی وجہ سے رعایا اس سے ناراض ہو گئی اور اس فکر میں پڑی کہ کوئی ایسا زبردست شخص ملے جو ہمیں اس کے پنجے سے رہائی دلوائے۔ انہیں دنوں میں رومانی سلطنت کے گورنروں میں سے ملک افریقہ کا ایک گورنر اکلیوس (ہرقل) نامی تھا قسطنطنیہ والوں نے اس سے امداد چاہی تو اسنے اپنے بیٹے ہرقل اصغر کو ایک جہازی بیڑہ کیساتھ بھیجدیا۔ ہرقل نے ۶۱۰ء میں فوقاس کو قتل کر کے تخت شاہنشہی پر جلوس کیا۔ اسی کے زمانہ میں اسلام کا ظہور ہوا۔

پرویز نے یہ تمام حالات و اخبار سنے تو اسے روم جنگ چھیڑنے کا بہانہ مل گیا۔ اُسنے یہ دعوے کرکے کہ میں اپنے دوست موریس کے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں اپنی فوجوں کے ساتھ ملک شام پر حملہ کردیا۔ شام کے رہنے والے یہودی اس کے مددگار بن گئے۔ پرویز نے شام، مصر اور افریقہ کو فتح کیا انطاکیہ، دمشق، بیت المقدس، اور ملک شام و فلسطین کے دوسرے تمام شہروں پر قبضہ کرلیا اسکے بعد اُسنے اپنی فوج کو یروشلیم کے لوٹ لینے کی عام اجازت دیدی جنہوں نے اُسے لوٹ لیا۔ قبر مقدس کو جلادیا کنیسہ قیامتہ کو بھی پھونک دیا، جس قدر مال و خزانہ وہاں جمع تھا سب نکال لیا وہاں کے بطریب کو پکڑ کر اور اصلی صلیب کو اٹھا کر اپنے ملک کو روانہ کردیا۔ اسیطرح وہ ۶۱۶ئ تک برابر ملک شام میں لوٹ مار کرتے رہے اس عرصہ میں انہوں نے جسقدر عیسائیوں کو قتل کیا انکی تعداد ۹۰۰۰۰ تک پہنچی تھی۔ پھر انہوں نے ایک اور فوج ایشیائے کوچک کیطرف بھیجی اور اسے بھی فتح کیا۔ غرضکہ جہاں وہ جاتے تھے فتح و ظفر انکے ساتھ جاتی تھی قریب تھا کہ وہ لوگ تمام ساحل باسفرس کو پامال کرڈالیں۔



(ہرقل شہنشاہ روم اور اس کے حاشیہ نشین)

ملک کی تو یہ حالت ہو رہی تھی اور ہرقل شہنشاہ روم اپنے محل میں عیش و عشرت کے رنگ میں ایسا ڈوبا ہوا پڑا رہتا تھا کہ نہ اُسے دشمنوں کے ظلم و تعدی کی پرواہ تھی اور نہ تباہی سلطنت کا خیال، لیکن جب اسے یقین ہو گیا

کہ اب تباہی و بربادی کا وقت سر پر ہی آگیا تو وہ خواب غفلت سے چونک کر انگڑائیاں لیتا ہوا دشمنوں کی روک تھام اور ملکی انتظام کے لئے اُٹھا، حالت یہ تھی کہ نہ تو اس کے پاس مال لوبر خزانہ تھا جو فوجوں کی درستی میں کام آتا اور نہ فوج کی حالت اس قابل تھی کہ بلا فراہمی سامان جنگ میدان میں اُتر کر دشمنوں کا مقابلہ کرسکتی ہرقل نے مجبور ہو کر کنیسوں کا مال اس شرط پر قرض لیا کہ خاتمہ جنگ کے بعد اُسے رہنہ سود بیباق کر یگا، اور فوج کو آراستہ کر کے دریائی راہ سے کلیکیا کو گیا جو ایشیا ئی کوچک میں ایک شہر ہے، اور ایسوس میں داخل ہوا۔ جس کا اہل فارس مقابلہ کئے ہوئے تھے، ۶۲۲ء میں اُس نے بمقام مذکور فارس والوں سے پہلی میدان داری کی اور انہیں شکست فاش دی اسی سال میں اہل اسلام نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی،

ہرقل نے متواتر تین برس تک فارس والوں سے جنگ جاری رکھی یہانتک کہ انہیں مارتا اور پیچھے ہٹاتا ہوا انکے ملک میں گھس پڑا اور پرویز مجبور ہوا کہ ملک مصر اور سواحل باسفرس سے اپنی فوجوں کو واپس بلا کر ان سے اپنے اصلی گھر کی حفاظت کا کام لے اور اپنا پائے تخت دشمنوں کے حملوں سے بچائے،

ہرقل نے ۶۲۷ء میں دوسری مرتبہ پرویز کے ساتھ پھر جنگ کی اس مرتبہ اُسنے ایسا پرزور حملہ کیا کہ اہل فارس مقابلہ کی تاب نہ لاسکے اور بڑی بر دست شکست کھا کر پیچھے ہٹے، رومی فوجیں اشوریوں کی قدیم دارالسلطنت نینوی تک بڑھتی چلی گئیں، اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ رومیوں نے اس شہر کو پامال کیا۔ پرویز چونکہ اب بہت بڈھا اور کمزور ہو گیا تھا لہذا اس نے اپنے بیٹے مروز کیواسطے تخت نشینی کی وصیت کی۔ پرویز کا ایک اور لڑکا شیرویہ، نامی بھی تھا اسے اپنے بھائی کے ولیعہد ہونے پر رشک آیا اور باپ بھائی دونوں کے ساتھ ایک چال چلنے کا قصد کیا، بعض اراکین سلطنت کو اپنے ساتھ گانٹھ کر ان کی مدد سے پرویز کی باقیماندہ اولاد کو جنکی تعداد اٹھارہ تھی گرفتار کر لیا اور ان سب کو باپ کے روبرو قتل کر کے باپ کو قیدخانہ میں ڈلوادیا جو وہیں پڑے پڑے مر گیا۔ بعد خسرو پرویز کی موت سے ساسانی حکومت کی عظمت و اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ پرویز کا ناخلف بیٹا شیرویہ بھی اس کے بعد صرف آٹھ مہینے زندہ رہا، اور شیرویہ کی جوانمرگی کے بعد حکومت فارس ڈانوا ڈول ہو گئی چار برس کی قلیل مدت میں نو شخصوں نے سلطنت کا دعوے کیا جسکی وجہ سے تمام ملک میں بدامنی اور فساد کا زور ہو گیا اور خانہ جنگیوں نے تمام قوت توڑدی، اسی زمانہ میں جبکہ فارس مذکورہ بالا حالت میں گرفتار تھا اسپر مسلمانوں نے فوجکشی کردی اور وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پامال ہو گیا،

وہ رومانی حکومت کا حال بھی ابتر ہو رہا تھا۔ یورپین حصہ میں قوم گاتھ کے وحشی لوگوں نے ہلچل ڈال رکھی تھی

یہ لوگ آغاز اسلام کے زمانہ میں ہنگاریا (مجر) کے مغربی حصہ پر قابض ہو گئے تھے۔ علاوہ بریں شرق کی جانب سے سلطنت روم کو ہونیوں کا بھی کھٹکا لگا تھا۔ جو اسپر حملہ کرتے رہتے تھے۔

روم و فارس کی سلطنتوں میں صرف انتظامی ہی خرابی نہ تھی بلکہ ان کے طرز معاشرت اور مذہبی امور میں بھی بہت کچھ پیچیدگیاں پڑ گئی تھیں جو ان کی جڑ کھوکھلی کر رہی تھیں۔ اُن کے مذہب میں بہت سے گروہ پیدا ہو گئے تھے اور وہ سب باہم لڑتے جھگڑتے رہتے چھٹی صدی عیسوی کے قریب عیسائیوں کی حالت بہت نازک ہو رہی تھی اُنمیں بہت سے مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے اور دہرا بندیوں کا زور تھا خصوصاً ایک طبیعت اور دو طبیعتوں اور ایک مشیت اور دو مشیتوں کے مسئلہ میں ان کے مابین سخت اختلاف و نزاع پڑا ہوا تھا انکے متعلق انکے جھگڑے میں جو پھوٹ پڑی ہوئی تھی وہ بہت ہی نقصان رساں تھی۔ مطلب اور مقصود دونوں جماعتوں کا ایک ہی تھا لیکن نزاع لفظی کے پنجہ میں اسیر تھے۔ اور آخرکار اپنی اس حماقت کا شکار بھی ہوئے۔

شاہنشاہ اور اس کے ارکان دولت اس کے قائل تھے کہ مسیح کی دو طبیعتیں اور دو مشیتیں ہیں۔ اور اسکی رعایا کے مصر و شام ایک ہی طبیعت اور ایک ہی مشیت ہونے کی قائل تھی۔ اس آخری جماعت کا نام یعقوبی تھا۔ شہنشاہ ہرقل کے عہد حکومت میں یعقوبی گروہ کے بطریرک اثناسیوس نے جو منبج میں رہتا تھا اس امر کی کوشش بھی کی کہ دونوں جتھوں کو متفق کر دے اور اُن کے باہمی فسادات کو رد کر دے۔ اُسنے اس غرض سے امپرر کے ساتھ خط و کتابت بھی کی۔ اور ایک نیا مذہب ایجاد کیا جو دونوں مذہبوں کے مابین متوسط مذہب ہو سکتا تھا یعنی وہ اس بات کا قائل ہوا کہ مسیح کی طبیعتیں تو دو ہیں لیکن مشیت صرف ایک ہے۔ شہنشاہ نے اسکی رائے سے اتفاق کیا اور کہا اسقدر اور ٹھہر جائیے کہ میں قسطنطنیہ کے بطریرک سے اس معاملہ میں گفتگو کر لوں جسکا نام بیروس تھا اور وہ اصل میں ملک شام ہی کا باشندہ تھا۔ اثناسیوس نے اس امر میں شہنشاہ کے ساتھ سلسلہ جنبانی کرنے سے پہلے ہی بیروس کو اپنا ہمخیال بنا لیا تھا اسلیئے اس نے شہنشاہ کے دریافت کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ شاہنشاہ نے اس نئے اعتقاد کو تسلیم کرنے کیلئے ایک فرمان صادر کیا جسکو اکثر مشرقی ملک کے اسقفوں نے تو قبول کر لیا۔ لیکن یروشلیم کے بطریرک صفرونیوس اور کچھ تھوڑے سے اسقفوں نے جنکا سرگروہ عمان کا اسقف تھا اور نیز تمام شاہی چرچ کے پیروؤں نے اس اعتقاد کو منظور نہ کیا۔ شہنشاہ کو یہ بات ناگوار ہوئی اور وہ عدول حکمی کرنے والوں سے بدلہ لینے پر تیار ہو گیا۔ جنمیں رومی لوگوں کا بہت بڑا حصہ تھا اس طرح کئی گروہوں میں باہم نفاق پیدا ہو گیا خود شہنشاہ اور قسطنطنیہ اسکندریہ اور انطاکیہ کے بطریرک یہ سب ایک گروہ میں داخل تھے جو دو طبیعتوں اور

ایک مشیت کا ماننے والا تھا اور یروشلیم کا بطریک اور تمام رومانی گرجا کے پیرو دوسرا گروہ تھے؛ جنکا اعتقاد یہ تھا کہ مسیح کی طبیعتیں بھی دو ہیں اور مشیتیں بھی دو۔ یعقوبی گروہ یعنی قبطی جو ان کے رہنے والے اور تمام ملک مصر و شام کے اندرونی حصہ ملک کے باشندے ایک علیحدہ گروہ تھے اور نسطوری یعنی عراق اور جزیرہ کے لوگوں کا جتھا جدا تھا۔ یہ فرقے ان گروہوں کے علاوہ تھے جو پہلے سے موجود تھے مثلاً خیالی فرقہ کے لوگ جو کہتے تھے کہ حقیقت میں مسیح کو سولی نہیں دی گئی بلکہ اُن کی جگہ ایک اور شخص سولی پر چڑھایا گیا۔ اور اکیفالی لوگ جو روسا کی فرمانبرداری کے قائل نہ تھے یہ لوگ خارجیوں کی مانند تھے؛ پھر یعقوبیوں کی بھی بہت سی قسمیں تھیں جن کا بیان باعث طوالت ہوگا۔

ان باہمی تفرقوں کا طرز حکومت پر بھی نہایت برا اثر پڑا۔ کیونکہ رومیوں کی سلطنت میں حکمرانی مذہب کے ساتھ ساتھ رہتی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض اوقات قومیں کی قومیں رومیوں کے قبضہ اقتدار سے نکلکر فارس والوں کی زیر اثر ہوگئیں جس طرح ارمینیا والے۔ کیونکہ جب قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ والوں نے ایک طبیعت کہنے کی بدعت کو ناجائز ٹھہرایا تو شہنشاہ روم نے اسکے ماننے والوں پر سخت گیری کی اور ان کو دق کرنا شروع کیا آرمینیا والے بھی انہیں لوگوں میں داخل تھے حکام کے جور و تعدی سے دق ہوکر انہیں مجبور ہونا پڑا کہ اپنا ملک فارس والوں کے سپرد کردیں اور رومانی حکومت کے پنجے سے چھوٹ جائیں یہی کام قبطیوں نے بھی کیا۔ جب عمرو بن العاص ملک مصر کی فتح کو آئے تو یہ لوگ ان کے مددگار اور طرفدار بن گئے جسکا سبب اصلی یہی باہمی نفاق اور جبر و تعدی سے بچنا تھا۔

امور مذکورہ بالا پر یہ ایک امر اور اضافہ کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ تعصب کی وجہ سے یہودیوں اور رومیوں (عیسائیوں) میں ایک خاص قسم کی سخت عداوت تھی؛ یہ دشمنی ہرقل کے زمانہ میں اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایکبار یہودیوں نے بغاوت کرکے انطاکیہ میں بڑی ہلچل ڈالدی؛ اور وہاں کے بطریک کو قتل کرکے اس کی لاش کی بری گت بنائی۔ آخر ہرقل نے انکی جانب ایک بھاری فوج روانہ کرکے انمیں سے ایک جم غفیر کو قتل کرادیا۔ یہودیوں نے فینیقیہ کے دارالسلطنت صور میں بھی علم بغاوت بلند کرکے وہاں کے حاکم کو قتل کر ڈالا صور؛ فینیقیہ اور فلسطین کے یہودیوں نے آپس میں یہ ٹھانی کہ رات کے وقت شہر صور میں گھس کر عیسائیوں کو قتل کرڈالیں صور کے مطران کو کسی طرح اس دغا بازی کی خبر ملگئی اسنے حاکم شہر کو ہوشیار کردیا اور حاکم شہر نے محافظ فوج اور دربانوں اور پہرہ داروں کو تاکید کردی کہ اس رات جوکنے اور خبردار رہیں رات کا اندھیرا چھاتے ہی یہودیوں نے باہر سے شہر پناہ پر حملہ کیا لیکن یہاں فوج تیار تھی اسنے مقابل ہوکر انہیں پسپا کردیا۔ یہودیوں نے اسطرف کامیاب نہ ہوکر کھسیانے ہوکر شہر کے قرب و جوار میں جو دیر اور گرجے واقع

تھے اپنے دبا دبا لیا اور انہیں منہدم کرکے وہاں کے سامان اور برتن وغیرہ لوٹ لئے گئے اور ایسا ہی سلوک گرد و نواح شہر کے دیہاتوں میں بھی کیا حکومت نے یہودیوں کو اس شرارت کی سزا دی کہ شہر صور کے تمام یہودیوں کو ایک ایک کرکے قتل کرا دیا اور اسی قسم کا واقعہ ملک فلسطین کے شہر قیساریہ میں بھی ہوا۔ جہاں بادشاہ نے اپنے بھائی تادورس کو بھیجا جس نے جاکر وہاں کے تمام یہودیوں کو قتل کر ڈالا ان وجوہ سے ملک کے ہر گوشہ میں یہودیوں کے اندر ایک غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ حکومت کے جانی دشمن ہوگئے جن باتوں نے رومیوں کو یہودیوں کی طرف سے ڈرا کر ان سے پرحذر رہنے پر آمادہ کیا تھا ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ بعض نجومیوں نے شاہنشاہ سے کہا تھا کہ عنقریب ایک مختون شخص تمہاری سلطنت چھین لے گا۔ اسی بنا پر عرب والے کہتے ہیں کہ مختون لوگوں سے اہل اسلام مراد ہیں۔ یہودیوں نے جن جن طریقوں سے رومیوں کو تباہ و برباد کیا انہیں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے فارس والوں سے اسی ہزار عیسائی قیدی خرید کر ان سبھوں کو ذبح کر ڈالا۔

اس عداوت کا انحصار صرف رومیوں اور یہودیوں پر ہی نہ تھا بلکہ دراصل عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین یہ عداوت عام تھی عیسائی حکومتیں کوئی قانون بناتیں تو اس میں چند دفعات خاصکر یہودیوں کیلئے مقرر کرتیں۔ تاکہ ان کیساتھ حقارت اور ظلم کا برتاؤ کر سکیں۔ مثلاً اسپین کی حکمران قوم گاتھ بادشاہوں نے فتوح اسلامی کے قریب قریب زمانہ میں اپنی یہودی رعایا کے لئے حکومت قوم گاتھ کے دشمن نام تجویز کیا تھا حکومت مذکورہ کی مذہبی مجلسوں نے اسرائیلی مذہب کی بیخکنی پر متفق ہو کر سلطنت کو حکم دیدیا تھا کہ یہودیوں کو ان کے تہوار منانے سے روکا جائے انہیں عیسائیت کی عزت کرنے پر مجبور کیا جائے۔ غرضکہ ان پر اسقدر سختی کیگئی اور دباؤ ڈالا گیا کہ وہ پریشان ہو کر بظاہر عیسائی بننے پر مجبور ہوگئے لیکن ان کے دل برابر یہودی رہے جو طرح طرح کے ظلم وستم اٹھانے کے رنج و عداوت سے اسقدر بھرے ہوئے تھے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر لوٹ جائیں قوم گاتھ کے لوگ بھی یہودیوں کی اس پردہ دلی عداوت سے بیخبر نہ تھے اور اسی وجہ سے وہ لوگ یہودیوں کے ساتھ اصلی اور خالص عیسائیوں کا سا برتاؤ نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں تمدن کے تمام جائز حقوق سے محروم کر رکھا تھا ان کے واسطے باندی غلاموں کا خریدنا جرم قرار دیا تھا اور ان کے ذلیل کرتے رہنے میں اسقدر مبالغہ کرتے تھے کہ انہیں پڑھنے اور تعلیم کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ گیا ان سب باتوں کے معلوم ہو جانے پر بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ یہودیوں نے اپنے عیسائی حکام کے مقابلہ پر اہل اسلام کی امداد کی تھی۔

رہگئے اہل فارس تو انکا طرز معاشرت بھی اسلام سے ایک مدت پہلے ہی سے بڑا انحطاط قبول کر چکا تھا مانی اور

مزدک کی وجہ سے مذہب میں شاخیں پھوٹنے سے ان کے مابین اختلاف و نزاع کا سامان موجود ہو گیا تھا
اس آخر الذکر شخص (مزدک) کا یہ دعوے عجیب و غریب تھا کہ "خداوند پاک نے اُسے اسلئے مبعوث کیا ہے تاکہ
وہ عورتوں اور مال و دولت کو سب آدمیوں میں برابر تقسیم کر دے"، اسلئے کہ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں"
اس مذہب کا اتباع فارس کے ایک بادشاہ قباد نامی نے کیا تھا۔ پھر اس کے جانشین نے اس مذہب کو توڑ کر
ایک اور جدید مذہب اختیار کیا اور اب اختلاف رائے کا سلسلہ بڑھنے لگا جس کا نتیجہ فساد اخلاق ہوا؛

جس زمانہ میں روم اور فارس والوں کی حالت یہ کچھ تھی جو ہم بیان کر چکے ہیں ان دنوں اہل عرب اپنی
ترقی کے عالم شباب میں تھے، اُنمیں اتفاق کی قوت موجود تھی؛ اور نیز اُنہیں اُن رومی اور فارسی لوگوں سے
جو اپنے حکام سے یا مخالف فرقوں کی زبردستی سے تنگ آن آن کر بھاگتے؛ اور اہل عرب کے پاس پناہ
لیتے کافی مدد پہنچ رہی تھی؛

انتشار اسلام

اسلام کی تاریخ ہجرت کے وقت سے شروع ہوتی ہے، مسلمانوں نے قریشیوں کی ایذا دہی اور شرارتوں
سے تنگ آ کر مدینہ کی جانب ہجرت کی؛ وہ تھوڑے سے آدمی ہونے کے باعث اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے
تھے پھر اُنہوں نے اہل مدینہ کو اپنی امداد و اعانت پر آمادہ پایا۔ کیونکہ مشہور بیعت عقبہ کے ظہور نے انہیں اسکا
یقین دلا دیا تھا کہ اہل مدینہ ہمارے سچے معین و ناصر ہونگے نبی عربی (علیہ السلام) نے اپنے پیرؤں کو حکم دیدیا
کہ مکہ چھوڑ دیں اور مدینے چلے چلیں؛ مدینہ کے لوگوں نے بھی ان نئے مہمانوں کی خاطر داری اور ان کو جگہ
دینے میں بہت سی کشادہ دلی اور خلوص سے کام لیا؛

نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مکہ کے رہنے والے قریشیوں
اور یثرب کے باشندوں انصاریوں باہم دوستی اور بھائی چارہ کرا دیا۔ اس سے پہلے وہ لوگ ایکدوسرے سے
چشمک رکھتے تھے؛ اور یثرب والے ہمیشہ مکہ والوں پر سبقت لے جانیکے خواہشمند رہتے تھے مگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے اسلام کو ان دونوں جماعتوں کے مابین رابطہ اتحاد بنا دیا؛ اور دونوں فریقوں کے درمیان ایک عہدنامہ لکھا گیا
جسمیں انہوں نے ایک ہی قوم کے افراد ہونیکا اقرار کیا تھا؛ ابن ہشام نے اس اقرار نامہ کی پوری عبارت نقل کی ہے اس کے بعد

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش میں سے مہاجرین اور یثرب والوں میں سے انصار کو چند اور خاص معاہدوں کے ذریعہ باہم پیوند کر دیا۔ ان معاہدوں کا نام (مواخاۃ) بھائی بندی رکھا گیا اور پیغمبر (علیہ السلام) نے بہت ہی استحکام کے ساتھ اس بھائی چارہ کا اُن سے اقرار لیا۔ اسلامی سلطنت کا پہلا بنیادی پتھر یہی "عہد مواخاۃ" تھا جو مہاجرین اور انصار کے مابین مستحکم کیا گیا اور اسوقت میں مسلمانوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی مسلمانوں کے ایک امن کی جگہ میں پہنچ جانے پر اُن کے لئے زکواۃ اور روزے فرض ہوئے شرعی سزائیں مقرر کی گئیں اور حرام وحلال کی حدود معین ہوئیں غرضکہ احکام اسلام پُوری طرح نافذ ہونے لگے رفتہ رفتہ مدینے کے بعض ذی وجاہت لوگ بھی مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو گئے جن کے اسلام لانے سے مذہب اسلام کو ویسی ہی امداد پہونچی جیسی کہ مکہ میں حضرت حمزہؓ اور عمر بن الخطابؓ کے اسلام لانے سے پہنچی تھی۔

عہد وپیمان دوستی سے فراغت حاصل ہو گئی اور پرامن جگہ میں رہنے سے اطمینان ہو لیا تو مسلمانوں کو اہل مکہ کی ایذادہی اور ان کے مظالم کا خیال آیا۔ انہوں نے انتقام لینے کی غرض سے قریشیوں پر چھاپے مارنے اور جنگ کرنیکا قصد مصمم کیا اور بہت سے مشہور غزوات وجود میں آئے جو اسلامی جنگوں کا مقدمہ تھے اسلامی جنگ عرب کی معمولی عادت کے موافق جس کے وہ زمانہ جاہلیت سے عادی تھے۔ چھوٹی چھوٹی مہموں اور قتل وغارت سے شروع ہو کر شہروں اور ملکوں کی فتح پر تمام ہوئی۔ ان غزوات میں سب سے اہم اور مشہور "غزوہ بدر کبریٰ" کی مہم تھی کیونکہ اس جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی نے انہیں پے درپے جنگ وجدل کرتے رہنے کا شوق دلایا اور ان کے ارادوں کو قوی بنا دیا تھا۔

غزوہ بدر کبریٰ

مکہ اور مدینے کے مابین چند کنوئیں ایک مقام پر واقع ہیں جہاں پر مکہ سے ملک شام کو آنے جانیوالے قافلے ٹھہرا کرتے ہیں اسی مقام کا نام "بدر" ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اگر قریشی تجارت پیشہ تھے ان کے قافلے ملک شام کو مال لینے جایا کرتے تھے۔ ۲ھ میں مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ قریشیوں کا ایک قافلہ تجارتی مال لے کر ملک شام سے آتا اور مکہ کو جاتا ہے اور اس قافلہ کیساتھ تیس محافظوں کا دستہ ہے جنکا افسر ابوسفیان بن حرب اس زمانہ کا سردار مکہ ہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اصحاب کو اس قافلہ کے غارت اور اس کے محافظوں سے جنگ کرنے کیلئے روانہ کیا۔ ابوسفیان کو اس کی اطلاع ہوئی تو سنتے ہی بہت جلد ایک قاصد بھیجکر اہل مکہ سے کمک چاہی۔ مکہ سے نوسو پچاس شخص کمک پر چلے جنمیں سو (گھوڑے کے) سوار تھے مسلمان بھی اپنی پوری قوت کیساتھ نکلے جنکی کل تعداد (۳۱۳) نفر تھی۔ انمیں ستر مہاجرین تھے اور باقی انصار اس تمام

فوج کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے، جس وقت اسلامی جماعت مدینہ سے باہر آئی ہے اُسے خبر ملی کہ قریش کا قافلہ بدر کے کنوؤں سے قریب آگیا ہے؛ لہذا انہوں نے پیشقدمی کر کے کنوؤں پر قبضہ کر لیا اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ایک عریش (کھجور کے پتوں کا بنایا ہوا چھپر) تیار کر دیا جسکے نیچے وہ تشریف فرما ہوئے؛ اور ابوبکر رض انکے ساتھ تھے؛ اور دیگر اصحاب جنگ کی تیاری کرنے لگے؛

اسی اثناء میں انہوں نے اہل قریش کو بھی آتے دیکھا جو اُن سے تگنی جمعیت رکھتے تھے؛ اور اُنمیں مکہ کے وہ چیدہ چیدہ لوگ شریک تھے؛ جنہوں نے بہت زور کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کیا تہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی دل کھول کر اہانت کی تھی منجملہ ان کے ایک شخص ابوجہل بن ہشام بھی تہا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی سمجھ لیا کہ یہ لڑائی انقطاعی اور فیصلہ کن ہوگی؛ یا تو مسلمانوں کی فتح ہوئی اور جب قریش وہ غالب آگئے تو اسلام کو بہت کچھ قوت حاصل ہوجائیگی اور یا پاسہ پلٹا اور مغلوب ہو کر بالکل نیست و نابود ہوجائینگے۔ اسلئے جب انہوں نے قریش کی آمد اتنی زیادہ تعداد میں دیکھی اور اپنے اصحاب کی قلیل جماعت پر نظر کی تو فرمایا؛ "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد فی الارض" یعنے اے پاک خدا اگر یہ مختصر سا گروہ ہلاک ہوگیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا؛

عرب کی معمولی عادت کے مطابق ایک ایک آدمی نے طرفین سے نکل نکل کر مقابلہ شروع کیا؛ اسی اثناء میں ابوجہل مقتول ہوا؛ اور اس کا سر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لایا گیا جسے دیکھ کر آنہوں نے خدا کے سامنے سجدہ شکر کیا؛ اب میدان کارزار گرم ہوگیا فریقین ایکدوسرے سے بڑھ گئے نیزے بیکار ہوکر تلواریں کھنچ گئی تہیں اور کشت و خون کا بازار گرم تہا۔ کچھ دیر کے بعد لڑائی کا رنگ بدلا کفار مکہ پر شکست اور مسلمانوں پر فتحمندی کا سایہ ہوا اس جنگ میں مسلمانوں کی جانب سے صرف چودہ شخص شہید ہوئے جنمیں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے اور قریش والوں کے ستر آدمی کام آئے جنمیں قریش کے تمام گھرانوں کے معزز لوگ شامل تھے؛ خصوصاً بنو امیہ۔ بنی مخزوم اور بنی اسد کے لوگ زیادہ تر تھے؛ اور اسیقدر یعنے ستر آدمی انکے گرفتار بھی ہوئے جنمیں عقبتہ بن ابی معیط بھی تہا؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے قتل کا حکم دیا۔ کیونکہ اُسنے مکہ میں آپ کو بہت ستایا تہا؛ اس جنگ میں سب سے زیادہ پرجوش اور کوشش کرنیوالے مسلمان صرف دو تھے ایک علی بن ابی طالب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور دوسرے حمزہ بن عبد المطلب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا؛ قریش کے باقیماندہ لوگ تمام ساز و سامان چھوڑ کر مکہ کی جانب بھاگ نکلے

اور انہیں ہزیمت خوردہ لوگوں میں ابوسفیان اور عمرو بن العاص بھی شامل تھے جو آخر کار اسلام کے مشہور جنرلوں میں ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے خوشی خوشی مال غنیمت اٹھایا مگر اسکے حصے کرنے میں انہیں باہم نزاع واقع ہوا۔ نبی نے اپنے ہاتھ سے وہ سب مال ان لوگوں کو برابر بانٹ دیا اور اپنی ذات خاص کے لئے کچھ نہ رکھا۔ اسکے بعد قریش والوں نے کچھ لوگ بھیجے اور اپنے قیدیوں کا زر فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا منگایا اس طرح بھی بہت سا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مکہ والے ہارے بھاگے اپنے گھر واپس آئے۔ اس شکست سے اہل مکہ کی شان و شوکت گھٹ گئی اور مسلمانوں کی دھاک بندھ گئی تھی۔ سب سے بڑی تائید اہل اسلام کو اس وقت سے پہنچی کہ اسلام کا مشہور دشمن ابالہب بدر کی لڑائی میں خود نہیں شریک ہوا تھا۔ بلکہ اس نے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنا کر میدان میں بھیجا تھا (اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ جنگ میں اپنا قائم مقام بھیج دیتے تھے) جس وقت اسے قریش والوں کی شکست کی اطلاع ملی اسقدر رنج و غم میں مبتلا ہوا کہ اسی کوفت میں چند روز بعد مر ہی گیا۔ چونکہ بدر کا واقعہ اسلامی فتوح کی بسم اللہ تھا۔ لہٰذا تاریخ اسلام میں اس کا مرتبہ اور اس کی شان بہت بلند ہے۔

جنگ احد قریشیوں نے بدر کی شکست کے بعد دو برس گذر دوسرے سال پھر جنگ کی تیاریاں کیں اس مرتبہ ان کا سردار ابوسفیان تھا اور جنگ آوروں کی تعداد تین ہزار جن میں سات سو زرہ پوش اور دو سو سوار تھے۔ یہ جرار لشکر بدر کے مقتول لوگوں کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہوا اور مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے چلا۔ ان کیساتھ عورتیں بھی تھیں جو دف بجا بجا کر بدر کے مقتولوں کا نوحہ کرتی ہوئیں اور لوگوں کو مسلمانوں سے لڑنے کیلئے جوش دلاتی ساتھ چلتی تھیں اس حملہ کے نامور لوگوں میں خالد بن الولید مخزومی بھی تھے جو بعد میں اسلام کے ایک مشہور جنرل ہوئے۔ یہ فوج مدینہ کے مقابل پہنچی تو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اصحاب کے ساتھ مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں ٹھہر کر مدافعانہ پہلو اختیار کیا جائے اور صحابہ میں سے بھی ایک شخص عبداللہ بن ابی سلول نامی نے یہی رائے دی۔ مگر باقی صحابہ میدان میں جنگ لڑنے پر مصر ہوئے اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کثرت رائے کی پیروی کر کے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے اور شہر مدینہ اور احد نامی پہاڑ کے وسط میں ٹھہرے اسی پہاڑ کے نام سے یہ واقعہ بھی موسوم ہوا ہے۔ ابن ابی سلول مذکور اس پیچ و تاب میں تھا کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اسکی رائے کی خلاف ورزی اور دوسروں کی پیروی کی ہے۔ جس وقت سب لوگ وسط راہ میں پہنچے ہیں وہ ایک تہائی لوگوں کے ساتھ مدینہ کو پلٹ گیا اور قریش والوں نے فوج میں افواہ اڑا دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر وحشت اثر سنکر

مسلمانوں کے پیر اکھڑ گئے اور اس جنگ میں انہیں فتح نصیب نہ ہوئی انہیں سے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہوئے اور ان کی شہادت ہی زیادہ تر ہزیمت کا موجب ہوئی جس طرح کہ ان کا اسلام لانا باعث ازدیاد تقویت اسلام ہوا تھا۔ مسلمانوں کی شہدا کی تعداد ستر شخصوں تک پہنچی اور خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک پتھر لگنے سے سر (مبارک) میں چوٹ آئی۔ اور اس زخم میں حلقہ کی چند کڑیاں گھس گئیں جس سے خون بہ نکلا۔ قریش والوں نے مسلمانوں کے شہیدوں کو بہت ہی بیحرمت کیا انکے ناک کان کاٹ لئے یہانتک کہ ہند بن عتبہ ابی سفیان کی بی بی (معاویہ کی ماں) نے حمزہ کا پیٹ پھاڑ کے ان کا کلیجہ نکال لیا اور اسے دانتوں سے کچل کر نگلنا چاہا۔ لیکن نگل نہ سکی اور تھوک دیا۔

یہ آفت مسلمانوں کے لئے اسوقت تک کے تمام مصائب سے زیادہ سخت تھی۔ مگر چونکہ وہ پہلے فتح و نصرت کا ذائقہ چکھ چکے تھے لہذا انہوں نے اس ہزیمت کا الزام ابن سلول کی بیوفائی پر رکھ کر (چھوٹی چھوٹی مہمات) جنگ کا سلسلہ اسوقت تک جاری رکھا جبکہ واقعہ خندق پیش آیا۔

واقعہ خندق

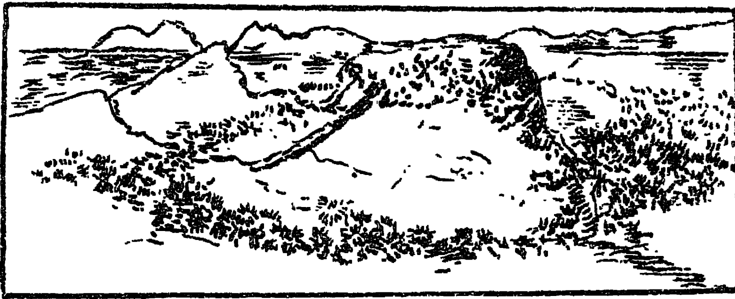
اس جنگ کی وجہ یہ ہوئی کہ جب عرب کے قبائل نے قریش والوں کو احد کے جنگ میں کامیاب ہوتے دیکھا تو وہ سب کے سب اہل مکہ کے ساتھی بن گئے یعنی قریش غطفان اور تمام عرب کے قبیلے شامل ہو گئے۔ اور ساتھ ہی یہودیوں کے دو گھرانے بنو نضیر اور بنو قریظہ بھی انہیں مل گئے۔ کیونکہ مسلمانوں نے ان کو انکے وطنوں سے نکال باہر کر دیا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر اسکا ذکر آئیگا۔ ان لوگوں نے اور بھی قریش کو جنگ کے لئے ابھارا اور سترہ اٹھارہ ہزار آدمیوں کی عظیم الشان جماعت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا اس فوج میں چار سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے اور چونکہ وہ سب مختلف گھرانوں اور گروہوں سے مرتب ہوئی اسلئے اس واقعہ کا نام (احزاب) بھی مشہور ہے۔ غنیم تو اسقدر کثیر تعداد میں تھے اور مسلمانوں کا شمار تین ہزار سے زائد نہ تھا۔ لہذا ان میں سخت بےچینی پھیلی اور انپر خوف طاری ہو گیا۔ چونکہ پہلے واقعہ سے انہیں یہ سبق بھی مل چکا تھا کہ شہر سے باہر نہ جائیں لہذا وہ اسی پر عامل رہے۔ ان دنوں صحابہ کے گروہ میں ایک شخص فارس کے رہنے والے سلیمان نامی موجود تھے انکو کسیقدر فنون جنگ سے آگاہی تھی انہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خندق کھودنے کی صلاح دی عرب والے بیشتر اس طریقہ کو جانتے نہ تھے لہذا انہیں ایک نئے کام میں تحیر و تردد ہوا۔ اس حالت کو دیکھ کر سلیمان نے کہا جب ہم ملک فارس میں تھے تو دشمنوں کے حملہ کا خوف ہونیپر اپنے پڑاؤ کے چاروں سمت خندق کھود لیتے تھے اور اس بات کا شمار تدابیر

جنگ میں ہوتا تھا نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے سلیمانؓ کی رائے پسند فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بہ نفس نفیس اصحاب کے ساتھ مٹی ڈھونے میں شریک ہوئے۔ مگر چونکہ مسلمانوں کے پاس خندق تیار کرنے کیلئے ضروری اوزار تک نہ تھے لہذا انہوں نے کسیقدر اس قسم کا سامان بنو قریظہ (یہودیوں) سے مستعار لیا اور چند دنوں میں جنکی تعداد دو ہفتوں کے قریب ہوگی بہت عمدہ خندق شہر مدینے کے گرد تیار کر لی۔

احزاب مدینہ کی چاروں جانب اترے اور محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ شہر پر حملہ کرنے سے خندق ان کو روکتی تھی بیس دنوں سے زائد وہ یونہی پڑے رہے اس عرصہ میں وہ پتھروں اور تیروں کے ذریعہ سے جنگ کرتے رہے۔ خندق کے معاملہ نے انہیں خوف میں مبتلا کر دیا تھا وہ جانتے تھے کہ یہ کوئی نیا فریب ہے اسپر بھی بعض منچلوں نے مع گھوڑے کے خندق کو دجانا چاہا۔ لیکن وہ اسمیں گر پڑے اور انکی گردنیں چور چور ہوگئیں اس صورت نے اور بھی غنیم کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا۔ آخر اس نے بے نتیجہ محاصرہ سے دق ہو کر میدان میں نکل کے لڑنے کا ارادہ کیا اور اسکی جانب سے ایک شخص نے میدان میں آکر مسلمانوں میں سے اپنا مقابل طلب کیا۔ مسلمانوں کیطرف سے علیؓ اس کے مقابلہ پر گئے اور رد و بدل کے بعد اسپر غالب آئے۔ اسی کے بعد سرد ہوا چلنی شروع ہوئی اور خوب زور کا پانی پڑا جسنے احزاب کے خیموں کو تر کر کے انکے چولہوں کو ٹھنڈا کر دیا مدینہ والے اپنے گھروں میں بآرام بیٹھے تھے جنہیں بہت کم تری کا اثر پہنچا تھا غنیم اس آسمانی بلا سے اور بھی پریشان ہوا اور اسے اپنے لئے شگون بد خیال کر کے محاصرہ توڑ دیا اور پسپا ہو گیا۔ بلا منت غیرے دشمنوں کے اسطرح ہزیمت اٹھانے سے مسلمانوں کو احد کی شکست کے ننگ سے بھی نجات مل گئی۔

یہانتک جسقدر جنگوں کا ذکر ہوا ان میں فتح ملکی کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ محض مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ تھی۔ اسلامی فتوحات کی پہلی بسم اللہ بنی نضیر (یہود) کی سرزمین کو فتح کرنے سے ہوئی۔ بنی نضیر یہود کا ایک گھرانا تھا ایک معاملہ ایسا آپڑا جسنے مسلمانوں کو ان لوگوں کے جلا وطن کرنے پر مجبور کیا۔ لہذا نبی نے ان سے کہلا بھیجا کہ وہ سیدہی طرح کان دبا کر اپنے ملک و مال کو چھوڑ دیں اور جدہر ان کا جی چاہے چلے جائیں بنو نضیر نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم ماننے سے انکار کیا جسکے بعد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنہ ۴ھ میں چھ روز تک ان کی بستیوں کا محاصرہ کئے رکھا۔ بنو نضیر نے یہ حالت دیکھ کر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ اتنی مہلت دیدیں کہ جسقدر مال وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لیجا سکیں لیجائیں۔ مگر ہتھیار ایک بھی نہ لینگے جسکو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور کر لیا اور بنو نضیر اپنے ملک سے نکل گئے انکے جانے کے بعد انکا جسقدر مال و اسباب

وہ خاص نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملکیت ہوا اور انہوں نے جس کو چاہا اس میں سے عطا کیا ایسی ہی صورت قریظہ (یہودیوں کا ایک دوسرا گھرانا) اور خیبر میں پیش آئی۔ خیبر کے بہت سے قلعے تھے جنکو اہل اسلام نے یکے بعد دیگرے فتح کیا۔



(قلعہ خیبر)

قریش والوں کو خندق کے واقعہ کے بعد یہ آسان معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے صلح کر لیں لہذا ۶ھ کے قریب انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مدینہ کا رہنے والا شخص (مسلمان) اگر حج اور عمرہ کرنے کیلئے مکہ آئے یا مکہ میں ہو کر یمن اور طائف کو جانا چاہے تو وہ بخیطر ہوگا۔ اور مکہ کے لوگوں میں سے یا انکے ساتھیوں میں سے جو شخص ملک شام اور مشرق کو جاتا ہوا مدینہ کی حدود میں سے گذرے وہ بھی بخیطر رہے۔

اس صلح کے بعد مسلمانوں نے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کیساتھ اشاعت اسلام کا کام شروع کیا۔ چونکہ احزاب کی ہزیمت نے قبائل عرب کے دلوں پر بہت گہرا اثر ڈالدیا اور اسلام کی شان و شوکت انکی نظروں میں بہت بلند ہو گئی تھی۔ لہذا وہ خود بخود گروہ در گروہ مدینہ کو آتے اور اسلام قبول کرتے۔ انہیں آنیوالوں میں دو شخص ایسے تھے جن کو اسلامی دنیا میں بڑی شہرت حاصل ہوئی وہ دونوں شخص خالد بن الولید اور عمرو بن العاص تھے۔ یہ دونوں صاحب اسلام کے مشہور جنرل (سپہ سالار) ہیں۔ قبائل عرب کے اسلام قبول کرتے جانیسے مسلمانوں کو عزت پر عزت نصیب ہوتی جاتی تھی اور ان کی امیدوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اگلے سال نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شاہان دنیا کے پاس دعوت اسلام کی غرض سے قاصد روانہ کئے۔ اور ملک شام میں رومیوں سے جنگ کرنے کیواسطے ایک فوج بھی بھیجی۔ اس اسلامی فوج نے ملک شام کی حدود میں جو حوران سے متصل ہیں بلقا کے ایک گاؤں میں جسکا نام موتہ تھا۔ رومیوں کا مقابلہ کیا۔ روم والوں کیساتھ ان کی یہ پہلی لڑائی تھی چونکہ اہل عرب نے ابتک کبھی

باقاعدہ فوجوں سے جنگ نہیں کی تھی لہذا وہ کامیاب نہو سکے اور مدینہ کو واپس گئے واقعہ میں چند اعلے درجہ کے صحابی کام آئے جنمیں سے ایک جعفر بن ابی طالبؓ کے بھائی بھی تھے۔

فتح مکہ اسی اثناء میں ایک ایسا حادثہ گزرا جس کیوجہ سے مسلمانوں اور قریش کے بیچ صلح کا معاہدہ شکست ہو گیا ابوسفیان نے خیال کیا کہ اب قریش والوں کو مسلمانوں کی مخالفت اور مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی ہے لہذا وہ خود نئے سر سے معاہدہ صلح قائم کرنے کے لئے مدینہ آیا۔ مسلمانونکو غنیم کی کمزوری معلوم ہو چکی تھی وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں چوکے انہوں نے ابوسفیان سے تو یہ کہا کہ ہمیں صلح منظور ہے اور اس سے وعدہ کیا کہ معاہدہ آشتی کر لیں گے۔ لیکن جب ابوسفیان مطمئن ہو کر مکہ کو واپس چلا گیا تو مسلمانوں نے بہت ہی تیزی کیساتھ مکہ پر فوجکشی کا انتظام کر لیا اور یلغار کر کے مکہ پر جا پہنچے تاکہ یکایک اسپر حملہ کر دیں اور وہاں کے لوگوں کو مدافعت کے لئے تیار ہو سکنے کا موقع نہ دیں جسوقت یہ اسلامی لشکر مکہ پر پہنچا ہے اسکی تعداد دس ہزار تھی جسمیں مہاجر انصار اور ان کے حلیف قبیلے سب شامل تھے۔ ابوسفیان اور قریش کے چند اور معزز لوگ تجسس حالات کیغرض سے مکہ کے باہر آئے تھے راہ میں انہیں عباسؓ بن عبدالمطلب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا ملے جنہوں نے ان کو مسلمانوں کی فوجی قوت اور انکی شان و شوکت سے مطلع کر دیا۔ ابوسفیان نے عباسؓ سے کہا۔ اب تو تمہارے بھتیجے صاحب کی بڑی عزت و عظمت ہو گئی ہے جسکے جواب میں عباسؓ نے ابوسفیان کو یہ مشورہ دیا کہ تم مسلمانوں سے اپنے لئے امان حاصل کر لو۔ ابوسفیان کو بھی اس مشورہ سے بہتر صورت نظر نہ آئی۔ لہذا وہ عباسؓ کے ساتھ ساتھ اسلامی کیمپ میں داخل ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی بہت کچھ خاطر کی اور صحابہ کو اسکے ستانیسے باز رکھا جو ملیں اسے ضرر پہنچانے تلے بیٹھے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو ایسا ہاتھوں ہاتھ لیا کہ وہ انکا ہوا خواہ بنگیا۔ یہانتک کہ انہوں نے ہر ایسے شخص کو جو فتح مکہ کے دن ابوسفیان کے گھر میں پناہ لی اسی طرح امن دیدیا جیسا کہ مسجد کے اندر پناہ لینے والے کو امن بنا دیا تھا۔ ابوسفیان اسقدر رعائتیں حاصل کر کے مکہ میں واپس آیا اور وہاں کے لوگوں سے تمام حالات بیان کئے جنھیں سنکر اہل مکہ نے اسے بزدل اور پست ہمت کہنا اور گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اور سب اس سے الگ ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے اسکی مونچھیں پکڑ کر کہا۔ اقتلوا[1] الحمیت الدسم الاحمس قبح اللہ من طلیعۃ قوم۔ لیکن ابوسفیان نے ان تمام باتوں کی کچھ پرواہ نہ کی۔ +

---

[1] گردن مارو اس پیٹے کٹے کی۔ خدا تباہ کرے اس کو قوم کی پیروی سے۔

اس کے بعد مسلمان مکہ میں داخل ہوئے انہوں نے اُسے بزور شمشیر فتح کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے کعبہ میں تشریف لے گئے انہوں نے وہاں کے بتوں کو جو اس کے اندر اور گرداگرد وباہر کی جانب رکھے ہوئے تھے توڑ دیا اور خانہ کعبہ کی دیوار سے نبیوں کی تصویروں کو مٹا دیا جنکو کفار عرب نے فرشتوں وغیرہ کی تصویروں سے موسوم کر رکھا تھا اس طرح جزیرۂ عرب میں بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا اور خانہ کعبہ بتخانہ سے مسجد بنگیا جسمیں خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہونے لگی۔ تمام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ جنمیں ابوسفیان اور اس کے بیٹے بھی شامل تھے۔ اور منجملہ اولاد ابوسفیان کے ایک شخص معاویہ بھی تھے۔ جنہوں نے بعد میں حکومت بنو اُمیہ کی بنیاد قائم کی۔

مولفتہ القلوب

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان اشراف مکہ کا جو اسلامی فتح کے بعد ایمان لائے مولفہ یا (مولفتہ القلوب) نام رکھا۔ جس سے اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ انکے دل خوش رکھکر انہیں اپنے ساتھ ملایا جاوے اور اس فریعہ سے ان کی قوم سے بھی میل ملاپ پیدا کر کے اسلام کی عزت وعظمت میں قوت پیدا کیجائے۔ سیرۃ حلبیہ میں لکھا ہے کہ مولفتہ القلوب کی تین قسمیں تھیں۔ ایک قسم تو وہ جن کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے محض اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے خوش کیا تھا مثلاً صفوان بن اُمیہ دوسرے وہ لوگ تھے جنہیں اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لئے ان کی تالیف قلوب کیگئی تھی جنمیں سے ایک ابوسفیان تھے اور تیسری قسم میں ایسے لوگ تھے۔ جنکی شرارت دور کرنے کیغرض سے انکی خاطر مدارات کیجاتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ جو داد و دہش سے سلوک کرتے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا عطائے مال میں ان کو تمام صحابہ سے امتیاز دیتے تھے۔ اس حکمت عملی میں جو راز حسن انتظام اور تحمل و کشادہ دلی کے متعلق مخفی ہے وہ اہل نظر خود سمجھ سکتے ہیں۔

فتح مکہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قرب وجوار کے مقامات کو چھوٹی چھوٹی فوجی جماعتیں روانہ کیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو اسلام کی جانب بلائیں اور اسکے بعد حنین اور طائف پر فوجکشی کی لیکن نبی صلعم کے اسدفعہ طائف میں داخل ہونے اور آغاز زمانہ دعوت کی تشریف بری میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کیونکہ ان دونوں آپ ان لوگوں کے پاس مدد کے خواہاں بنکر گئے تھے اور اب فاتح کی حیثیت سے پہنچے۔ غرضکہ نبی صلعم نے انکو زیر کر کے بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا جسکی مقدار (۲۴۰۰۰) اونٹ (۴۰۰۰۰) بکریاں اور بہت سی اور چار ہزار اوقیہ خالص چاندی تھی۔ جس وقت انہوں نے اس مال غنیمت کو اپنے اصحاب میں تقسیم کرنا چاہا تو پہلے مولفتہ القلوب لوگوں سے تقسیم شروع کی۔ ابوسفیان کو سو اونٹ اسکے بیٹے معاویہ کو سو اونٹ اور یزید بن ابی سفیان کو بھی سو

اونٹ دیئے، اسکے علاوہ انہیں چاندی کی بھی معتدبہ مقدار عنایت کی، اسطرح پر ابوسفیان نے معہ اپنے بیٹوں کے تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی حاصل کی۔ اس عطا کو دیکھ کر ابوسفیان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگے "یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں لاریب آپ جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں صاحب کرم ہیں" ایسا ہی برتاؤ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام اشراف قریش کے ساتھ کیا مثلاً مشہور ابی جہل کے بھائی حارث بن ہشام اور صفوان بن اُمیہ وغیرہ۔ مہاجرین و انصار کو یہ بات ناگوار گذری کیونکہ وہ لوگ اسلام کے رکن اور سابق الاسلام تھے اسلئے وہ کیونکر چھوڑ دیئے جاتے اور مال غنیمت خوشی سے ان لوگوں کا حصہ ہوئے دیتے جو محض مجبوری کے عالم میں مبتلا ہو کر اسلام لائے تھے، صحابہ نے آپس میں اس بات کی شکایت کرتے ہوئے کہا (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) قریش والوں کو کیوں عطا فرماتے ہیں اور ہمیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ ابھی تک ہماری تلواروں سے ان کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔" پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اس گفتگو کی خبر ہو گئی اور آپ نے اصحاب کو جمع کر کے اُن سے دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا تذکرہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے نبی صلعم سے اپنی گفتگو کا اقرار کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو صحیح تسلیم کر لیا، لیکن ساتھ ہی اُن سے یہ بھی کہا بیشک میں ایسے لوگوں کو عطا کرتا ہوں جو چند روز ہوئے مسلمان ہوئے ہیں اور انکے کفر کا زمانہ بہت ہی قریب گزرا ہے، میں ان کی دلجوئی اور خاطرداری کرتا ہوں تاکہ ان کا اسلام اچھا ہو جائے اور ان کے سوا اور لوگ بھی ان کی پیروی کر کے اسلام لے آئیں، رہے تم لوگ سو میں نے تمہارا معاملہ تمہارے اس ثابت قدم اسلام پر چھوڑ دیا ہے جو ذرا بھی تزلزل میں نہیں آ سکتا، اے انصاری لوگو! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ اور لوگ تو اونٹ اور بکریاں لے لیکے چلے جائیں اور تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے لوگوں میں پہنچو؟" اور ایسی ہی باتیں مہاجرین کو بھی فرمائیں جن سے وہ سب راضی ہو گئے۔

اس کے بعد تقریباً ۹ ہجری میں یہ لوگ (فاتحان مکہ و طائف) مدینہ میں واپس آ گئے، اب انکی شان و شوکت بہت قوی ہو گئی تھی اور ان کے زور و طاقت کی خبر تمام ملک عرب میں مشہور ہو چکی تھی جسکی وجہ سے لوگ خود بخود گروہ در گروہ آتے اور مدینہ میں پہنچکر داخل اسلام ہوتے تھے۔

جس وقت مسلمانوں کی عزت و عظمت بہت بڑھ گئی اور تقریباً تمام جزیرہ عرب ان کے زیر حکم آ چکا تو انھوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ بھی وسیع کرنا چاہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روم والوں پر دوبارہ فوج کشی کرنے کیلئے دستی افواج کا حکم دیا اور بہت جلد تیس ہزار کا بھاری لشکر جمع ہو گیا جسمیں دس ہزار سوار تھے مسلمانوں نے اس وقت

تک جسقدر حملے کئے تھے ان میں یہ سب سے بڑا لشکر تھا انہوں نے اپنی قوت کے موافق اس فوجکی تیاری میں بہت کچھ مال بھی صرف کیا اور جسقدر زیادہ آدمی بہم پہنچ سکے جمع کئے گئے مگر راہ میں انہیں پیاس سے بہت تکلیف اٹھانی پڑی وہ شام اور مدینہ کے مابین ایک بستی میں رک گئے جس کا نام تبوک تھا اور ان کا خیال تھا کہ رومی لوگ مع لخم وجذام کے عربوں کے اسی مقام پر آکر مجتمع ہونگے۔ اسی مقام پر ایلہ[1] کا حاکم ان کے پاس آیا اور جزیہ دے کر صلح کا عہد کیا۔ اسی چڑہائی کی حالت میں خالد بن الولید رض نے مدینہ اور دمشق کے مابین دمشق سے کوئی سات منزل کے فاصلہ پر دومۃ الجندل کے حاکم پر حملہ کیا یہ حاکم عربی النسل تھا اور نصرانی مذہب کا پیرو اور یہ خاندان کندہ میں سے تھا۔ خالد رض نے اسے گرفتار کرلیا اور اس کے بھائی کو قتل کر ڈالا انہوں نے اس حاکم سے ایک قبائے دیباج پر سنہری کام کیا ہوا تھا حاصل کر کے اسے مسلمانوں کے پاس بھیجا جسکو دیکھکر مسلمانوں نے بہت تعجب ظاہر کیا اس لئے کہ ایسے عمدہ اور فاخرہ کپڑوں کے دیکھنے کا انکو یہ پہلا موقعہ ملا تھا اتنی کارروائی کے بعد یہ اسلامی لشکر مدینہ کو واپس آگیا اور اسنے ممالک روم میں سے کسی کو فتح نہیں کیا۔

سنہ ۱۱ھ میں صاحب شریعت اسلامی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وفات پائی۔ اسوقت تک اسلام بالکل کم سنی کے عالم میں تھا اس لئے جن لوگوں کے اثر اور عظمت میں اسلام نے کمزوری پیدا کردی تھی یا ان کی ذاتی اغراض کے حاصل ہونے میں سد راہ بنگیا تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی جگہہ پر سر اٹھانے کی کوشش شروع کردی عرب کے بہت سے قبیلے اسلام سے پھر گئے۔ بس صرف مدینہ، مکہ، اور طائف کے رہنے والے سچے مسلمان رہے اور اس امر کی وجہ سے اسلام نہایت خطرناک حالت میں گرفتار ہوگیا۔ اگر ابوبکر رض ان کی خبر نہ لیتے جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا تو غالبا وہ نیست ونابود ہو جاتا۔

خلفائے راشدین

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے حیات میں مسلمانوں کے فرمانروا، جنگ میں سپہ سالار، نماز میں امام، اور تمام دوسری حالتوں میں ان کے قاضی تھے۔ جسوقت انہوں نے رحلت فرمائی اور کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی نہ کسی کیلئے

[1] ایلہ خلیج عقبہ کے سرے پر ملک شام کے قریب بحر قلزم پر ایک شہر ہے۔

بعد میں اپنا جانشین بنائے جانے کی وصیت کی تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ انکا جانشین کون ہو؟ ظاہر یہ تھا کہ ان کی خلافت کے لئے تمام لوگوں سے بہتر اور برتر ان کے اصحاب تھے جنکی دو قسمیں تھیں۔ مہاجرین اور انصار۔ مہاجرین نے کہا کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مند اور ان کے ساتھی ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ دینے میں اپنے وطن اور گھر کو چھوڑ کر اور عزیزوں یاروں سے بے تعلق ہو رہے ہیں۔ اور انصار کہتے تھے۔ کہ نہیں ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں اسلئے کہ ہمنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں پناہ دی اور ان کی مدد میں اپنی جانیں فدا کیں۔ ان دونوں فریقوں میں جھگڑا اسقدر طول کھینچ گیا۔ کہ باتوں باتوں سے ہاتھا پائی کی نوبت آجانیکا یقین ہو چلا تھا۔ ابو بکر رضؓ نے اس سے ایک ایسی حدیث بیان کی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا تھا اور وہ حدیث یہ تھی۔ "کہ حکومت کے مالک قریش ہیں" اس حدیث کو سن کر سبھوں نے سر تسلیم خم کر لیا۔ اور انصار بالکل خموش ہو گئے۔

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن اسلام کو اب ایک سخت خطرہ کا سامنا تھا کیونکہ مہاجرین میں بھی اس عظیم الشان منصب کے لئے کسی شخص کو انتخاب کرنیکی بابت بہت کچھ اختلاف پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے ایک سر برآوردہ فرد عمر بن الخطاب نے اس اختلاف کے خطر کو محسوس کر لیا اور انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام صرف اتحاد کی بدولت اور اسی کے استحکام کیلئے قائم ہوا ہے لہذا انہوں نے بہت تیزی کیساتھ ابی بکر رضؓ کیجانب بڑھ کر انسے بیعت کر لی۔ دوسرے لوگ اس تماشہ ہی کو دیکھتے رہے اور انہیں عمر رضؓ کی قوت اور جراءت سے یہ خوف بھی تھا کہ انہیں خود ہی طالب بیعت اور خلافت کے دعویدار نہ بن بیٹھیں۔ مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ابو بکر رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے عمرؓ سب سے پہل کر گئے تو سبھوں نے ابو بکر رضؓ سے بیعت کر لی اور تمام مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔

اب یہ خیال کرنا ایک غور طلب امر ہے کہ انہوں نے اور بہت سے مہاجرین کے ہوتے ہوئے جنمیں عباس رضؓ بن عبد المطلب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور علی بن ابی طالب ان کے چچا زاد بھائی اور دوسرے ہاشمی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کنبے والے موجود تھے۔ تو ابو بکر رضؓ ہی سے کیوں بیعت کی؟ عمر بن الخطاب وغیرہ کے اقوال سے جو انہوں نے مختلف موقعوں پر کہے ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بنی ہاشم کو عزت نبوت سے سرفراز دیکھا اسلئے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہی میں سے تھے۔ لہذا انہوں نے یہ پسند نہ کیا کہ عزت نبوت پر خلافت کا بھی اضافہ کریں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنیکے لحاظ سے ایسا کیا ہو کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ نے ایکبار ان سے کسی مقام کے عامل بنائے جانے کی استدعا کی تھی تو پیغمبر صاحب نے

انکار کر دیا تھا، اور خود بنو ہاشم نے اس خیال کو صاف صاف ظاہر کیا ہے جن کے پیشوا امام حسنؓ بن علیؓ ہیں جبکہ وہ معاویہؓ کے مقابلہ میں خلافت سے دست بردار ہوئے اور خلافت معاویہؓ کے سپرد کی تو فرمایا۔ کہ خدا ہی کو یہ منظور نہیں کہ ہم (اہلبیت نبوت) میں نبوت اور خلافت دونوں باتوں کو جمع فرمائے۔

علاوہ بنو ہاشم کے اور مہاجرین مثلاً عمرؓ، عثمانؓ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ وغیرہ کے ہوتے جس امر نے ابوبکرؓ کے منتخب ہو جانے میں مدد دی وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے سابق الاسلام ہونے کو ملحوظ رکھا اور ابوبکرؓ مردوں میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے تھے۔ اور نیز اس مقام پر ایک اور مہتم بالشان سبب یہی ہے جبکا اہل عرب زمانہ جاہلیت سے لحاظ کرتے آئے تھے اور وہ سبب عمر کی بڑائی ہے۔ شیخ کا لفظ بھی انکے محاورہ میں شیخوخت (بزرگی) کے ساتھ ہی سرداری پر بھی دلالت کرتا ہے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جن باتوں کو سرداری و افسری کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اگر وہ سب اوصاف کئی شخصوں میں برابر ہوتے تو اس شخص کو سردار بناتے جو ان سب میں مسن ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی باعتبار ادب کے بھی اس کے مرتبہ کا لحاظ کرتے تھے۔ حرب فجار ثانی میں بھی قریش نے یہی کیا تھا انہوں نے اپنے تمام گھرانے کو یکجا کیا اور ہر گھرانے کا ایک سردار تھا جن سب پر افسر اعلیٰ حرب بن امیہ کو مقرر کیا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے تمام لوگوں پر حرب بن امیہ کو عام حاکم بنایا تھا۔ کیونکہ عبد مناف کے خاندان میں سن اور عزت دونوں کے اعتبار سے وہ بہت معزز تھا اسی طرح ابوبکرؓ نے بھی سن اور وجاہت کے لحاظ سے تمام قریش پر امتیاز حاصل کیا تھا، اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ امر تھا کہ جب نبی (علیہ السلام) بیمار ہوئے تو آپ نے ابوبکرؓ کو مسلمانوں کی نماز پڑھانے پر اپنا قائم مقام بنایا تھا اور یہ منصب امامت کے حقوق میں سے تھا۔

ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ جو انہوں نے بیعت خلافت لینے کے بعد پڑھا ہے اسلام کی حقیقت اصلی کی تصویر کھینچ رہا ہے اور اس راز کو عیاں کرتا ہے جس کے سبب سے اسلام نے اتنی تیزی کیساتھ محیط زمین پر اپنا سایہ پھیلا دیا۔ وہ خطبہ یہ ہے "اے لوگو! میں تمہارا والی مقرر کیا گیا ہوں اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ میں تم سے بہتر نہیں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر بدی کا مرتکب ہوں تو مجھے ٹھیک بناؤ صدق امانت ہے اور کذب خیانت، تم میں کا زوردار میرے نزدیک اسوقت تک کمزور ہے جبتک کہ میں اس سے حق کو حاصل نہ کر لوں، اور تمہارے گروہ کا کمزور شخص اسوقت تک میری نظر میں زوردار ہے جبتک کہ میں انشاء اللہ تعالیٰ اسکا حق اسے نہ دلادوں، تم میں سے کوئی شخص کوشش (جہاد) کو نہ ترک کرے کیونکہ

جو قوم اس کو چھوڑ دیتی ہے خداوند کریم اسکو ذلت میں مبتلا فرماتا ہے جبتک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میرے مطیع رہو اور جو وقت میں اس امر سے باہر ہو کر نافرمانی کروں تو پھر بھی میری اطاعت واجب نہیں۔

ابو بکر رضہ نے زمام خلافت ایسے وقت اپنے ہاتھ میں لی تھی جبکہ اسلام نہایت بے چینی اور خطرہ کی حالت میں مبتلا تھا۔ اس اضطراب کی وجہ وہی ردۃ تھی جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس ارتداد کے اسباب میں یہ امر بھی شامل تھا کہ بعض قبیلے بظاہر اسلام کے مطیع تو ہو چکے تھے۔ لیکن اسلام نے ان کے دلوں اور خیالات پر پورا قابو نہیں پایا تھا۔ جو وقت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوا انکے دماغ میں یہ ہوا سمائی کہ نبوت کا دعوے کر لینا بہت آسان امر ہے انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ ہم بذات خاص اسکا دعوے کرنے کیساتھ ہی اپنے قبائل سے امداد حاصل کر لیں گے۔ جن کے لوگ شمار میں قبیلہ قریش سے کہیں زیادہ ہیں اسلیئے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تھوڑے سے قریشی تمام جزیرہ عرب پر سرداری کریں۔ یہ وجہ تھی جس سے کئی آدمیوں نے نبوت کا باطل دعوے کر دیا جنمیں بنی اسد میں طلیحہ بن خویلد الاسدی۔ بنی تمیم میں سے سجاح اور یمامہ کے باشندوں بنی حنیفہ میں سے مسیلمہ وغیرہ کئی شخص تھے۔ اور ہر شخص نے اپنے قبیلہ اور مددگاروں سے امداد حاصل کی تھی اسوجہ سے عرب کے تمام قبائل میں کچھ ایسی کھلبلی پڑ گئی تھی کہ توبہ بھلی۔ بعض تو انہیں سے ان دعویداروں کے پیرو بنگئے تھے اور کچھ ایسے تھے جو صرف زکواۃ دینے سے باز رہے حالانکہ زکواۃ اسلام کے ابتدائی ارکان میں شامل ہے اسکی حالت بعینہٖ ایسی ہے جیسے سلطنتوں میں مال کا صیغہ۔ اور یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہر وقت ہر طرح سلطنتوں کے قیام کیلئے مال کا ہونا ضرور ہوتا ہے۔ اور بعض عرب یہ خیال زکواۃ کے ادا کرنے سے رک گئے کہ انہوں نے اسے تاوان کی قسم سے سمجھا جو وہ جاہلیت کے زمانہ میں ادا کیا کرتے تھے۔

ردۃ کا معاملہ اسقدر سخت ہو گیا اور مرتد لوگوں نے اتنا زور پکڑا کہ انہیں سے بعضوں نے خود مدینہ پر چڑھائی کرنیکا قصد کرکے اسپر حملہ کر ہی دیا۔ ان دنوں مدینہ مسلمانوں کا پائے تخت تھا اور قریب تھا کہ یہ حملہ آور اسے فتح کر لیں۔ لیکن ابو بکر رضہ نے نہایت مردانگی کے ساتھ ان کی مدافعت کی اور انہوں نے مرتد لوگوں سے جنگ کرنمیں ایک تجربہ کار عقلمند اور دور اندیش شخص کی طرح کام کیا۔ انکے ماتحت کئی ایک چیدہ چیدہ فوجی افسر اور دانا آدمی تھے۔ جنکے لئے ابو بکر رضہ نے کئی ایک علیحدہ علیحدہ فوجی نشان بنا کر انکے حوالے کیئے ان فوجی نشانات کی تعداد گیارہ تھی جو اتنے ہی افسروں کیلئے بنائے گئے تھے اور منجملہ ان لوگوں کے خالد بن الولید۔ عکرمہ بن ابی جہل

اور عمرو بن العاص بھی تھے۔

ابوبکرؓ کی خلافت کو پورے دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا اور تمام شورشیں فرو ہو گئیں۔ لوگ پھر اسی طرح امن کی زندگی بسر کرنے لگے جیسی کہ ان فسادوں سے قبل گزار رہے تھے۔ ان جھگڑوں سے فراغت پا کر ابوبکرؓ نے اپنی توجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے لحاظ سے شام و عراق کی جانب منعطف کی اور ان ملکوں پر فوجیں بھیجیں جنکی وجہ سے ۱۳ھ کا مشہور واقعہ "یرموک" پیش آیا جو بعد میں ملک شام کی فتح کا سبب بنا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ویسی ہی قوت حاصل ہوئی جیسی کہ ابتداء اسلام میں بدر کبریٰ کے واقعہ سے ہوئی تھی۔

اسی ۱۳ھ میں ابوبکرؓ نے وفات پائی، وہ انتقال سے قبل عمرؓ کیواسطے خلافت کی وصیت کر گئے تھے۔ جو کہ ابوبکرؓ کے بعد عمر میں تمام مہاجرین سے بڑے تھے۔ عمرؓ کے زمانہ خلافت میں شام، عراق، مصر، اور افریقہ وغیرہ ممالک میں بہت بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں۔

اسلامی فتوحات

آغاز اسلام میں

ابتدائے اسلام میں عربوں کی سادہ زندگی، فنون حرب و ضرب سے ناواقفیت، سامان جنگ کی غیر موجودگی اور تنگدستی کے علاوہ ان کی اتنی تھوڑی تعداد نے جو قیصر روم و کسریٰ فارس کی صرف ایک شہر کی محافظ فوج سے بھی زیادہ نہ تھی، قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کر لیا، اور اس زمانہ کی ان دونوں عظیم الشان حکومتوں کا قلع قمع کر دیا، اس کے اسباب میں مورخین و مصنفین اور روایتوں کی چھان بین کرنیوالوں نے بہت کچھ اختلاف آراء کیا ہے اور بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ معاملہ ہے بھی غور طلب، کیونکہ عرب والوں کی بے سروسامانی کے مقابل سلطنتہائے روم و فارس کا سازوسامان جنگ پایۂ کمال تک پہنچا ہوا تھا، جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ فوجوں کی کثرت، مال و دولت کی افراط، سلاح

اور سامان جنگ کی فراوانی، رسد خانوں و قلعوں کی کثرت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ کہ عرب باہر حملہ کرنے آئے تو ایسے ملک میں داخل ہوئے کہ نہ وہاں کے رستوں اور حالات سے واقف تھے اور نہ وہاں کوئی انکا کوئی معین مددگار تھا۔ اور رومی وفارسی مدافعانہ پہلو اختیار کئے ہوئے تھے جس میں بعض بھی تھوڑے سے آدمی بہتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور سب باتوں سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ عربوں نے صرف چودہ پندرہ برس کی قلیل مدت میں ان دونوں سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا اور انہیں فتح کر لیا اس لئے سوال ہوتا ہے کہ آخر ان کو یہ بات کیونکر حاصل ہو گئی

اس بارہ میں محقق لوگوں کا سب سے زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ عرب والوں کو ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے فتح کرنیکا موقعہ صرف اسی وجہ سے مل گیا کہ اسلام کے پیشتر سے یہ دونوں حکومتیں باہمی جنگ بیکار کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر نہایت کمزور اور خستہ حال ہو گئی تھیں، جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک فصل میں بیان بھی کر چکے ہیں، مگر ہماری ذاتی رائے میں محض حریفوں کی یہ کمزوری ہی عربوں کی کامیابی کا باعث نہ تھی ورنہ انہیں دونوں سلطنتوں میں سے کوئی ایک اپنی مخالف حکومت پر بدرجہ اولیٰ غالب ہونی چاہیے تھی یہ نہیں کہ ایک چھوٹی سی قوم ملک عرب کے بیہڑ میدانوں سے اٹھکر آئے اور دونوں سلطنتوں پر تصرف کر لے؟ گو ہم یہ مانتے ہیں کہ رومیوں اور فارسیوں کی کمزوری کو بھی اسلامی فتوحات میں دخل ضرور تھا مگر ایک یہی امر اسکی علت نہ تھا بلکہ اور بھی بہت سے اسباب تھے جن کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

عربوں کو کس چیز نے فتح ممالک پر جری بنایا؟

سب سے پہلے ہم کو ان اسباب سے بحث کرنی چاہیے جنہوں نے اہل عرب کو باوجود انکے جنگلی اور وحشی قوم ہونے کے ایسی شاندار اور قوی حکومتوں پر حملہ کرنیکی جرأت دلائی، حالانکہ وہ جنگلوں کے رہنے والے اور وحشی تھے، کئی صدیاں گزر چکی تھیں کہ وہ ان دونوں سلطنتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور انکے زور و قوت سے ڈرتے رہنے کے عادی ہو گئے تھے، اور ان کی وسعت ملک ان کے ہاں ضرب المثل تھی لہذا یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ ایسے لوگوں میں کا ایک مختصر سا گروہ جسکی تعداد چند ہزار سے زائد نہو ان دونوں سے بھڑ جانے کیلئے آمادہ ہونیکی جرأت کر لے، خصوصاً اس صورت میں کہ نہ تو ان لوگوں کے بدن پر سوا موٹے جھوٹے کپڑوں کے کوئی جنگی لباس ہو اور نہ جو جوار سے بڑھ کر انہیں کوئی غذا میسر، ہتھیاروں کی یہ حالت کہ ٹوٹے پھوٹے نیزے جابجا سے بندھے ہوئے ہاتھوں میں تھے، تلواریں بجائے پرتلوں میں لگی ہونے کے چیتھڑوں میں باندھ کر حمائل کی ہوئی، پھر اگر انہیں اسکی جرأت بھی ہوئی تو اسلام سے پہلے انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟

اس وقت انہیں کیا ہو گیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہوگا کہ اسلام کے بعد عرب وہ عرب ہی نہ رہے تھے جو قبل از اسلام تھے انکی بالکل کایا پلٹ گئی تھی۔ پہلے تو وہ جدا جدا اور منتشر قبیلے تھے ادھر ایکدوسرے سے بیگانہ تھا، مگر اسلام کے بعد وہ ایک قوم اور ایک دل ہو گئے، یہ بات بھی اکیلی انکے اتنے بڑے کام پر قدم بڑھانے کیلئے کافی نہیں ہو سکتی۔ البتہ جو امر کہ اسقدر جرات پیدا کر دینے کا موجب بن سکا وہ انکا یہ اعتقاد تھا کہ جس چیز کی جانب ان کو بلایا گیا ہے یعنی دین اسلام وہ واقعی حق اور راست ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ وہ دنیا کو دین کے لئے فتح کرتے ہیں، اور خداوند پاک انہیں روئے زمین پر اسلام کے پھیلانے کا حکم دیتا ہے انمیں سے جو شخص اس کوشش میں مارا گیا وہ شہید ہوگا۔ اور آئندہ عالم کی نعمتیں عالم ہستی کی نعمتوں سے عمدہ اور دیرپا ہیں۔ یہی عقیدہ تھا جسنے عرب والوں کو انہی بڑے اور سخت کام میں ہاتھ ڈالنے پر دلیر بنا دیا تھا اور اسمیں بھی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے حملوں اور لڑائیوں میں نبی صلعم کے زمانہ میں فتحمندی کا جو مزہ چکھا تھا اُسنے بھی ان کو اس خیال پر جمے رہنے میں مدد دی انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اُسے کسی کام میں نفع حاصل ہوتا ہے یا کوئی تجارت اُسے سودمند ثابت ہو جاتی ہے تو اس کام یا تجارت کے ترقی دینے میں اسے اپنے تمام سرمایہ کا بھی لگا دینا گراں نہیں گذرتا۔

اسلامی اتحاد کا جلوہ اُن کے تمام کاروبار میں نظر آتا ہے جسکے شواہد میں سے ایک وہ بھی ہے جو ہمنے اسکے اقرار باہمی اور بھائی چارہ کے برتاؤ سے متعلق پہلے بیان کیا ہے۔ نیز ہمارے اس دعوے کی یوں بھی تائید ہوتی ہے کہ اسلام توحید کا عنوان ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کے ملاحظہ سے عیاں ہوتا ہے اور صدر اسلام میں خلفاء اور امراء اسلام کا کوئی خطبہ اس وحدۃ (ایکے) کی جانب اشارہ کرنے اور مسلمانوں کو اس جدائی اور بیگانگی کے یاد دلانے سے خالی نہیں ملتا، جس پر اُن کے باپ دادا زمانہ جاہلیت میں عامل تھے اور ساتھ ہی وہ خطبے ان مفید امور سے بھرے ہوئے ملتے ہیں جنکی جانب اسلام نے لوگوں کو بلا کر انہیں باہمی تعصب کے ترک اور یکدل رہنے کی تاکید کی ہے۔ اسپر پانچ مرتبہ ایک دن میں امام یا اسکے نائب کے پیچھے جمع ہونیکی تاکید نے اُنکے اس اتفاق کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے اس امر میں اتحاد تعلقات کے قوت پانے اور اطاعت پر یکدل ہونیکا جو فائدہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ بلاذری نے بیان کیا ہے کہ فتح مکہ ہونے سے پہلے جب ابوسفیان مسلمانوں کے پاس آئے اور وہ اسوقت تک مسلمان نہوئے تھے تو انہوں نے مسلمانوں کو نماز میں کھڑے دیکھا جب نبی صلعم رکوع کرتے تو وہ سب جھک جاتے اور جب آپ سجدہ فرماتے سب سجدہ میں آجاتے، ابوسفیان نے یہ حالت دیکھ کر

کہا "خدا جانتا ہے کہ میں نے آجتک کسی طرح کبھی کسی ایسی قوم کی فرمانبرداری نہیں دیکھی جو ادہر اُدہر سے آکر جمع ہو گئی ہو اور معزز فارسیوں اور پُرہیبت رومیوں میں ایسی اطاعت گذاری کا نمونہ دیکھا ہے"

باقی رہا یہ امر کہ عرب دعوت اسلام کی راستی کیونکر مانتے تھے اور ان کا یہ خیال کس طرح تھا کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں دنیا کے لئے نہیں کرتے بلکہ آخرت کے لئے، سو یہ بات اثناء فتوحات میں اُن کے ہر ایک قول و فعل سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً مغیرہ بن شعبہ کا جواب جبکہ فارس کے سپہ سالار رستم نے قادسیہ کی جنگ میں اُن سے کہا تھا کہ "بیشک تم اپنی مطلوبہ شے کی کوشش میں جانیں دیتے ہو" مغیرہ رضہ نے کہا "ہم میں سے جو قتل ہوتا ہے وہ جنت میں داخل ہوگا اور تم میں سے جو مریگا وہ جہنم واصل، اسکے بعد جو لوگ ہم میں سے باقی رہ جائیں گے وہ تمہارے باقیماندہ لوگوں پر فتح پائیں گے" اور عبادہ ابن الصامت رضہ کی وہ گفتگو جو مقوقس مصر سے ہوئی تھی جبکہ مقوقس نے انہیں رومی فوجی قوت کا خوف دلا کر ان سے کہا تھا کہ تم کبھی ان کا مقابلہ نہ کرسکو گے۔ اس کے جواب میں عبادہ رضہ نے کہا "اے شخص تو اور تیرے ساتھی ہرگز اپنے دل میں کچھ گھمنڈ نہ کریں تو جو ہمیں رومیوں کی جماعت اور کثرت سے دھمکاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم ان پر فتح نہ پائینگے، میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بات ہم کو ڈرانیوالی نہیں ہے اور نہ ہمارے اس مصمم ارادہ کو توڑ سکتی ہے جس پر ہم کمر بستہ ہیں، اور اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو واللہ اُن سے جنگ کرنے میں جو چیز ہم کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ یہی ہے اور اب ہماری حرص ان پر بہت زیادہ ہوگئی ہے کیونکہ یہ صورت ہمارے واسطے ہمارے خدا تعالے کے روبرو بہت بڑی عذر خواہی کی وجہ ہوسکتی ہے جبکہ ہم اسکے حضور میں حاضر کئے جائینگے اگر ہم ایک سرے سے قتل کر ڈالے جائیں تو بلا خطرہ اس خلاق عالم کی رضامندی حاصل کرکے اسکی جنت میں داخل ہو جائیں گے، اس سے بڑھ کر تو ہم کو کوئی چیز پسند اور مرغوب ہی نہیں بحالت موجودہ تمہارے ساتھ ہمارا تعلق ایسا ہے جسکا نتیجہ ہمارے لئے دو میں سے ایک بہتری ضرور ہوگا یعنے اگر ہمنے تم پر فتح پائی تو عظیم الشان دنیاوی غنیمت ہمارے ہاتھ آئیگی، اور یا جبکہ تمنے ہم پر غلبہ پا لیا تو ہم غنیمت آخرت سے بہرہ یاب ہونگے، اور خوب سمجھ رکھو کہ ہماری طرف سے اجتہاد (کوشش) ہو چکنے کے بعد جو بات ان دونوں سے ہم کو زیادہ مرغوب ہے وہ یہی آخری امر ہے، اور خدائے پاک و بے نیاز نے ہمسے اپنی کتاب میں یوں خطاب فرمایا ہے کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ واللہ مع الصابرین" (یعنی کتنی ہی دفعہ گروہ قلیل بحکم خدا گروہ کثیر پر غالب آجاتا ہے اور اللہ صبر والوں کا ساتھی ہے) ہمارے گروہ میں ہر شخص صبح و شام اپنے پروردگار کے روبرو بالحاح تمام یہی دعا مانگا کرتا ہے کہ بار خدایا مجھے شہادت نصیب فرما، اور مجھ کو

اپنے ملک و وطن اور بال بچوں کی طرف زندہ واپس نہ لیجا۔ اور ہم میں سے کسی کو اپنے پسماندوں کا غم نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص نے اپنے بال بچوں اور مال و متاع کو اپنے خدا کی سپرد کر رکھا ہے البتہ ہم کو فکر ہے تو اسبات کی جواب ہمارے سامنے ہے (یعنے کفار سے جنگ)۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہم لوگ بسر اوقات کے سامان میں تنگدست اور بے برگ و ساز ہیں تو یہ خیال اپنے دل سے دور کر دو۔ کیونکہ ہم بحد فراغت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایسے خوشحال ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں اگر ساری دنیا بھی ہماری ملک ہو جائیگی تو ہم اپنی ذات خاص کے لئے کبھی اس سے زائد نہ چاہیں گے جتنا کہ اب ہمارے لئے ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں یہانتک کہ ایک مسلمان شخص خود اپنے باپ اور بھائی سے جبکہ وہ دونوں مشرک ہوتے لڑتا تھا اور اسے اچھا سمجھتا تھا۔ اور دوسرے مذاہب کی تاریخیں دیکھنے سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ انسان کسی معاملہ کے اندر ہلاکت میں جھکنے اور خطرہ میں ڈالنے پر تیار نہیں ہوتا۔ مگر جبکہ وہ دینی معاملہ ہو جس میں اسے اپنی جان تک کی بالکل پرواہ نہیں رہتی اس کے متعلق خود نصاریٰ کے یہاں عیسوی شہیدوں کے قصے موجود ہیں اور دوسرے مذاہب کی بھی بکثرت اس قسم کی نظیریں ملتی ہیں جو ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی و وافی ہیں۔

مصر، شام، اور عراق کے لینے کی خواہش عرب والوں کو یوں اور بھی بڑھی کہ انہیں ان ممالک کی سبزی اور زرخیزی کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس دینی اٹھان کے بعد جواب انہیں پیدا ہو گیا تھا خود ان کا خشک اور بہیڑ ملک ان کی ضروریات کا ذمہ دار نہ ہو سکتا تھا۔ اور اسلام کے چند ماتحت قبیلے تو محض مال غنیمت ہی کی خاطر لڑتے تھے۔ اس دعوے کی دلیل وہ واقعہ ہو سکتا ہے جو مسلمانوں سے غزوہ حنین اور طائف کے بعد ظہور میں آیا کیونکہ ان لڑائیوں سے فارغ ہونیکے بعد جبکہ بہت سا مال اور بے شمار لوٹ کا سامان جمع ہو گیا تھا اور جنگ کے قیدی واپس کر دیئے گئے تھے اس موقعہ پر جو حالت ہوئی اسے ابن ہشام یہ لکھ کر دکھاتا ہے کہ نبی صلعم سوار ہو کر چلے اور لوگ یہ غل مچاتے ہوئے آپکے پیچھے ہو لئے کہ یا رسول اللہ آپ ہمارا لوٹ کا مال اور اونٹ بکریاں ہم کو تقسیم فرما دیں۔ یہانتک کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درخت کے تلے ٹھہرنے پر مجبور کر دیا اور ان کی چادر تک چھین گئی۔ اسوقت نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو میری چادر واپس دیدو قسم ہے خدا کی اگر میرے پاس درخت تہامہ کے برابر نعمتیں ہوتیں تو میں انہیں بھی تمپر بانٹ دیتا اور پھر بھی تم مجھے بخیل، بزدل، اور دروغگو نہ پاتے۔

فتوحات پر اہل عرب کی مساعدت کس امر نے کی؟

یہاں تک تو اس کا بیان تھا کہ فلاں فلاں وجوہ سے عرب والوں کے دلوں میں ایسی عظیم الشان سلطنتوں کیساتھ جنگ کرنے کی جرأت پیدا ہوئی۔ مگر یہ بتانا باقی ہے کہ ان فتوحات پر ان کی مساعدت کس امر نے کی؟ جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) اُن کی چستی و جفاکشی اور زیادہ ساز و سامان کا پاس نہ رکھنا۔ کیونکہ وہ خانہ بدوش لوگ تھے، اور تکلیف سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہو کر بھوک پیاس کی سختیوں سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔ جب اُنمیں سے کوئی شخص کسی جنگ کے لئے سفر کرتا تو کبھی اپنے ساتھ اسقدر اسباب لیتا جو اسکے کندھوں پر یا اسکے اونٹ پر بار ہو بلکہ بعض حالتوں میں وہ کھانے کا بھی سامان ساتھ نہ لیتے تھے جو کچھ رستہ میں لوٹ مار سے ہاتھ لگتا اسی پر گزارہ کرلیتے تھے۔ عربوں کے غالب آنے میں اونٹ کا بہت کچھ احسان ہے اس لئے کہ وہ اکیلا ان کے یہاں وہی کام دیتا تھا جو رومیوں کے یہاں گاڑیوں گھوڑوں اور دیگر چوپایوں سے نکلتا تھا عرب کا باشندہ اپنی اونٹنی سے اتنے کام لیتا تھا۔ اسپر سوار ہوتا اپنا سامان لادتا۔ اس کے دودھ کو غذا بناتا۔ اور اس کے سایہ میں بیٹھ کر آرام لیتا ان فوائد کے مقابلہ میں اس کی خدمت کچھ نہیں کرنی پڑتی تھی وہ بیچارے جنگل کے گھاس پھوس سے پیٹ پالتے اور کبھی سوکھی گھاس ہی پر بسر کرتے۔ پھر کئی کئی دن تک بھوک اور پیاس کا تحمل کرلیتے تھے۔ بخلاف اسکے رومی یا فارسی اسوقت تک میدان جنگ میں نہ جاسکتا تھا جبتک کہ اس کیساتھ بہت سا بوجھ خیمہ و خرگاہ اور سامان رسد کا نہو جس کے اٹھانے کی طاقت گاڑیوں کے سوا کسی اور کو نہ ہوتی۔ اور گاڑیوں کے کھینچنے کو جانوروں کی ضرورت پڑتی اور جانوروں کو دانہ چارہ اور پانی کی احتیاج دامنگیر رہتی۔ اور ہمیں اسبات کا ذکر اسلیے اور بھی کرنا پڑا کہ ہمنے انگریزوں اور سوڈانی عربوں کی جنگ میں بچشم خود یہ حالت دیکھی ہے ۱۸۸۴ء میں جب وادیے نیل کی مہم گارڈن پاشا کو خرطوم کے محاصرے سے چھڑانے کیلئے روانہ ہوئی ہے اوسوقت کیفیت دیکھی گئی کہ ایک انگریز بھی اسوقت تک اپنے مقام سے جنبش نہ کرتا تھا جبتک کہ اسکے ساتھ ڈبل روٹی، بسکٹ، بھنا ہوا گوشت، شکر، چاء، دودھ، مکھن، اور پانی کی چھاگلیں، خیموں ڈیروں کے گٹھڑ اور سامانوں اور کپڑوں کے بوجھ نہوتے اس کے علاوہ ان کے ساتھ گھوڑوں کا دانہ، چارہ اور دیگر سامان رسد اسقدر ہوتا تھا جس کے اٹھانے کیلئے بہت سے باربردار جانور درکار ہوتے۔

مذکورہ بالا مہم میں آدمی (سپاہی) تو صرف ۷۰۰۰ تھے اور اونٹوں کی تعداد چار ہزار تھی جنکی کیوجہ سے شتر بانوں

اور دوسرے ملازموں کی ایک بھاری تعداد ہمراہ ہو گئی تھی اور یہ حالت جو ہم سر پر بار گراں آتی تھی بر عکس اس کے سوڈانی ان تمام ساز اور سامانوں سے بے پرواہ تھے۔ ان کے پاس ایک تھیلا ہوتا تھا جس میں تھوڑے سے جوار کے دانے پڑے ہوتے تھے وہ اُسے بغل میں دباتا اور جہاں چاہتا چلدیتا تھا۔

(۳) ان کا قضا و قدر پر اعتقاد رکھنا اور یہ ماننا کہ جبتک موت نہ آئے انسان ہر گز نہیں مرتا۔ جب اسکا وقت آجاتا ہے تو فوراً مر جاتا ہے چاہے اپنے بستر استراحت ہی پر کیوں نہ پڑا ہو۔ اور موت نہ آئے تو برستی ہوئی تلواروں کے سایہ میں بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ یہ اعتقاد بہت پختگی کے ساتھ ان کے دلوں میں جما ہوا تھا اور انکے مشہور وقایع میں جو دلیریاں اُن سے ظاہر ہوئی ہیں ان سب کی علت یہی اعتقاد تھا۔

(۳) گھوڑے کی سواری اور تیر اندازی میں ان کا ماہر کامل ہونا۔ ان امور میں وہ رومی اور فارسی دونوں قوموں سے کہیں زیادہ ماہر تھے۔ پھر عرب کے گھوڑے بھی رومیوں اور فارسیوں کے گھوڑوں سے نجیب تر ہوتے تھے۔ اور ان کی زیادہ تر لڑائیوں میں رواج زمانہ کے مطابق ایک ایک دو دو شخصوں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا وہ لوگ تمام فوج میں سے ایک ایک سوار کو چنتے تھے۔ اور وہ میدان میں نکل کر باہم مقابل ہوتے جو غالب آجاتا اسکی طرفدار بازی جیت لیتے۔ اور عرب والے اس طریقہ سے اکثر کامیاب ہی ہوتے تھے نیز بسا اوقات ان کی فتحمندی صرف اس شخص کی کوششوں پر منحصر رہتی تھی جو میدان میں نکل کر غالب رہتا یا کسی ایسے سچے نشانہ باز قدر انداز پر جو ایک ہی تیر میں غنیم کے سپہ سالار کا خاتمہ کر دیتا جس سے اس کی سپاہ منتشر ہو جاتی۔ جس مقام پر ہم جنگی ہتھیاروں کا ذکر کریں گے وہاں اس امر کی تفصیل آئیگی۔

صدر اسلام کی خصوصیت شرائط نصرت کا زیادہ پایا جانا

(۴) اسمیں شک نہیں کہ مذکورہ بالا زمانہ مشہور ذیشان لوگوں کے پیدا کرنیمیں ویسا ہی ممتاز گزرا ہے جیسا کہ نپولین کا زمانہ نامی جنرلوں کے لئے مشہور ہوا ہے کیونکہ وہی ملک فرانس بعد میں اس قسم کے جنگجو سردار پھر نہ پیدا کر سکا۔ زمانہ نپولین اعظم کے جنرل فرنچ بغاوت کے بعد نام آور کیے میدان میں آئے جیسا کہ اسلام کے صدر اول میں نامور لوگ نمایاں ہوئے جبکہ ملک عرب میں واقعہ فیل گزرا اور حبشی لوگوں نے ہاتھیوں اور فیل سواروں کی کثیر تعداد کیساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کیا تھا اس واقعہ نے عربوں کے سکون میں ایک قسم کی حرکت پیدا کر دی۔ اور زمانہ کے انقلابات کیوجہ سے جو صدمات پہنچے انہوں نے اہل عرب کو اپنے شکنجہ میں کس کر انہیں اپنی حالت کے سنبھالنے کا خیال دلا دیا جسکی وجہ سے انکی وہ مخفی قوتیں جو ایک دبی ہوئی اور

پنہاں تھیں ابھر کر آشکار ہو گئیں ایسے سخت حادثے لوگوں میں اکثر ایک اس قسم کا مادۂ ترقی اور جوش پیدا کر دیتے ہیں جس سے پوشیدہ قوتیں اور دبی ہوئی طاقتیں آشکار ہو جاتی اور ابھر آتی ہیں ہمارے اس دعوے پر تاریخ ایک زبردست شاہد ہے، گویا کہ خداوند پاک نے عرب والوں کی قسمت میں قحمندی لکھدی تھی کہ انکو ایسے سرداروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ مختص کیا جو فنون جنگ حسن تدبیر، اور حکمت عملی میں دنیا کے چیدہ چیدہ لوگوں میں شمار ہوتی ہیں۔ مثلاً خالد بن الولیدؓ، خالد بن سعیدؓ، ابی عبیدۃ ابن الجراح، سعد بن ابی وقاصؓ، یزید بن ابی سفیان، حمزہ بن عبد المطلبؓ اور علی بن ابی طالبؓ جیسے لوگ جنہیں دلیری اور سپہ سالاری کا مادہ غالب تھا، اور عمرو بن العاصؓ، معاویہ بن ابی سفیانؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور زیاد بن ابیہ کی مانند مدبر و ہشیار لوگ اور ابوبکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ کی مثل دانا اور متقی اور صاحب ہمت لوگ ان میں پیدا ہوئے۔

اسلام کے تیزی سے کامیاب ہونے میں ان مذکورہ بالا عظیم الشان لوگوں یا ان جیسے اور نامور شخصوں کا وجود میں آنا ایک قوی سبب تھا، اور خود مسلمان اس بات کو بخوبی جانتے تھے یہاں تک کہ آغاز دعوت کے زمانہ میں خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا "خدایا حمزہ بن عبد المطلبؓ کے مسلمان ہونے سے اسلام کی تائید فرما" اور جب حمزہؓ داخل اسلام ہو چکے اور عمرؓ بھی مسلمان ہو لیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "بیشک حمزہؓ اور عمرؓ کے اسلام لانے سے مذہب اسلام کو تائید پہونچی ہے"۔

ابی بکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابن العاصؓ، معاویہؓ، اور خالدؓ جیسے لوگ آج کے دن ظاہر ہوتے تو اس میں کلام نہیں کہ ان کا شمار ان بڑے بڑے لوگوں میں ہوتا، جنکی عظمت کو مہذب دنیا بطور ضرب المثل کے پیش کرتی ہے جیسا کہ یورپ کے لوگ ان دنوں بونا پارٹ، کرامویل، بسمارک، اور گلیڈاسٹن کو ضرب المثل بناتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشخاص ان نامور لوگوں کے علاوہ ہیں جو اموی اور عباسی حکمرانوں کے عہد میں پیدا ہوئے اور شہرت و عظمت کے آسمان پر سر اعظم بن کر چمکے۔

صبر اور درنگ

(۵) جنگ موتہ کے بعد جسمیں اہل عرب کو شکست ہوئی انہیں رومیوں کی قوت و کثرت کا علم و تجربہ ہو گیا تھا، اب وہ اس امر سے آگاہ ہو گئے تھے کہ رومیوں کی لڑائی اور ہے اور جنگلی لوگوں کی جنگ اور، جن سے کہ وہ اپنے ملک میں روز لڑا کرتے، اور انہیں اکیلے دکیلے پر چھاپے مارا کرتے تھے، جو قت انہیں یہ بات ثابت ہو گئی تو انہوں نے اسکے بعد والے زمانہ میں رومیوں سے جنگ کرنیکا طریقہ بدلدیا۔ اب وہ بجائے سرعت کے ساتھ حملہ آور ہونیکے چپکے چپکے لڑتے رہنے اور لڑائی کو طول

دینا سیکھ گئے تھے اور اسی بات پر کاربند رہتے تھے۔ صبر کرنیکی عادت تو انکے لیے بہت ہی آسان کام تھا اسلیئے کہ انکو تھوڑی سی غذا اور موٹے جھوٹے کپڑوں پر اکتفا کرنا پہلے ہی سے آتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے اور جب ان کا سامان ہوچکتا تھا تو وہ لوٹ مار پر جھک کرتے۔ جائے اور گیہوں غیرہ جو کچھ ملجاتا اسی پر بسر اوقات کرلیتے تھے۔

شروع شروع میں جب اہل عرب عراق اور شام کے ملکوں پر بڑھے ہیں تو انکی لڑائیوں کا رنگ ملکی فتوحات کی نسبت چھاپے مارنے اور لوٹ مار کرنے سے زیادہ مشابہ تھا اور اکثر فتوحات میں انکا یہی قاعدہ تھا کہ جس شہر کو فتح کرنیکا ارادہ کرتے اس پر پہلے اپنی فوج کی ایک جماعت کو چھاپے مارنیکے لیے بھیجدیتے اور کبھی بظاہر انکا یہ ارادہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس ملک کو فتح ہی کرینگے۔ اسطرح وہ اس شہر کے گرد قتل وغارت کرتے ہوئے چکر کاٹتے تھے یہانتک کہ انہیں فتح کا موقع ملجاتا تو اسے غنیمت سمجھ کر ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے صدر اسلام اور اسکے مابعد زمانہ میں اپنی بہت سی فتوحات کے اندر ایسا ہی طریقہ برتا۔ کیونکہ جب موسیٰ بن نصیر نے طارق کو ۹۱ھ میں ساحل ہسپانیہ کیجانب روانہ کیا تھا تو اس کی غرض صرف لوٹ کی تھی کچھ فاتحہ کی حیثیت سے نہیں بھیجا تھا مگر حسن اتفاق کہ آخر کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے جنہوں نے فتح ملک میں طارق کی مدد کی یہ اسباب ان سببوں سے ملتے ہوئے تھے جنہوں نے ملک شام کی فتح پر اہل عرب کو کمک پہنچائی تھی۔ اسطرح جب طارق اندلس میں داخل ہوگیا اور جب موسیٰ کو یہ اطلاع ملی تو اسے پہلے تو اس بات کا تعجب ہوا پھر اسے ناگوار گذرا کہ وہ آپ ہی فاتح کیوں نہ ہوا؟ لہذا اسنے حکم امتناعی بھیجکر طارق کو آگے بڑھنے سے روکدیا۔ ان دونوں کے مابین جو واقعہ گزرا وہ ناظرین تاریخ سے مخفی نہیں۔ افریقہ اور اس کے آس پاس کے ملکوں کی فتوحات میں بھی عرب کی یہی حالت رہی ہے۔

عرب والوں کی کمک

(۶) اسلام ابتدائی حالت میں عربوں کی ترقی کا پہلا قدم تھا اور مسلمان خود عرب ہی کے باشندے تھے۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ اکثر حالتوں میں دونوں لفظ مسلمین اور عرب ایک ہی معنوں میں مستعمل ہونے لگے۔ جب لوگ عربوں کا ذکر کرتے تو ان سے مسلمانوں کو مراد لیا کرتے اور اس کے برعکس بھی ہوتا۔ داخل اسلام ہونیکے معاملہ میں بہ نسبت اور قوموں کے اہل عرب قریب تر تھے اسلیئے کہ اسلام پر فخر کرنیمیں جو خصوصیتیں انہیں حاصل ہیں دوسروں کو حاصل نہیں۔ یہ بات بہت مضبوطی کیساتھ لوگوں کے دلونمیں بیٹھ گئی تھی۔ خصوصاً اسوقت اور بھی جبکہ عمرؓ نے جزیرۂ عرب سے غیر مسلم لوگوں کے نکال باہر کرنیکا حکم دیا تھا جس کے بعد تمام مشرکین اور غیر مذاہب کے لوگ جزیرۂ عرب سے جلاوطن ہوگئے اور اب اس جزیرہ میں سوائے مسلمانوں کے کوئی غیر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ اسوقت سے آجتک یہی حالت بدستور قائم ہے۔

مسلمانوں نے شام اور عراق کے شہروں پر ایک ہی دفعہ حملہ نہیں کیا، بلکہ بہت دنوں تک وہ ان ممالک کے قرب و جوار میں جو صحرا لئے عرب سے متصل تھے لوٹ مار کرتے رہنے میں مصروف رہے تھے۔ عراق اور شام کے صحراؤں کے رہنے والے بھی مسلمانوں ہی کی طرح عرب تھے جنمیں حدود ملک شام پر صوبہ حوران کے شہر بصریٰ میں غسانی خاندان کے لوگ فرمانروا تھے، اور عراق کی سرحد پر شہر حیرہ میں منذری گھرانہ حاکم تھا ملک شام میں غسانی لوگ رومیوں کے گورنر تھے، اور عراق میں منذری امرا اہل فارس کے عمال شمار ہوتے تھے۔ اہل عرب یوں تو روم اور فارس والوں سے طبعاً نفرت و عداوت رکھتے تھے، لیکن "زبردست کا ٹھینگا سر پر" کے دباؤ میں پڑ کر ان کے ماتحت بنے ہوئے تھے، خصوصاً منذری گھرانے کے لوگ تو نعمان بن منذر (جسکا لقب "ابو قابوس تھا") کے قتل ہو چکنے کے بعد سے فارس والوں سے خار کھائے ہوئے تھے، نعمان مذکور کو کسریٰ پرویز نے قتل کرا دیا تھا اور اس کے قتل ہونے کے باعث سے فارسیوں اور عرب کے باشندوں میں ایک بہت مشہور جنگ بھی واقعہ ہوئی جو "ذوقار" کے نام سے معروف ہے۔ اس جنگ میں فارس والوں کو بہت بری طرح شکست کھانی پڑی تھی اور یہی سب سے بڑا میدان تھا جس میں عرب والوں نے عجم سے بازی لی، یہ عجیب اتفاق ہوا کہ مذکورہ بالا واقعہ اسی سنہ میں ہوا تھا جس میں "بدر کبریٰ" کا واقعہ ہوا ہے اور دونوں جنگوں میں عرب والے ہی مظفر و منصور رہے۔ منذری خاندان اور فارس کے لوگوں میں اسوقت تک عداوت و مخالفت قائم رہی جبکہ خالد بن الولید نے ان پر فوجکشی کر کے تین باتیں ان کے روبرو پیش کیں "اسلام، یا جزیہ دینا، یا لڑ مرنا" ان لوگوں نے جزیہ دینا منظور کیا اور ایک مقدار مال معین پر جسے ہر سال ادا کرتے رہنے کی شرط کی تھی صلح کر لی، بصریٰ وغیرہ نصاریٰ کے دیگر ممالک میں بھی جو ملک شام کی سرحد میں تھے اور نیز ان مقامات میں جو خطہ عرب میں داخل اور حدود صحرا کے اندر عراق عرب اور ملک شام کے مابین واقع تھے، یہی صورت پیش آئی، مثلاً عین التمر، اور صندوداء ان مقامات میں خاندان کندہ، ایاد، اور قراقر کے لوگ آباد تھے اور یہ جگہ بنی قلب وغیرہ قبائل کے رہنے کی تھی جو بسبب پانی بہتایت ہونیکے یہاں سکونت رکھتے تھے، خالد ابن الولید رضی نے عراق سے ملک شام کو آتے ہوئے ان قبائل سے جنگ کی تھی، جن اسباب کو ہمنے اوپر بیان کیا ہے انکی اور نیز دیگر اسباب کیوجہ سے خاص عرب کے باشندے اسلام کی کمک کے لئے بہ نسبت دیگر قوموں کے زیادہ قریب اور مستعد تھے، اور جو اسباب اس امداد کے محرک ہوئے وہ حسب ذیل تھے، عرب کے ہر ایک قبیلہ کے ساتھ چند باتیں خاص تھیں، مثلاً یمن کے رہنے والے عرب اہل فارس سے خار کھاتے تھے جب سے فارسیوں نے اسلام سے پیشتر ان کے ملک کو فتح کر لینے کے بعد علیحدہ

حکومت کی اور بعد ازاں ان کی سلطنت کا سایۂ عثمانیوں کے سر سے سمٹ کر صرف بحرین پر قائم رہا تھا یمن کے باشندے ان کے دشمن ہو رہے تھے۔ قوم زیع ملک فارس کے ایک صوبہ ممالک جنزیرہ میں سکونت پذیر تھی یہ قوم بھی فارس کے باشندوں کو نقصان پہنچانے میں مسلمانان عرب کی بہت کچھ معاون ہوئی۔

اکثر حالتوں میں مذکورہ بالا عربی قبائل اور ان کے علاوہ ملک شام کے اصلی باشندے بھی محض جزیہ دینے سے بچنے کیلئے رومیوں کے مقابلہ پر مسلمانوں کی جانبداری کرتے تھے جیسا کہ جراجمہ (مردہ) کوہ لکام میں کیا۔ حبیب بن مسلمۃ الفہری نے جب انپر چھاپہ مارا تو وہ جھٹ پٹ امن کے خواہاں ہو گئے اور پھر اس شرط پر صلح کر لی کہ ہم مسلمانوں کے مددگار، ان کے جاسوس، اور کوہ لکام میں رہینگے، مگر یہ بھی کہ ہمسے جزیہ کا مطالبہ نہ کیا جائے..... اس کے علاوہ ان کے شہر میں اور جو لوگ تاجر، اجیر، اور محکوم رعایا کی قسم سے تھے جنہیں بعض نبطی تھے اور بعضے دیگر اقوام سے اور نیز تمام دیہات کے لوگ سب اس صلح میں داخل ہو گئے۔ تھے اور ان کا نام رواد یف رکھا گیا تھا۔ +

پسپا ہونیکا راستہ

(۷) شام اور عراق وغیرہ میں عربوں کی جنگ کا ایک یہی قاعدہ تھا کہ وہ لڑائی چھیڑنے اور حملہ کرنیسے پہلے اپنے پسپا ہونیکا راستہ محفوظ کر لیتے تھے تاکہ صورت کے وقت بھاگنے کا موقع رہے۔ لہذا وہ رومیوں یا فارسیوں سے اسوقت تک نہیں لڑتے تھے جبتک کہ اپنے آپ کو کسی محفوظ احاطہ میں نہ کر لیں۔ اس راہ فرار کی حفاظت انکے لئے ایک نہایت آسان بات تھی کیونکہ وہ جنگلوں اور لق ودق میدانوں کو اپنے پشت لے کر معرکہ آرا ہوا کرتے تھے اور صحرا انکی جائے پناہ تھا۔ جسوقت وہ بھاگتے تھے رومی یا فارسی ان کی گرد کو بھی نہ پا سکتے تھے اور نہ انہیں ان تعاقب کی حاجت معلوم ہوتی تھی۔ جب رومی لوگ اپنے مقام پر واپس آ جاتے تو اہل عرب بھی پھر انکے مقابل آن کر ڈٹتے تھے اسطرح پسپا ہو کر مقابلہ کرتے رہنے سے رومیوں کا ناک میں دم کر دیتے تھے، اور لڑائی کو طول دیکر انکی قوت کو گھٹاتے جاتے تھے۔ خواہ وہ غنیم کے مقابلہ میں کتنے ہی کم ہوں لیکن آخر کار اُسے تباہ کر ڈالتے تھے اس معاملہ میں ان کی بعینہٖ وہی حالت تھی، جو اندنوں ہماری پُرشوکت اور طاقتور گورنمنٹ انگلشیہ کے مقابلہ میں بوئروں کی کیفیت تھی۔ گو وہ بہت تھوڑے تھے لیکن انہوں نے کثیر التعداد انگریزی فوجوں کو دق کر رکھا تھا اور فوجیں بھی ایسی جنکے پاس کسی قسم کے سامان اور آلات حرب کی کمی نہ تھی، نہ وہ بزدل تھیں لیکن بات یہ تھی کہ بوئر لوگوں نے وقتاً فوقتاً موقع دیکھ دیکھ کر حملہ کرتے رہنے اور مار پیٹ کر اپنے مقامات میں جو انہوں نے

دشوار گزار پہاڑوں کے اندر مقرر کر رکہے تھے جا گہسنے سے انگریزی فوجوں کو تہکا مارا تہا اور قباحت یہ بھی کہ سرکاری فوجیں وہاں بلا سخت خطرہ میں مبتلا ہوئے جا نہیں سکتی تہیں۔

یہ قاعدہ اہل عرب کے یہاں بہت زور کے ساتھ ملحوظ رہتا تہا یہاں تک کہ انہیں سے بعض لوگ اوروں کو بھی اس کی ہدایت کیا کرتے تھے۔ منجملہ ایسے ہی اقوال کے مثنی بن حارثہ شیبانی کا یہ قول بھی ہے جو ایک دلیر اور جنگجو عربی سردار تہا جس وقت اسے مسلمانوں کے اہل فارس سے معرکہ آرا ہونے کے لئے ملک عراق میں آنے کی اطلاع ملی تو اسنے یہ پیغام افسر فوج اسلام سے کہلا بھیجا تھا:

"اہل فارس سے ان کے ملک کی سرحدوں پر ایسے مقام میں جنگ کرو جہاں کہ سرزمین عرب کا ایک چھوٹا سا پتھر بھی پایا جا سکے، خبردار ان کے گھروں میں گھس کر نہ لڑنا۔ اگر خداوند پاک نے مسلمانوں کو فتحمند بنایا تو جو کچھہ اہل فارس کے پس پشت ہے سب انہیں کا ہوگا۔ لیکن بصورت دیگر انہیں اپنے ہی لوگوں میں سے کسی گروہ میں واپس آنا ہوگا جس کے بعد وہ اپنی راہ سے زیادہ باخبر اور اپنی سرزمین پر زیادہ دلیر ہونگے یہاں تک کہ حق سبحانہ انہیں دوبارہ حملہ کرنے کی استطاعت دے۔"

خلیفہ عمر بن الخطاب رض کی یہ خواہش کہ مرکز خلافت مدینہ اور اسلامی مملکت کے تمام گوشوں سے آمدورفت کا سلسلہ باقی رہے، اس امر کی اوربھی تائید کرتی ہے کیونکہ خلیفہ ممدوح اس امر پر بیحد مصر رہتے تھے کہ ان کے اور تمام مسلمانوں کے مابین راہ میں کوئی دریا حائل نہو فارس اور مصر فتح ہو چکنے کے بعد جس زمانہ میں کہ امیر سعد بن ابی وقاص مدائن میں اور امیر عمرو بن العاص اسکندریہ میں مقیم تھے، خلیفہ ممدوح نے تمام امراء اسلام کو یہ فرمان لکھا تہا کہ "میرے اور اپنے مابین کسی دریا کو حائل نہ کرنا تاکہ جس وقت میں اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر تمہارے پاس آنا چاہوں تو آسکوں"۔ اس حکم کے موصول ہونے پر سعد رض کوفے میں آگئے اور عمرو بن العاص فسطاط میں۔ ان دونوں امیروں نے اپنی فوجوں کیساتھ کیمپ میں سکونت اختیار کی۔ بعد ازاں ہی خیموں کے پڑاؤ کچھہ عرصہ میں بڑے بڑے آباد شہر بن گئے۔

یرموک

شام اور عراق کے معرکوں میں اہل عرب کا جو قاعدہ تہا اسے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے بعد یرموک کا مشہور معرکہ پیش آیا جو ابوبکر رض کی زندگی ہی میں ۱۳ھ میں واقع ہوا۔ یرموک اطراف شام میں ایک وادی یا نالہ ہے جو بصریٰ کے قریب واقع ہے اسمیں سے پانی بہکر بحیرہ طبریہ میں گرتا ہے اسکا یونانی نام (Hieromax) تہا جسکو اہل عرب نے اپنے تلفظ میں لاکر "یرموک" کر لیا۔ اسی ندی کے کنارہ

پر یہ خوفناک معرکہ ہوا تھا۔ فتح شام میں اس کی بڑی شان ہے اس لئے کہ اسی معرکہ میں مسلمانوں کی کامیابی نے انہیں فتوحات کا سلسلہ قائم رکھنے پر مستعد بنا دیا اور رومیوں کی ہمتیں پست کر دیں۔

واقعہ یرموک کے حالات میں غور کرنیکے بعد اس میں مسلمانوں کی کامیابی کا باعث دو چیزیں پائی جاتی ہیں عمرو بن العاص رض کی رائے صائب۔ اور خالد بن الولید کی شجاعت۔ کیونکہ جسوقت رومیوں نے حدود شام پر اہل عرب کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی مار دہاڑ دیکھی تو انہوں نے اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے یہ قصد کیا کہ مسلمانوں کو یکبارگی پیس ڈالیں۔ مسلمان لوگ شام و عراق کے اطراف میں متفرق تھے، انہیں اس امر کی خبر ملی تو انہوں نے باہم معاملہ میں باہم خط و کتابت کی۔ عمرو بن العاص رض نے کہا کہ "میری تو یہ رائے ہے کہ اجتماع بہتر ہے۔ کیونکہ جب ہم اکٹھے ہو جائینگے تو تھوڑے ہونے پر بھی مغلوب نہ ہو سکینگے اور اگر متفرق رہینگے تو ہم میں سے ہر ایک فرقہ دشمنوں کی کثرت کیوجہ سے اپنے مدمقابل غنیم کا بار نہ اٹھا سکیگا۔" مسلمانوں نے ابوبکر رض کو اس رائے سے اطلاع دی اور انہیں تمام صورت حال لکھ بھیجی۔ ابوبکر رض نے بھی وہی جواب دیا جو عمرو بن العاص رض نے کہا تھا۔ لہذا مسلمانوں کی فوجیں شام و عراق سے آن آن کر یکجا ہو گئیں اور یرموک کے میدان میں ان سے اور رومیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ابن اثیر کے قول کیمطابق رومیوں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی۔ اور مسلمانوں کی تعداد صرف پچاس ہزار جو خالد بن الولید کی ماتحتی میں تھے، خالد نے مسلمانوں میں کھڑے ہو کر ایک پُرزور تقریر کی اور انہیں غنیم کے مقابل ثابت قدم رہنے پر ابھارا اور ہمت بندھائی۔ پھر انہوں نے اسلامی فوج کے کئی حصے کر دیئے اور ہر حصہ پر ایک سردار مقرر فرمایا۔ اہل عرب صف بندی کر کے لڑنا نہ جانتے تھے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ مگر یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالد رض نے رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے انہیں کے فوجی نظام کو دیکھ کر اپنی افواج کو بھی طرز پر مرتب کر لیا۔ خالد رض کو مسلمانوں کے خوفزدہ ہو جانیکا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن وہ مختلف اوضاع سے انہیں جوش دلاتے رہتے۔ مثلاً انہوں نے ایک مسلمان کو یہ کہتے سنا کہ "روم والے کتنے زائد ہیں۔ اور مسلمان تھوڑے ہیں" اسے انہوں نے چھوٹتے ہی یہ جواب دیا کہ "روم والے کس قدر تھوڑے ہیں۔ اور مسلمان زائد" تم سمجھ رکھو کہ تھوڑی فوجیں فتحمندی کے ساتھ زائد ہو جاتی ہیں۔ اور شکست و ہزیمت کیوجہ سے بڑے بڑے لشکر صرف تھوڑے سے آدمیوں کے برابر رہجاتے ہیں۔ جسوقت کہ اسلامی فوجیں معرکہ کارزار میں تھیں انکے پاس ابوبکر رض کی وفات کی خبر آئی۔ مگر انہوں نے بدیں خیال اس خبر کو مخفی رکھا کہ اس میدان میں ہزیمت کہانا ہماری تمام محنتوں کو رائگان کھو دیگا اور ہمیں بالکل تباہ و برباد کر ڈالیگا۔ مسلمانوں نے اس معرکہ میں بڑی سخت جنگ کی یہانتک کہ ان کی عورتیں بھی

لاٹھیاں لے کر لڑتی تھیں۔ آخر کار انہیں فتح نصیب ہوئی۔ اور یہی فتح ملک شام کی آیندہ فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ اسی طرح ملک عراق میں قادسیہ کا معرکہ ان کے اہل فارس سے فتوحات حاصل کرنے کی بسم اللہ ہوا۔ اس جنگ میں بھی مسلمانوں نے بڑی پامردی اور صبر دکھایا تھا۔ اور بہت دنوں تک یہ میدان سر نہ ہو سکا۔

(۸) رومیوں اور فارسیوں کی خانگی جھگڑوں میں گرفتاری۔ پھوٹ اور خانہ جنگی۔ ان کی متفقہ قوت کی کمزوری اور اخلاق کی خرابی نے بھی ان دونوں ممالک کے رہنے والوں کو نیچا دکھایا۔ مذکورہ بالا حالات اس عداوت اور مخالفت کے علاوہ تھی۔ جو ملک کے اصلی باشندوں اور ان کے غیر قوم حکمرانوں کے بیچ پھیل رہی تھی۔ مصر اور شام کے ملک میں اس عداوت کا بہت زور تھا اسلئے کہ مصر کے اصلی باشندے جو کہ قبطی تھے پے در پے کئی صدیوں تک غیر قوم کے حکمرانوں کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے تھے۔ پہلے فارس والوں کے محکوم ہوئے بعد ازاں یونان والوں کے اور پھر رومی قوم کے زیر فرمان آئے۔ اس تغیر و تبدل نے انکی طبیعتوں کو انقلاب پسند بنا دیا تھا۔ اور آئے دن کے ظلم و ستم سے بچنے کیلئے ایک حکومت کے پنجے سے نکل کر دوسری سلطنت کی ماتحتی میں پہنچنا انہیں ایک آسان کام ہو گیا تھا۔ اسی طرح اہل شام جو کہ آرامی، سریانی، نبطی اور یہودی وغیرہ قوموں میں سے تھے، وہ بھی اپنے مصری پڑوسیوں کی طرح مصیبت کے مارے ہوئے اور انہیں کی مانند استقلال سے مایوس ہو چکے تھے اسلئے انہیں اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ انکا حاکم رومی ہو یا عربی۔ البتہ صرف اسقدر چاہتے تھے کہ انہیں اس حکمران کے ماتحت راحت و امن نصیب ہو۔ ملک شام کے رہنے والوں کو بہ نسبت اور اقوام کے عربی قوم کی حکومت پسند بھی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اہل عرب زبان نسب اور عادات کے معاملہ میں ان سے بہت قریب تھے اس بات کو بھی جانے دیا جائے۔ تاہم ایک امر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ نسبت قریب والے کے دور والے سے زیادہ نفع پانے کی امید رکھا کرتا ہے اور نئے آنے والے سے بہ نسبت ہمیشہ کے پاس رہنے والے کے زیادہ بہتری کا متوقع ہوتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ مذکورہ بالا شخصوں کی حالت کا فرق ظاہر ہو جیسا کہ رومیوں اور اہل عرب میں بیّن فرق تھا۔ کیونکہ ان دنوں روم والے ادبار و تنزل کے چکر میں آ چکے تھے ان کے احکام و آداب بگڑ چکے تھے اور عرب اپنے اٹھان اور ترقی کے دور میں تھے۔ انہوں نے انصاف اور مساوات کو اپنا طریقہ بنا رکھا تھا۔ یہ سب باتیں ان مذہبی اختلافوں اور جھگڑوں کے علاوہ تھیں جو ان دونوں ملکوں کے رہنے والوں اور ان کے حاکموں کے مابین وجہ بیگانگی تھیں ہم ان تمام باتوں کو اوپر بیان کر آئے ہیں ان اسباب نے شام اور مصر کے رہنے والوں کو کسی غیر قوم و مذہب کے حاکم کے سامنے سر اطاعت خم کرنا [illegible]

مدد دینا آسان معلوم ہوتا تھا۔

یہود (۹) اگرچہ روم والے متعدد گروہوں اور جماعتوں میں منقسم تھے۔ تاہم جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یہودیوں کے ستانے اور دق کرنیکے معاملہ میں وہ سب ایک ہوجاتے تھے۔ جو وقت مسلمان ملک شام کو فتح کرنے کی نیت سے آئے ہیں۔ یہ دشمنی حد درجہ کو پہنچ چکی تھی۔ اور گو یہودی لوگ مال کو جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں لیکن رومیوں سے انتقام لینے کی راہ میں وہ اپنے مال و منال کے خرچ کرنے پر بھی آمادہ تھے اور نیز اکثر حالتوں میں رومیوں کے مقابلہ پر وہ اہل عرب کے مددگار ہوتے رہے۔ ان کو شہروں کے مخفی رستوں کا راز بتا کر شہر میں لیجایا کرتے تھے جیسا کہ قیساریہ میں کیا۔ مسلمانوں نے متواتر سات برس تک اس شہر کا محاصرہ کئے رکھا۔ لیکن وہاں کی فوجی طاقت اور اس کے قلعوں کی پائداری و دشوار گذاری کیوجہ سے فتح نہیں کر سکے ہر ایک رات میں قیساریہ کی فصیلوں کی حفاظت کرنیکے لئے ایک لاکھ فوج متعین رہتی تھی۔ اسلامی فوج کے سپہ سالار اس مقام پر معاویہ بن ابی سفیانؓ تھے۔ ان کے پاس قیساریہ کے باشندوں میں سے ایک یہودی آیا جس کا نام یوسف تھا اس نے محض اس شرط پر کہ اُسے اور اس کے بال بچوں کو امن دیا جائے مسلمانوں کو ایک بدررو بتادی جس میں پانی تھا اور اس کے اندر سے ہوکر آدمی شہر میں داخل ہو سکتا تھا اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان لوگ شہر میں اسی بدررو کی راہ سے گھس گئے اور اُسے فتح کر لیا۔

جب ابو عبیدہؓ نے شہر سامرہ کو صلح سے لیا تو وہاں کے رہنے والے سب یہودی تھے ان سے صرف یہ شرط تھی کہ مسلمانوں کے جاسوس اور راہبر بنیں اسی شرط کے مقابل میں ان کو جزیہ سے بری کر دیا اور ان کی زمین انہیں کو دیدی کہ اسکی آمدنی کھائیں اور خرچ میں لائیں۔ دوسرے ایسے ہی شہروں کی حالت کو جنہیں یہودیوں نے محض اپنے رومی حاکموں کے زک دینے کی غرض سے بددیانتی کرکے مسلمانوں کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا اسی پر قیاس کر لو۔ اور ان سب باتوں کا سبب وہی عداوت اور بددلی تھی۔ جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کا عدل اُنکی مہربانی اور خدا ترسی (۱۰) ان عمدہ صفات کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا جو روم اور فارس والوں کی حکومت سے آزاد ہوکر مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں داخل ہوتے تھے۔ یہ نیک برتاؤ ان کی سب سے مقدم وصیت تھی جسے ساتھ لے کر دار الخلافت سے فتوحات کے لئے قدم نکالتے تھے۔ دیکھو جبکہ اسامہ بن زید اسلامی فوج کو ساتھ لے کر شام کی جانب روانہ ہوئے ہیں۔ ابوبکر صدیق رضؓ نے انہیں حسب ذیل نصائح کی تھیں۔

بدعہدی نہ کی: بے وفائی: ظلم و زیادتی نہ کرنا: لوگوں کے اعضا کاٹنے: بچوں: سن رسیدہ بڈھوں
اور عورتوں کے قتل کرنے پھلدار درخت کو کاٹنے اور جلانے اور درختوں کو بے ثمر بنانے سے پرہیز کرنا
بکری۔ گائے۔ اور اونٹ کو خدا کے لئے ذبح (قربانی) کرنیکے علاوہ اور کسی وجہ سے ذبح نہ کرنا اور عنقریب
تم ایسے لوگوں کے پاس سے ہو کر گذرو گے جنہوں نے خدا کی عبادت کے لئے عبادتگاہوں یا خانقاہوں میں
سکونت اور گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے: انہیں انکی حالت پر چھوڑ دینا اور انکی عبادتگاہ یا خانقاہ سے بھی متعرض نہ ہونا
انہیں شائستہ سلوکوں میں سے ایک طریقہ ادنے اور اعلے درجہ کے لوگوں میں مساوات کا قائم کرنا بھی تھا اس امر
کی سب سے روشن دلیل غسان کے بادشاہ جبلہ بن ایہم غسانی کا قصہ ہے۔ جبکہ وہ عمر بن الخطاب کے عہد
میں مسلمان ہو کر اپنے خدم و حشم کے ساتھ مدینہ آیا تھا۔ عمرؓ اس کے مسلمان ہونے سے بہت مسرور ہوئے
اور مدینہ کے رہنے والے اس کے جلوس کو دیکھنے نکلے جس میں مرصع و مغرق ساز و براق کے گھوڑے تھے اور
جبلہ کے سر پر جواہرات کا مرصع تاج تھا: باوجود اس شان و شوکت اور رعب و جلال کے: جبکہ وہ خانہ کعبہ کا طواف
کر رہا تھا اور قوم فزارہ کے ایک شخص نے اسکے ازار پر پیر رکھدیا۔ جبلہ نے غضبناک ہو کر اسکے منہ پر ایک
تھپڑ مارا اور وہ شخص عمرؓ کے پاس فریادی ہوا تو عمرؓ نے جبلہ کو سزا شرعی سے معاف نہ فرمایا: اسکو بلا بھیجا
اور جب وہ آیا تو اس سے پوچھا کہ یہ فزاری کیا شکایت کرتا ہے؟ جبلہ نے کہا بیشک: اے امیرالمومنین: اس شخص نے
میری ازار گرا دینے کا قصد کیا تھا اور میں نے حرمت کعبہ کی وجہ سے تھپڑ ہی مار کر رہ گیا ورنہ اس کے منہ پر تلوار
مارتا: اس کے جواب میں عمرؓ نے فرمایا کہ اب وہ وقت ہوئی کہ تو نے خود گناہ کا اقرار کر لیا لہذا یا تو اس
آدمی کو ضامن کر لے یا میں اس کو تجھ سے بدلا دلاؤنگا اور اسے حکم دونگا کہ جس طرح تو نے تھپڑ مارا تھا وہ بھی تجھے مارے
جبلہ نے کہا: یا امیرالمومنین یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں: عمرؓ نے فرمایا:
اسلام نے تم دونوں کو ایک کر دیا ہے: تم اس پر سوا پرہیزگاری اور نیک مزاجی کی عمدہ صفات حاصل کرنیکے اور کسی
طرح فضیلت نہیں پا سکتے" جبلہ کو عمرؓ کے حکم سے بچنے کے سوا اسکے کوئی صورت نظر نہ آئی کہ کہیں بھاگ جائے
لہذا وہ رات کیوقت قسطنطنیہ کو بھاگ گیا اور پھر کبھی ملک عرب کا رخ نہ کیا۔ ایسی ہی اس قبطی کی حکایت ہے
جسے عمرو بن العاص کے بیٹے نے بیگناہ مارا تھا: اور وہ مدینہ جا کر حضرت عمرؓ کے حضور میں فریادی ہوا
عمرؓ نے فوراً قاصد بھیجکر امیر عمرو بن العاصؓ اور ان کے بیٹے کو مدینہ میں طلب فرمایا: جس وقت عمرو بن العاص
اپنے بیٹے کے حاضر بار خلافت ہوئے: خلیفہ ممدوح نے مظلوم قبطی کو ایک کوڑا دیکر حکم دیا کہ عمرو بن العاص کے فرزند کو

مارے۔ قبطی نے اس لڑکے کو کوڑا جما کر یہ قصد کیا کہ اس کے باپ امیر عمرو بن العاصؓ پر بھی ہاتھ ڈالے کہ امیر مذکور بول اٹھے "ایسے تو صرف میرے بیٹے نے مارا تھا۔ جو اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ اب مجھ پر کیوں عتاب کیجئے" اس کے جواب میں خلیفہ نے قبطی کو روک دیا۔ اور امیر مذکور سے فرمایا۔ "اے عمرو تو نے لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا ہے۔ وہ تو اپنی ماں کے شکم سے آزاد پیدا ہوئے تھے"۔

ان بہترین اور شریف ترین عادات کا جو اثر فتوحات کے بسرعت بڑھنے میں ہو سکتا ہے۔ وہ اہل دانش سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ شام، عراق، اور مصر کے رہنے والے اپنے حکام کے ظلم و ستم اور ان کے ذلیل برتاؤ سے تنگ آ رہے تھے، جو ان کو نہایت حقیر اور خوار سمجھتے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ مسلمان فاتح سراپا عدل و رحم ہیں تو بدل و جان ان کی جانب متوجہ ہو گئے اور ان کے دوستدار بن گئے۔

لوگوں کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دینا

(۱) عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب کسی شہر یا ملک کو فتح کرتے تو وہاں کے رہنے والوں کو بدستور سابق انہیں کے طور و طریق اور حالتوں پر رہنے دیتے۔ ان کے مذہب میں، معاملات میں، اور ان کی تمدنی و انتظامی وغیرہ حالتوں سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ جبکہ عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کیا ہے تو انہوں نے وہاں بھی ایسا ہی برتاؤ کیا یعنی قبطیوں کی حکومت اور انتظامی حالت خود انہیں کے ہاتھوں میں رہنے دی۔ حتیٰ کہ قبطی لوگ اپنے ہی گروہ میں سے اپنا قاضی بھی مقرر کرتے تھے۔ جو ان کے معاملات کا فیصلہ کرتا تھا اور بہت سے مفتوحہ ممالک میں اہل عرب کا یہی طرز عمل رہا۔

گویا کہ بظاہر ان کی فتح ایک قسم کی حاکمانہ مداخلت ہوتی تھی جس سے رعایا کے طور و طریق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور آگے چل کر جو امور بیان ہوں گے ان سے اس بات کا اور بھی صاف صاف انکشاف ہو جائیگا اور اہل عرب جزیہ کے نام سے جو رقم وصول کیا کرتے تھے۔ یہ گویا انکی حفاظت جان و مال کا معاوضہ ہوتا تھا خود رومی لوگوں کو غسانی وغیرہ قبائل کے عربوں کو جو ملک شام کی حدود میں رہتے تھے اس قسم کی مالی امداد دیتے رہنے کی عادت تھی تاکہ وہ ان کے مددگار رہیں اور اہل فارس کے مقابلہ میں ان کے ساتھ جنگ کریں۔ جس طرح کہ عراق کے رہنے والے عربوں کو اہل فارس زر نقد اور دیگر انعامات دے دے کر انہیں رومیوں کی جنگ میں اپنا بازو بنائے رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں جتنی بڑی بڑی سلطنتیں ہیں وہ سب اپنے ممالک کے قریب رہنے والی وحشی اور جنگجو قوموں کو اس قسم کا عطیہ دیتے رہنے کے عادی ہیں۔ دولت علیہ عثمانیہ بھی ایسا ہی کرتی ہے اور آجکل اسی عطیہ کا نام "خوۃ" رکھا جاتا ہے لیکن اہل عرب نے اپنی مفتوحہ قوموں پر ادائے مال کے ساتھ ہی

"حتیٰ یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون" کی نص پر عمل کرنیکے لحاظ سے اطاعت و فروتنی کا اظہار بھی مشروط کر دیا تھا۔ اور گو اُن سے اپنی اطاعت منواتے تھے۔ تاہم لوگ جزیہ دیا کرتے تھے۔ یہ اُن کی حفاظت اور خبرگیری کا اقرار کر لیتے تھے۔ اور اس کے ذمہ وار ہو جاتے تھے کہ انہیں کسی قسم کا مالی یا جانی نقصان بیرونی دشمنوں کے ہاتھوں نہ پہنچنے دیں گے۔ اس بات کو دیکھ کر گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ اس حمایت سے ملک کے اصلی باشندوں کا ان کے حکام رومیوں کی دسترس سے بچائے رکھنا مراد ہوتا تھا۔ اسلئے کہ اہل ملک دل سے تو رومیوں کی اطاعت سے خارج ہونیکے خواہاں تھے۔ لیکن اُن کی قوت سے ڈرتے بھی تھے۔

عبادہ بن الصامت رضؓ نے مقوقس مصر کے حکمران سے جو گفتگو کی۔ اس سے بھی امر مذکورہ بالا بخوبی واضح ہوتا ہے۔ انہوں نے مقوقس اور تمام مصر کے رہنے والوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا تھا۔ لیکن اگر تم اسلام کو قبول نہیں کرتے اور نہ لڑنا چاہتے ہو تو جزیہ ادا کرو اور عاجزی کے ساتھ ہمارے مطیع بنو اور جتقدر ہم تم باہم راضی ہو جائیں وہ تم ہر سال ہمیں دیا کرو۔ جبتک کہ ہم اور تم باقی رہیں۔ ہم تمہارے اُن دشمنوں سے لڑینگے جو تم کو ایذا دینے پر آمادہ ہوں۔ یا تمہاری زمینوں مالوں اور عیالوں کو تلف کرنا چاہیں۔ اگر تم ہماری ذمہ واری میں رہوگے تو ہم تمہاری طرف سے حفاظت جان و مال کی خدمت ادا کرینگے۔ اور اس امکا تم کو قول دینگے۔۔۔۔ الخ۔ اسی مضمون کے اقرارنامے اور خطوط ذمی لوگوں کو اہل اسلام لکھدیتے تھے جو بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور خالد بن الولید رضؓ نے ملک عراق میں ابن نسطونا کے نام جو تحریر لکھی تھی اسکا مضمون بھی یہی تھا۔

ہمارے اس بیان کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو مسلمانوں اور شہر حمص کے رہنے والوں میں پیش آیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ جب مسلمانوں کو یرموک کے میدان میں اکٹھے ہونے کی ضرورت پیش آئی اس وقت شہر حمص ان کی ذمہ داری میں تھا۔ مسلمانوں نے جسقدر جزیہ کی رقم حمص والوں سے وصول کی تھی وہ سب انہیں واپس کر دی اور انسے کہا۔ "اب ہم ایک مہم میں مبتلا ہونیکے باعث تمہاری امداد و حفاظت کا کام انجام نہیں دیسکتے لہذا تمہیں اختیار ہے کہ جو چاہو اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔" اسکے جواب میں حمص والوں نے کہا۔ "تمہاری حکمرانی اور تمہارا انصاف ہمیں بہ نسبت اس ظلم و ستم کے جسمیں ہم اب سے پہلے مبتلا تھے۔ بہت زیادہ بڑھ کر پسند ہے۔ ہم تمہارے عامل کیساتھ ملکر شہر (حمص) کو افواج ہرقل کی دسترس سے بچائیں گے اور اسکی حفاظت کرینگے۔" نیز مسلمان لوگ اکثر ایسی حالتوں میں غیر مسلم قوموں کو جزیہ سے معاف بھی کر دیتے تھے جبکہ وہ ان کے ساتھ ہو کر لڑنے کا اقرار کرتی تھیں۔ اور یہ صورت نصرانی عربوں کے ساتھ اکثر واقع ہوئی ہے۔ لیکن کچھ اسی پر منحصر نہیں ملکہ کئی بار عربوں نے

علاوہ اور قوموں سے بھی اس قسم کا معاملہ ہوا، جیسے براہمہ وغیرہ سے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کا تسلط لوگوں پر گراں نہیں گزرتا تھا۔ بلکہ ملک کے باشندے اکثر حالتوں میں ان کو اپنے اصلی حاکموں (رومیوں یا فارسیوں) سے افضل سمجھتے تھے، اور جزیہ کی رقم جو انہیں مسلمانوں کی نذر کرنی پڑتی تھی اُن تمام لگانوں اور ٹیکسوں سے جو وہ لوگ رومیوں یا فارسیوں کو دیا کرتے تھے۔ کہیں کم تھی۔

خلاصہ حاصل کلام یہ ہے مسلمانوں کی فتح کی جرأت اور ہمت صرف ان کے مذہب نے دلائی اور اپنی فتحمندی پر اُن کے سچے دلی اعتقاد نے جس کے ساتھ ہی اُن کی شہسواری اور تیر اندازی کی مہارت، جسمانی قوت، جنگلی زندگی بسر کرتے رہنے سے مستعدی کی عادت، لڑائی کو طول دینے کا ڈھنگ، اور ان کی قوم میں اہل الرائے اور شجاع افراد کا پیدا ہونا بھی شریک تھا۔ اور ان سب سے بڑھ کر اُن کی انصاف پسندی اور دادگستری اور مہربانی تھی جو وہ مفتوح رعایا کے ساتھ برتتے تھے۔ اور رومیوں اور فارسیوں کی کمزوری کی حالت بھی ان کی معین و مددگار تھی جس کے سبب سے دس برس سے کچھ ہی زائد عرصہ میں انہوں نے شام، فلسطین، مصر، عراق، اور فارس کی سلطنتوں پر قبضہ کرلیا اور عمر بن الخطابؓ ہی کے عہد میں ان تمام مقامات پر اُن کا کامل تسلط ہوگیا اور اس کے بعد عثمان بن عفان اور اُن کے جانشین خلفاء کے زمانہ حکومت میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔



صورت مثالی حضرت خلیفہ عمر بن خطابؓ

خلفائے راشدین کی جانب واپسی

فتنہ عثمانؓ کے زمانہ میں جس فساد کا بیج پڑا جو ان کے قتل ہونے کیساتھ ۳۵ھ میں پا ہوا اور اسی وقت سے اسلامی تاریخ کا رنگ بدل گیا۔ اس فتنہ کا سبب یہ تھا کہ جب ۲۳ھ میں عمرؓ کو ابو لولوء مجوسی نے نماز میں چھپے ہوئے خنجر سے زخمی کیا اور انہیں اپنی زندگی کا خاتمہ ہوتا محسوس ہوا تو انہوں نے اصحاب نبی میں سے چند لوگوں کو جنہیں عثمانؓ بن عفان، طلحہؓ بن عبید اللہ، زبیر بن العوام اور علی بن ابی طالب بھی شامل تھے اپنا جانشین ہونے کیلئے نامزد کر کے ۔ ۔ ۔ یہ وصیت کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں جمع ہو کر اپنے میں سے ایک شخص کو کثرت رائے سے منتخب کریں، جو میرے بعد خلافت کا کاروبار سنبھالے۔ ان لوگوں نے جمع ہو کر عثمان بن عفان کو منتخب کیا جو بنی امیہ کے کنبہ میں سے تھے اور ان سب لوگوں میں باعتبار عمر کے بڑے بھی تھے۔

یوں تو بنو امیہ تمام قریش کے گھرانوں میں قوت و جمعیت کے لحاظ سے بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن انمیں سے بہتیرے لوگ مکہ کے فتح ہو چکنے اور اپنے سرگروہ ابو سفیانؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام لائے تھے اس لئے ان لڑائیوں میں جب سلطنت اسلامی کے رکن قائم ہوئے۔ ان کی کوششوں کا کوئی حصہ شامل نہ تھا۔ ابوبکرؓ جو مسند نشین خلافت ہوئے تو انہوں نے بھی ان لوگوں کو عامل مقرر نہ کیا اور نیز اسبات کا باعث ابوبکرؓ کا ان لوگوں کے اسلام کی سچائی پر وثوق نہ کرنا رہا۔ کیونکہ ان لوگوں کو اسلام لائے ہوئے بہت تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا یا اسلئے کہ یہ لوگ قبول اسلام سے کوئی معزز رتبے پر مجبوری کی حالت میں مسلمان ہوئے تھے۔ بنو امیہ نے ابوبکرؓ سے اسبات کا مطالبہ بھی کیا کہ ہمیں افسری اور عہدے کیوں نہیں دیئے جاتے؟ جسکے جواب میں انہوں نے صرف اتنی بات کہی کہ تم اپنے اور بھائیوں کی سی کارگذاریاں جہاد میں دکھاؤ۔" اور یہ کہکر انہیں مرتد لوگوں کے مقابلہ میں لڑنے کیلئے روانہ کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد عمرؓ نے انہیں اپنے عہد میں ملک شام کی لڑائی پر بھیجا۔ باوجود اسبات کے بنو امیہ ہمیشہ یہی خیال کرتے رہے کہ حکومت اور امارت کے لئے قریش کے تمام گھرانوں میں ہم ہی بہتر ہیں اسلئے کہ وہ بنو ہاشم سے مرتبہ میں عزت اور تعداد میں زیادہ ہیں اور لڑائیوں میں فوجی افسری انہیں کا حق تھی جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں [illegible] وفات پا جانیکے بعد جو ہی [illegible]

چچا تھے، بنو امیہ کا اثر اور اقتدار اور بھی بڑھ گیا تھا علاوہ ان تمام باتوں کے ہاشمیوں اور امویوں کے مابین زمانہ جاہلیت ہی سے مسلسل ایک قسم کی چشمک بھی چلی آتی تھی۔

عثمان رضؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو انکی وجہ سے بنو امیہ کی عزت میں نشو و نما ہوا یوں تو عثمان رضؓ بہت نیک مزاج اور صاف باطن بزرگ تھے، لیکن اپنے اقربا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور کنبہ پروری کی جانب مائل رہتے تھے، عثمان خلافت ہاتھ میں آتے ہی انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو ملکو نپر عامل بنانا شروع کردیا اور حکومت سے متعلق ان کو ذمہ داری کی خدمتیں سپرد کرنے لگے، جو صحابہ کہ اگلے وقتوں سے ان خدمتوں کے مستحق رہتے چلے آئے تھے انہیں امر ناگوار گزرا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے اسباب اٹھ گئے جنکے بیان کرنے میں طول لاطائل ہوگا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بڑے بڑے شہروں کے باشندے عثمان رضؓ سے ناخوش اور انکے دشمن بن گئے، انکی کئی جماعتیں جنمیں مصر، کوفہ، اور بصری کے رہنے والے شریک تھے، مدینہ میں آئیں اور انہوں نے عثمان رضؓ پر دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ خلافت سے علیحدہ ہو جائیں، خلیفہ ممدوح نے ان کی بات نہ سنی تو اُن لوگوں نے آپکو قرآن کی تلاوت کرتے میں شہید کر ڈالا، اور انکا وہ کرتہ جو شہادت کے وقت پہنے ہوئے تھے، خون میں تربتر ہو گیا اگرچہ اُن قاتلوں کے اس بیہودہ فعل میں اس اعتبار سے کتنی ہی لغویت کیوں نہ پائی جاتی ہو کہ اُنہوں نے مابہ خلافت کو نظر انداز کر کے خلیفہ کی آبروریزی کی، مگر اسمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ واقعہ اہل عرب کی خودداری، آزادمزاجی، اور بلند ہمتی کی ایک واضح دلیل ہے۔

عثمان رضؓ شہید ہو چکے تو اب لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ ان کا جانشین کون شخص ہو؟ مصر کے رہنے والے حضرت علیؓ کی خلافت چاہتے تھے، اور بصرہ والے طلحہؓ کی اور کوفہ کے باشندے زبیر بن العوامؓ کو خلیفہ بنانے کے متمنی تھے، اور یہ تینوں صاحب اور صحابہ کے مقابلہ میں خلافت کے بہت زیادہ آرزومند تھے۔ ملک شام کے اکثر باشندے بنو امیہ سے تھے۔ اور ان کے نزدیک خلافت عثمان رضؓ کے ہاتھ میں رہنی بہتر تھی، یا انکے بعد اپنے ہی خاندان کا کوئی شخص انکا جانشین بنانا چاہتے تھے، باقی رہے خاص مدینہ کے لوگ انکی مرضی بھی یہی تھی کہ علی رضؓ خلیفہ مقرر ہوں کیونکہ جس زمانہ سے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی، یہ لوگ برابر اہلبیت نبوی کی خیر طلب اور مددگار رہتے آئے تھے، اور اسوقت بھی اپنے اسی خیال پر قائم تھے پھر علی رضؓ کی جنبہ داری کے معاملہ میں قوم ربیعہ اور ملک یمن کے لوگ بھی مدینہ والوں سے مل گئے تھے، اسلئے اگرچہ تمام گروہوں کے مقابلہ میں علیؓ کے چاہنے والوں کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی، تاہم اتنی خرابی بھی تھی کہ وہ سب لوگ مختلف قبائل اور ممالک کے ہونے کی

وجہ سے بمشکل ایک خیال پر قائم رہ سکتے تھے۔ اور یہ بات ضرور تھی کہ وہ مستقل خیال رکھیں۔ سب سے زیادہ تعداد مدینہ والوں کی تھی۔ جو سوا علیؓ کے اور کسی کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ مکہ اور مدینے کے رہنے والوں میں قدیم زمانہ سے چشمک چلی ہی آتی تھی لیکن اسلام کے بعد اس کی بنیاد اور بھی مستحکم ہو گئی، کیونکہ ہجرت کے بعد جبکہ مدینہ والوں نے مسلمانوں کی مدد کی اور مسلمانوں کی حالت درست ہو گئی تو انہوں نے مکہ پر فوج کشی کر کے اسے فتح کر لیا اور مدینہ مسلمانوں کا پایۂ تخت بنا۔ تجارت کا رخ مکہ سے پھر کر مدینہ کی جانب ہو گیا اور اہل مدینہ کا اثر اور اقتدار روز بروز ترقی پذیر ہونے لگا۔ ان اسباب سے مکہ والے اور بھی خار کھانے لگے تھے۔ لہذا جبکہ مدینہ کے باشندوں نے علیؓ سے بیعت کر لی۔ تو طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی چار و ناچار ان سے بیعت کی۔ لیکن دل میں اس بات سے ناخوش رہے اس کے بعد یہ دونوں صاحب مکہ کو چلے گئے اور مکہ کے لوگوں نے مدینہ والوں کی شوکت مٹانے کیلئے ان دونوں کی امداد کی اور بعدازاں یہ دونوں عراق کو گئے تاکہ وہاں اپنے ہواخواہوں کے جتھے سے مل کر اور بھی عزت و اقتدار بڑھا سکیں۔ علیؓ بھی ان دونوں کے معاملہ سے غافل نہ تھے۔ وہ اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر ان کے تعاقب میں چلے اور بصرہ کے قریب جمل کی مشہور لڑائی ان کی فوجوں میں واقع ہوئی جس میں طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں شہید ہو گئے اور خلافت کا منصب بے غل و غش حضرت علیؓ کے قبضہ میں آ گیا۔ انہوں نے اسلامی پایۂ تخت کو مدینے سے منتقل کر کے کوفہ میں قائم کیا۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ علیؓ نے اپنے مدنی ہواخواہوں کو چھوڑ کر اہل عراق پر اعتماد کرنے میں بڑی سخت غلطی کی جس کا نتیجہ ان کے حق میں برا نکلا۔

علیؓ نے خیال کر لیا کہ اب خلافت کا میدان انہیں کے ہاتھ رہا اور کوئی ان کے مقابل میں دعویدار خلافت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن انہیں خبر نہ تھی کہ ملک شام میں ایک بڑا ذی اثر شخص موجود ہے۔ جو اپنی ذات کیلئے لوگوں سے بیعت کی آرزو رکھتا اور خلافت کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے۔ اس شخص سے ہماری مراد امیر معاویہ ابی سفیانؓ کے بیٹے ہیں۔ یہ امر پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ ابوسفیان اور ان کی اولاد نے محض مجبوری کے عالم میں جبکہ انہیں اپنی کامیابی سے بالکل ناامیدی ہو گئی تھی۔ مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ اس لئے معاویہ کو خلافت کی آرزو محض دنیاوی اغراض کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جس وقت حضرت عثمانؓ شہید کئے گئے ہیں معاویہ ملک شام میں امیر تھے۔ اور قریش کے بہت سے چیدہ چیدہ سردار ان کے پاس جمع تھے۔ جو ان کے خوش کرنے کیلئے سر بکف تھے۔ اور جان و دل سے ان کی امداد پر تیار، کیونکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ قریش کی برادری میں بنو امیہ کی قوت اور تعداد زمانہ جاہلیت ہی سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور اغراض نفسانی کی وجہ سے منصب نبوت کا بنو ہاشم کے خاندان میں چلا جانا انہیں بہت شاق گذر رہا تھا۔

اسلئے کہ وہ اُن سے بھی اندرونی عداوت رکھتے تھے، جس زمانہ میں مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی اور بنو ہاشم جو بنو اُمیہ کے
حریف تھے، قریب قریب سب مکہ سے نکل ہی گئے، پھر تو ریاست و امارت کا میدان بنو اُمیہ کیلئے خالی رہ گیا۔ مسلمانوں سے
جو لڑائیاں ہوئیں ان سبھوں میں عام فوجی افسری بنو اُمیہ کے ہاتھوں میں رہنے لگی (احد، بدر وغیرہ کی مشہور لڑائیوں
میں معاویہؓ کے والد ابوسفیان ہی فوج کفار کے افسر ہوتے رہے اس کے بعد جب یہ لوگ مذہب اسلام میں داخل ہو چکے
اور ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو خلیفہ ممدوح نے ان لوگوں کو جہاد میں بھیجنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ کارگزاریاں
دکھانے پر بنو اُمیہ میں سے ابوسفیان کے بڑے بیٹے یزید ملک شام کے حاکم بھی مقرر ہو گئے، جنکے فوت ہو جانے
کے بعد عمرؓ کے ایام خلافت میں ان کے دوسرے بھائی معاویہ بن ابی سفیان اُن کے قائممقام مقرر ہوئے
اور امیر شام کا معزز عہدہ انہیں حاصل ہوا۔ عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے بھی معاویہ کو شام کی امارت
پر قائم رکھا۔ امیر معاویہ کی فوجی قوت کا زیادہ تر حصہ قبیلہ قریش ہی کے لوگوں اور خصوصاً اپنے ہی کنبہ والوں کا
جتھا تھا۔ اس طریقہ پر بنو اُمیہ کے خاندان کی، خصوصاً ابوسفیان کے گھرانے کی حکومت اسلام کے ابتدائی دور
میں بھی ٹھیک ویسی ہی سلسلہ جمی رہی جیسی اسلام سے قبل تھی، اور بنو ہاشم نبوت کے کاروبار میں مصروف ہو کر
دنیاوی باتوں سے قطع تعلق کر بیٹھے۔

عثمانؓ شہید ہو گئے تو معاویہؓ کو خلافت کے حاصل کرنیکا ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے خلیفہ ممدوح کا خون آلود
کرتہ دمشق کی جامع مسجد میں لٹکا کر لوگوں کو کہا کہ انہیں مقتول خلیفہ کا بدلہ لینے پر ابھارا، کیونکہ وہ خود ان کے عزیزوں
میں سے تھے، اور علیؓ اور انکے ساتھیوں پر عثمانؓ کے قتل کی تہمت لگائی۔ معاویہ نے اس کارروائی کے
بعد دیکھا کہ ملک عراق میں علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ سے جنگ چھڑ گئی ہے، لہذا انہوں نے اس خیال سے کہ یہی
دونوں علیؓ سے نپٹ لیں گے، مجھے جنگ کرنے کی نوبت ہی نہ آئیگی، اپنی متذکرہ بالا کارروائی چند روز تک
ملتوی رکھی، مگر جبکہ طلحہؓ و زبیرؓ دونوں قتل کئے گئے اور علیؓ کامیاب ہوئے تو معاویہؓ نے عثمانؓ کے خون کا معاوضہ
لینے پر پھر مستعدی دکھلائی اور اس امر کے متعلق انہوں نے عرب کے ایسے اعلےٰ درجہ کے چالباز لوگوں سے امداد لی
جو مذہب اسلام کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جس سے کہ دنیا کے اور کاروبار کو دیکھا کرتے تھے انہیں پالیٹکس
لوگوں میں سے ایک شخص عمرو بن العاص بھی تھے جنکو عثمانؓ نے مصر کی حکومت سے علیحدہ کر دیا تھا، مگر معاویہ نے انکو
اپنا مقرب بنایا اور ان سے وعدہ کیا کہ اپنی کامیابی کی حالت میں تمہیں مصر کا حاکم مقرر کر دونگا۔ غرضیکہ معاویہؓ نے
کیل کانٹے سے درست ہو کر اور عمرو بن العاصؓ کو ساتھ ملا کر صفین کے مشہور جنگ میں علیؓ کا مقابلہ کیا۔ لڑائی

۳۷ھ میں ہوئی تھی اور قریب تھا کہ علیؓ کے طرفدار فتحمند ہو جائیں اور معاویہؓ کو شکست اٹھا کر ہمیشہ کیلئے
اپنے دعاوی سے بالآخر دست بردار ہونا پڑے کہ عین اس حالت میں جبکہ خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی عمرو بن العاصؓ
نے ایک ایسی چال چلی جس نے خلافت کو اہلبیت نبوی سے نکال کر بنو امیہ کے قبضہ میں ہی رکھا۔ وہ حیلہ یہ تھا کہ عمرو بن العاص
نے لڑائی کا رنگ بگڑتا دیکھ کر اور معاویہؓ کی فوج کو مغلوب ہوتا پا کر انہیں حکم دیا کہ قرآنوں کو نیزوں کی انیوں میں
لٹکا کر بلند کریں اور اسطرح کچھ کہنے سننے کے لئے لڑائی کو روکنے کا اشارہ کریں۔ علیؓ کے ساتھی اس کارروائی
سے دھوکا کھا گئے اور ہر چند علیؓ نے سمجھایا کہ یہ دشمن کا فریب ہے اب میدان تمہارے ہاتھ آتا دکھائی دیتا ہے
تو جنگ کے التوا اور گفتگو کی مہلت مانگنے کی درخواست کر رہا ہے۔ تم اس فریب کے لئے اسطرف خیال نہ کرو۔
مگر انہوں نے نہ مانا اور نہایت اصرار کے ساتھ علیؓ کو جنگ کے بند کر دینے پر مجبور کر دیا۔ جسے بالآخر انہوں نے
مان لیا۔ جنگ بند ہو گئی اور باہم گفتگو ہو کر یہ قرار پایا کہ دونوں صاحب پنچ مقرر کریں۔ اور پنچ اُنکے ہوں۔ پھر پنچ لوگ
جو فیصلہ کر دیں گے اُسے دونوں گروہ خوشی سے مان لینگے۔ دونوں فریقوں نے ایک ایک شخص کو اپنی جانب سے
حکم مقرر کیا۔ جنمیں سے ایک شخص عمرو بن العاص تھے جو معاویہؓ کی جانب سے منتخب ہوئے تھے اور علیؓ کے ساتھیوں نے ابو موسیٰ
اشعری کو منتخب کیا۔ حالانکہ عمرو بن العاصؓ اور ابی موسیٰ اشعری میں فطانت اور ذکاوت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا
فرق تھا۔ ابو موسیٰ ایک سیدھے سادے سے مرد خدا پرست تھے۔ اور عمرو بن العاصؓ نہایت چالاک علامہ فہیم اور دور اندیش
غرضیکہ دونوں فریق اس امر پر راضی ہوئے کہ یہ دونوں صاحب جو کچھ فیصلہ کر دیں گے وہ سب کو منظور و قبول ہوگا۔ بعد
اس کے بعد پنچوں کے حکم سنانے کا ایک دن مقرر ہو گیا۔ عمرو بن العاصؓ نے ابو موسیٰ کو ایسی چال بتائی کہ انکی
عقل بالکل اپنے قابو میں کر لی۔ انہوں نے ابو موسیٰ سے یہ ظاہر کیا کہ وہ معاویہؓ اور علیؓ دونوں کو خلافت سے
علیحدہ کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ اسکے بعد مسلمان لوگ اپنی پسند کے مطابق کوئی ایک خلیفہ منتخب کر لیں جو ان دونوں
کے علاوہ ہو۔ چونکہ ابو موسیٰ کو اس مفید مشورہ کے قبول کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہ ہوئی اسلئے راضی ہو گئے۔ مگر عمرو بن العاص
کو اپنا منصوبہ پورا کرنے کیلئے ابھی ایک اور ترکیب چلنی باقی تھی جو انہوں نے یوں پوری کر لی کہ ابو موسیٰ رضؓ کو اپنے سے
زیادہ معزز اور عمر میں بڑا ہونے کی حیثیت سے قابل تعظیم جتا کر ان سے کہا کہ پہلے آپ جو کہنا ہے کہدیں
تو پھر میں بھی اپنا خیال ظاہر کر دونگا۔ ابو موسیٰ رضؓ دھوکا کھا کر ممبر پر چڑھ گئے اور انہوں نے با آواز بلند کہا۔
لوگو! ہمنے اس امت کے بارہ میں بہت کچھ غور کیا۔ [illegible]
بات کے سوا کوئی تجویز نہیں معلوم ہو سکی جس پر [illegible] اور عمرو بن العاصؓ [illegible] متفق ہو گئے [illegible]

یہ ہے کہ ہم علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کردیں اور مسلمان لوگوں کو اختیار دیں کہ انکی علیحدگی کے بعد وہ جسے چاہیں اپنا حاکم بنالیں لہذا تم لوگ بخوبی سن لو کہ میں نے علیؓ کو عہدہ خلافت سے علیحدہ کر دیا ہے تم اپنا کام خود سنبھالو اور جسے خلافت کے لائق پاؤ اپنا حاکم بنالو" ابو موسیٰؓ اسقدر کہہ کر بیٹھ گئے تو عمرو بن العاص اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی مجوزہ ترکیب حسب ذیل گفتگو کے ساتھ مکمل کر دی :-

"اسمیں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ انہوں (ابو موسیٰ کیجانب اشارہ کرکے) نے کہا وہ تم سب لوگ سن چکے ہو انہوں نے اپنے ساتھی (علیؓ) کو خلافت سے علیحدہ کیا ہے اور میں بھی انکو اس عہدہ سے ویسا ہی برطرف کرتا ہوں جیسا کہ خود اُن کے حکم (پنچ) نے کیا ہے اور میں اپنے دوست معاویہؓ کو خلافت پر قائم کرتا ہوں اسلیئے کہ وہ عثمانؓ کے ولی اور ان کے خون کا معاوضہ چاہنے والے ہیں اور تمام لوگوں سے بڑھ کر انکا مرتبہ پانیکے حقدار ہیں"

جوقت لوگوں نے یہ گفتگو سنی تو انہیں یقین کامل ہوگیا کہ درا صل یہ کارروائی سراسر فریب تھی اور اب اسکا جادو چل گیا ہے۔ ہمنے غلطی کی کہ اس حیلہ میں پھنس گئے، کاش اس کارروائی کا اثر اگر صرف اسیقدر ہوتا کہ معاویہؓ خلیفہ مقرر ہو جاتے تو بھی کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس بات نے خود علیؓ کے لوگوں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا، انہیں سے کچھ لوگوں نے تو علیؓ کو پنچایت کے قبول کرنے پر ملامت کی اور نا راض ہو کر ان کے حکم سے نکل گئے جنکا نام "خوارج" ہوا۔ اس طریقہ پر علیؓ دو دشمنوں کے درمیان گھر گئے (۱) امیر معاویہؓ مدعی خلافت، (۲) خود اُن کے نافرمان ساتھی خارجی لوگ اور یہ دوسرا فرقہ ان کیلیئے بہت سخت خطرناک ثابت ہوا، اس لئے کہ انہیں لوگوں میں سے ایک نامرد کے ناگہانی تلوار کا وار کرنے سے وہ شہید بھی ہو گئے، یہ واقعہ ۴۰ھ میں کوفہ کی مسجد کے اندر واقع ہوا تھا۔

علیؓ کی شہادت کے بعد اُن کے مطیع اور پیرو لوگوں نے اُن کے بڑے بیٹے امام حسنؓ سے بیعت کی اور معاویہؓ اسوقت تک برابر اپنے لئے خلافت کا مطالبہ کر رہے تھے، حسنؓ نے دیکھا کہ وہ (خود) معاویہؓ سے جنگ نہیں کر سکتے اور انکی قوت نہیں توڑ سکتے۔ لہذا وہ خونریزی سے بچنے کیلئے منصب خلافت سے کنارہ کش ہو گئے اور برضا و رغبت معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کر لیا، اس کے بعد معاویہؓ نے ملک شام میں اپنی خلافت کی بیعت لی اور دار الخلافت کو کوفہ سے اٹھا کر دمشق میں منتقل ہو گیا، اور حسنؓ کا خلافت سے دستکش ہونا خلفائے راشدین کی خلافت کا خاتمہ تھا۔

خلفائے راشدین کا زمانہ

حالات مندرجہ بالا سے صاف صاف عیاں ہو رہا ہے کہ خلفائے راشدین کی حکومت خدا ترسی پر قائم ہوئی اور انصاف و عدل کیساتھ مستحکم، اس کے

حکمران خلفاء بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے وقتوں میں خلافت کا طرز دینی رہبوں سے ملتا جلتا تھا۔ حکومت دنیاوی سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ ان خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں سے ہر شخص موٹے سوٹے کپڑے کا لباس پہنتا تھا، ان کے پیروں میں کھجور کی چھالوں کی بنی ہوئی نعلین ہوتی تھیں، ان کی تلوار کا پرتلا بھی کھجور کی چھال کی رسیوں سے بنا ہوتا تھا، وہ خلیفہ بازاروں میں اسی طرح چلا پھرا کرتے تھے جیسے کوئی عام رعایا میں کا شخص گھومتا پھرتا ہو اور جس وقت کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے کچھ کہتے تھے تو جواب میں اپنی بات سے کہیں زیادہ سخت گفتگو سنتے تھے۔ وہ پاک طینت لوگ ان تمام باتوں کو دینداری کی قسم سے خیال کرتے تھے اور لوگوں پر خدا ترسی، انصاف، اور عمدہ برتاؤ کے ساتھ حکمرانی کرتے تھے۔

خلفائے راشدین کی غذا انکے یہاں کے فقیروں کی غذا سے بھی کم درجہ کی ہوتی تھی۔ وہ لوگ محتاجی یا تنگدستی کی وجہ سے اس قسم کی کمی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایسا کرنے سے انہیں اپنی غریب رعایا کیساتھ ہمسری اور ہمدردی کا خیال رہتا تھا، علی بن ابی طالب رضؓ کو ان کی املاک سے بہت بیش قرار آمدنی ہوتی تھی جو وہ سب کی سب فقیروں کو دے ڈالا کرتے تھے۔ اور اپنا گزارہ اسی قناعت اور صبر کی روش پر کرتے رہتے خلفائے راشدین مال و دولت کی ذرا بھی پرواہ نہ رکھتے تھے۔ کچھ خلفاء پر ہی موقوف نہیں بلکہ انکے وقتوں میں تمام صحابہ رسولؐ کا یہی وطیرہ تھا۔ شاید اس امر کا سبب رہا ہو کہ وہ لوگ نبوت کے زمانہ سے قریب تھے اور نبوت کا رعب و داب ان کے دلوں پر بخوبی جما ہوا تھا۔ اور جسقدر نبوت کا زمانہ دور ہوتا گیا رفتہ رفتہ وہ رعب بھی انکے دلوں سے زائل ہوتا گیا اور وہ دنیا کی طلب پر جھکتے گئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین ہی کے آخری عہد میں جاہ و جلال دنیاوی کی چاٹ لوگوں کو پڑ چلی تھی کیونکہ مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ عثمانؓ کے زمانہ میں صحابہ نے زمینیں خرید لی تھیں اور مال جمع کیا تھا جس دن عثمان رضؓ شہید ہوئے ہیں انکے خزانچی کے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار دینار اور دس لاکھ درہم نقد موجود تھے۔ اور وادی القریٰ اور حنین وغیرہ مقامات میں جو انکی اراضیاں تھیں ان کی قیمت کا تخمینہ ایک لاکھ دینار ہوا تھا اسکے علاوہ انہوں نے اونٹ اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی چھوڑی تھی اور زبیر رضؓ کے ترکہ میں سے صرف ایک ترکہ کی قیمت انکی وفات کے بعد پچاس ہزار دینار تک پہنچی تھی اسکے علاوہ ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار لونڈیاں بھی انہوں نے چھوڑی تھیں۔ اور طلحہ رضؓ کی وہ آمدنی جو صرف عراق سے آتی تھی، روزانہ ہزار دینار کی تھی اسکے علاوہ سراۃ کی سمت سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ اس سے بھی بہت زیادہ ہوا کرتی تھی عبدالرحمن بن عوف رضؓ کے مربط (جانوروں کو باندھنے کی جگہ طویلہ) میں ہزار گھوڑے بندھے رہتے تھے اور انکے پاس ایک ہزار

اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں۔ جو وقت انہوں نے وفات پائی ہے تو ان کے ترکہ کا صرف ایک چہارم حصہ چوراسی ہزار درم کا قرار پایا تھا۔ زید بن ثابت نے علاوہ اس مال و متاع اور اراضی کے جنکی قیمت ایک لاکھ دینار تھی، سونے اور چاندی کی اینٹیں اپنے ترکہ میں چھوڑی تھیں جو کلہاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر ورثا میں تقسیم کیگئیں۔ زبیر رضی نے بصرہ میں مکان بنوایا تھا اور ویسے ہی عظیم الشان مکانات مصر، کوفہ، اور اسکندریہ میں بھی تعمیر کرائے تھے۔ اسی طرح طلحہ رضی نے کوفہ میں گھر بنوایا تھا اور مدینہ میں اپنے مکان کو توڑ کر نئے سرے سے پختہ گچ کا تعمیر کرایا جسمیں تمام ساکھو کی لکڑی لگائی گئی تھی، سعد بن ابی وقاص رضی نے اپنا گھر "عقیق" میں بنوایا جو بہت ہی کشادہ اور بلند محل تھا اور اس کے اوپر بہت سے بالاخانے بھی بنوائے تھے، مقداد رضی نے "مدینہ" میں اپنا مکان اندر اور باہر دونوں رخ سے پلاستر پختہ کرا کے تعمیر کرایا، اور یعلی بن منبہ رضی نے مرنے کے بعد پچاس ہزار دینار نقد چھوڑے اور اس کے علاوہ مال و اسباب اسقدر جسکی قیمت تین لاکھ درم تخمینہ کیگئی تھی۔ (آخر قول تک)

خلفائے راشدین کی حکومت قریباً تیس سال رہی جس کے اندر اسلامی فتوحات کو یہاں تک وسعت ہوئی کہ عربی فوجیں مغرب کی سمت میں افریقہ سے لیکر مشرقی جانب میں ملک خراسان کی انتہائی حدود تک پھیل گئیں اور نہر فرات کے اس پار سمرقند تک بڑھ گئیں۔

بنی اُمیہ کی حکومت

خلفائے راشدین کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ بنو امیہ کے گھر میں خلافت کیونکر منتقل ہو آئی، جن کا پہلا خلیفہ معاویہ بن ابی سفیان تھا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں خلافت کو اس طریقہ سے امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایک قسم کی دنیوی حکومت ہے جسکا خلیفہ (حکمران) طرح طرح کے حیلہ، فن، اور تدبیر ملکداری کے ساتھ اُسے مضبوط کرتا ہے اور لوگوں کو اپنا جاہ و جلال دکھا کر اپنا متقرب بناتا اور اپنے زور و قوت کے بڑھانے میں بیدریغ مال و دولت لٹاتا ہے، یہ طریق اختیار کرنیکا سبب یہ ہوا کہ حکومت مذکورہ کے بانی معاویہ نے خلافت کو کچھہ دینی اور اخروی طمع سے نہیں لینا چاہا تھا جیسا کہ پہلے بھی معلوم ہوچکا ہے، اور ممکن ہے کہ اگر ملک شام کی زرخیزی اور کثرت محاصل معاویہؓ کو عطا اور انعام کا موقع نہ دیتی تو وہ کبھی اپنے مطلب کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوتے

اور اپنی شوکت نہ بڑھا سکتے، اسلئے جو وقت بے غل وغش خلافت ان کے قابو میں آگئی تو انہوں نے بیدریغ لوگوں کو انعام واکرام بانٹنے شروع کئے، خاص کر وہ اس قسم کے عطیات بنی ہاشم کو زیادہ دیتے رہتے جس سے انکی یہ غرض ہوتی تھی کہ ان کے اپنے ہاتھ سے خلافت کو نکال لینے کے باعث جو عداوت اور کینہ انکے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے اس کی آگ بجھی رہے اور "زر برسر فولاد نہی نرم شود" پر عمل کرکے ان کو بگڑنے اور برسر پرخاش آنے دیا جائے معاویہؓ کی عادت تھی کہ جسوقت بنو ہاشم میں سے کوئی شخص ان کے پاس آتا تو اُسے بڑی خاطر و مدارات کے ہاتھوں ہاتھ لیا کرتے اور اس کے راضی خوشی رکھنے اور حاجتوں کو پورا کر دینے میں بہت کچھ مبالغہ کیا کرتے تھے اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ بنو ہاشم جبکہ وہ معاویہؓ کے یہاں آتے تو اُن سے اپنے اُن حقوق کا ذکر کیا کرتے تھے جو اُنہیں منصب خلافت کے متعلق حاصل تھے، اور صاف صاف کہہ گزرتے کہ انہوں (معاویہ) نے قہر یا زر دستی کے ساتھ یہ منصب ہمارے قابو سے نکال لیا ہے۔ معاویہؓ یہ سب سنتے اور دم نہ مارتے تھے، بلکہ چشمپوشی کرکے اُنہیں مال و منال دیتے اور ضبط و تحمل سے ان کی زبانیں بند کر دیتے تھے اس قسم کے اُن کے بہت سے قصے مشہور ہیں اور وہ اکثر صحیح ہیں۔

معاویہؓ نے روم والوں سے دولتمندی اور عیش پسندی کے طریقے اور اسباب اقتباس کئے، اور شاہانہ رعب و جلال کے اظہار میں انکی تقلید کی، حرس (محافظ سپاہی، باڈی گارڈ) مقرر کئے یہ کچھ لازم ہوتے تھے جو ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور برچھے لئے ہوئے ان کے سامنے کھڑے رہا کرتے تھے، یا جب وہ کہیں باہر نکلتے یا نماز کو جاتے تو آگے آگے چلا کرتے، انہوں نے اپنے واسطے ایک عظیم الشان محل بنوایا جسمیں تخت خلافت نصب کیا گیا اور اس کے دروازہ پر دربان و حاجب کھڑا کیا، مسجد میں ایک علیحدہ حجرہ تعمیر کرایا کہ جب نماز پڑھنے آتے اسی کے اندر نماز پڑھتے، ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ سب وسائل اس خوف کی وجہ سے اختیار کئے ہوں تاکہ انپر کوئی دشمن ناگہانی حملہ نہ کر بیٹھے جیسا کہ علیؓ پر لوگوں نے اچانک حملہ کیا تھا اور قریب تھا کہ وہی لوگ انکو بھی لپیٹ میں لے لیتے۔ لیکن زندگی تھی بچ گئے، نیز معاویہؓ نے خز اور دیبا کے بیش قیمت اور شاندار لباس پہننے میں بھی رومیوں کی پیروی کی تھی، اور مسلمانوں میں وہ سب سے پہلے فرمانروا ہیں جنہوں نے رومیوں اور فارسیوں کے طرز پر ڈاک کا انتظام کیا اور "دیوان خاتم" کی بنا رکھی جسکی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔

معاویہؓ نے جو نئی باتیں اسلام میں جاری کیں انہیں سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے خلافت کو اپنی نسل میں میراث کے طور پر مقرر کر دیا، حالانکہ اس سے پیشتر خلافت انتخابی تھی یعنی عامۂ مسلمین اپنی پسند اور

کثرت رائے سے کسی شخص کو خلیفہ منتخب کر لیتے تھے۔ تمام مسلمانوں میں سب سے پہلے معاویہؓ ہی ایسے شخص ہیں جنھوں نے یہ کام کیا اور اپنے بیٹے یزید سے بیعت کر کے اُسے ولیعہد بنایا اور لوگوں سے اسکی ولیعہدی پر بیعت لی اس مقام پر کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ علیؓ کے بعد اُن کے فرزند حسنؓ سے بھی تو بیعت کیگئی تھی۔ کیونکہ اُنسے تو لوگوں نے اپنی خواہش اور رضا مندی کیساتھ بیعت کی تھی ان کے والد نے انکے واسطے خلافت کی وصیت ہرگز نہیں کی۔

بنی امیہ کو کس چیز نے خلافت دلوادی؟

اگرچہ خود معاویہؓ اور تمام وہ لوگ جنھوں نے اُن سے بیعت کی پوری طرح خیال رکھتے تھے کہ اہلبیت نبوی بہ نسبت اُن کے منصب خلافت کے زائد مستحق ہیں۔ باوجود اس کے جن اسباب نے معاویہؓ کو اہلبیت کے ہاتھوں سے خلافت کو نکال لینے اور پھر اُسے اپنے ہی گھرانے سے مخصوص کر دینے میں مدد پہنچائی۔ انپر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ یوں تو بہت سی وجہیں ہیں جنمیں سے بعض کا ہم پہلے ذکر بھی کر چکے ہیں لیکن انہیں وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ معاویہؓ نے اپنی قوت و شوکت کے مستحکم بنانے میں اسلام کے مشہور مدبروں اور پالیٹیشن لوگوں سے کام لیا جنھیں طرح طرح کے لالچ دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص عمرو بن العاصؓ ہیں انہیں حکومت مصر کا لالچ دیا جسکی وجہ سے انہوں نے لوگوں سے بیعت لینے میں انہیں بڑی مدد دی جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے دوسرے صاحب زیاد بن ابیہ ہیں اس شخص کے باپ کا پتہ معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ بڑا چالباز اور مدبر تھا۔ معاویہؓ نے ایک ایسا فرضی قصہ گھڑ لیا جس کے ذریعہ سے اسے اپنے سلسلہ نسب میں شامل کر لیا اور بیان کیا کہ وہ ان کے باپ ابوسفیان کا فرزند اور ان کا بھائی ہے اور اسکا نام زیاد بن ابوسفیان رکھدیا۔ یہی زیاد معاویہؓ کا بڑا زبردست مددگار تھا اور ممالک عراق وغیرہ کی طرف سلطنت بنو امیہ کا سکہ جمانے میں اس کا بہت بڑا احسان ہے اسی زیاد کے بیٹے عبیداللہ بن زیاد نے حسینؓ بن علیؓ کو قتل کیا تھا جن کا اُن کے ہاتھوں شہید ہونا مشہور عام ہے۔ اسی وقت سے (جبکہ معاویہؓ نے زیاد کو اپنا برادر قرار دیا تھا) زیاد کی اولاد کا شمار برابر قریش کے خاندان میں ہوتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی عباسی نے اس کے نسب کو عبید رومی کیجانب پھیرا جو کہ قبیلہ ثقیف سے تھا۔ اور تیسرے بزرگوار مغیرہ بن شعبہ ہیں ان سے بھی معاویہؓ نے اپنی خلافت میں کافی امداد لی۔ انہیں مغیرہ کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کیواسطے لوگوں سے بیعت لینے اور خلافت کو اپنی نسل میں محدود کر دینے میں معاویہؓ کو مدد دی تھی۔ اور زیاد بن ابیہ کو اُن سے ملانے میں بھی یہی مغیرہؓ بڑے بھاری پیروکار رہے تھے مورخ لوگ ان چاروں اشخاص کو رجال العرب کے سب سے بڑے مدبر اور پولیٹیشن شمار کرتے ہیں اور یہی

خیال ہے ایک مورخ کا قول ہے کہ "میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر بردبار اور متانت غور و فکر کے ساتھ کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا" اور جب کہ لوگوں کا مجمع اسوقت ان سبھوں پر سبقت لے جانے والا اور ان سے اپنے اشارہ پر کام لینے والا عمرو بن العاصؓ سے بڑھ کر مجھکو کوئی نہیں نظر آیا۔ زیاد بن ابیہ سے بڑھ کر کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا جسکا باطن ظاہر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہو۔ اور مغیرہ بن شعبہ کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی شہر میں آٹھ دروازے ہوں اور ہر دروازے میں ہو کر نکلنے کے واسطے انہیں اگر نئے ہی مکر و فریب کی ضرورت ہو تو اس میں شک نہیں کہ وہ ہر ایک دروازے میں ہو کر نکل جاتے۔

معاویہؓ کی کامیابی میں اسباب نے اور بھی مدد پہنچائی کہ علیؓ ملکداری کی چالیں چلنا پسند نہیں کرتے تھے اور حکمرانی کی تدبیروں سے ناواقف تھے۔ اسکے ثبوت میں وہ واقعات پیش ہو سکتے ہیں جو ان کی ذات سے شہادت عثمانؓ کے بعد ان سے بیعت کئے جانیکے وقت عیاں ہوئے۔ ان دنوں مغیرہ بن شعبہؓ نے انکی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت صلاح دی تھی کہ آپ معاویہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ اور دوسرے عاملوں کو انہیں عہدوں پر قائم رہنے دیں جن پر کہ وہ لوگ عثمانؓ کے عہد سے مقرر ہیں۔ پھر جب آپ کا پوری طرح تسلط ہو جائے اور آپکی بیعت پر سب لوگوں کے دل متفق ہو جائیں۔ لوگوں میں جو اختلافات پھیلا ہوا ہے یہ فرو ہو جائے اور سب مطمئن ہو کر آپکے زیر ماتحت ہو لیں اسوقت جو دل میں آئے کیجیگا" اگرچہ یہ ایک دانا اور دور اندیش شخص کی رائے تھی لیکن علیؓ نے اسے بے اعتباری کی نظر سے دیکھ کر اس پر عمل نہ کیا۔ اور انکے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباسؓ نے بھی انہیں اسی طرح پر سمجھایا تھا۔ مگر آپ نے اسے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ مغیرہؓ نے جب یہ کہا کہ میرے سمجھانے کا اثر نہیں ہوتا ہے تو وہ چپ ہو رہے اور انہوں نے خیال کیا کہ یہ جیسا کرتے ہیں کرنے دو۔ غرض کچھ روز دوسرے روز وہ پھر علیؓ کی خدمت میں آئے اور انکی ذاتی رائے کو اچھا بتانے لگے اگر علیؓ مغیرہؓ اور ابن عباسؓ کے کہنے پر چلتے تو مذکورہ بالا لوگ (یعنی معاویہ وغیرہ) انکے دشمن نہ بنتے۔ اور مغیرہؓ وغیرہ ان کے طرفداروں میں نکل جاتے نہ جمل اور صفین کی لڑائیاں پیش آتیں اور نہ منصب خلافت بنو امیہ کے ہاتھ میں جا سکتا۔

اس موقعہ پر ایک اور بھی بڑا موثر سبب ہے جسکو معاویہؓ اور تمام بنی امیہ نے اپنے ہر وقت کے برتاؤ میں استعمال کیا جس سے ہماری مراد "مال" ہے بنو امیہ اسی کے ذریعہ سے اپنے طرفداروں کی جماعت اور دوستوں کو قابو میں لایا کرتے تھے۔ انکا قاعدہ تھا کہ اپنے یہاں آنیوالے حاجتمندوں اور شاعروں کو بے دریغ انعام و اکرام دیتے رہتے اور اسی کے وسیلہ سے وہ لوگ علیؓ ابن ابیطالب اور انکی اولاد و احفاد کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے جس وقت

میں کہ یہ لوگ امراء میں مال کا خرچ کرنا کمینہ پن خیال کرتے تھے اور اپنی طبیعت کو اس کام سے باز رکھتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ صرف حق کی پابندی ان کے دعوے کی تائید کیلئے کافی ہے اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ بنو ہاشم کا یہ خیال اوائل اسلام میں صحیح اترا تھا کیونکہ ان دنوں لوگوں کے دلوں پر نبوت کا رعب چھایا ہوا تھا اور ان کی نفسانی خواہشیں اور شیطانی وسوسے مغلوب تھے ہمارے خیال میں کوفہ والوں نے محض روپیہ کی لالچ سے حسینؓ کی بیعت توڑ دی جسکا انجام ان کا بیکسی کے عالم میں شہید ہو جانا ہوا یہ کہنا چاہیئے کہ امویوں نے حسینؓ کو مال کے زور سے شہید کیا اور نیز عبداللہ بن زبیر کو بھی ان لوگوں نے مال ہی کے سبب سے شہید کرایا، اگر عبداللہ بھی روپیہ کو اسی طرح صرف کرتے جس طرح کہ بنوامیہ کیا کرتے تھے تو اسمیں کلام نہیں کہ خلافت انہیں کی نسل میں رہتی بنی امیہ کے ہاتھوں میں نہ جاتی۔ مگر اُنہوں نے کعبہ کے مال کا لوگوں کو لٹانا نامناسب سمجھ کر اس سے ہاتھ روکا اور اپنی ذات کو نقصان پہنچایا چنانچہ اُن کے دشمن اور مقابل عبدالملک نے اپنے مرتے وقت صاف صاف یہ کہدیا کہ "میں اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کو بھی اس کام (خلافت) کیلئے صاحب قوت نہیں سمجھتا اسمیں کوئی شک نہیں کہ ابن زبیر بڑے نمازی اور بہت روزہ دار ہیں، مگر اپنی کنجوسی کیوجہ سے وہ حکومت کی قابلیت نہیں رکھتے ۔"

بخلاف عبداللہ بن زبیر کے اُن کا بھائی مصعبؓ بن زبیر اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کر دیتا تھا، یہانتک کہ اُسنے سکینہؓ بنت حسینؓ سے نکاح کر کے دس لاکھ درہم صرف کر ڈالے حالانکہ انہیں دنوں میں اسکی فوج کے سپاہی تنگدستی سے پریشان ہو کر اس سے روپیہ مانگتے تھے اور وہ انہیں ایک حبہ تک نہیں دیتا تھا، چنانچہ عبداللہ بن ہمام نے اسی واقعہ کو اس طرح پر عبداللہ بن زبیر کے پاس لکھ بھیجا وہ لکھتا ہے :-

بلغ امیر المومنین رسالۃ ——— من ناصح لک لا یرید خداعا

بضع الفتاۃ بالف الف کامل ——— وتبیت سادات الجنود جیاعا

لو لابی حفص اقول مقالتی ——— وابث ما ابثثتکم لارتاعا

(ترجمہ) ایک ایسے خیر خواہ کیجانب سے جو تم کو فریب دینا نہیں چاہتا ہے، امیر المومنین کو پیغام پہنچا دو کہ ایک حسین عورت پورے دس لاکھ درہم کا بدلہ حاصل کر لیتی ہے اور فوج کے سردار دن بھر فاقہ کر کے رات کو بھی بھوکے سو رہتے ہیں" اگر میں یہ بات ابی حفص (عمرؓ) سے کہتا اور جو تم سے عرض کرتا ہوں اسبات کو

ان کے سامنے بیان کرتا تو وہ خوف سے کانپ اُٹھتے ۔"

اپنا سکہ جمانے کیلئے عبدالملک تمام بنو اُمیہ میں مال کا بیدریغ اور بکثرت صرف کرنیوالا شخص تھا جبوقت حجاج بن یوسف نے کعبہ کا محاصرہ کیا ہے اور ابن زبیرؓ اسکے اندر تھے تو اُسنے اپنے ساتھی لوگوں کو حکم دیا کہ کعبہ کو منجنیق سے مسمار کریں ۔ مگر وہ لوگ ہیبت کے مارے اس امر کے مرتکب نہوئے حجاج نے اس بات کو دیکھ کر ایک کرسی میدان جنگ میں ڈلوادی ۔ اور اسپر بیٹھ کر اپنے سپاہیوں کو کہا ۔ کہ شام کے رہنے والو تم عبدالملک کے انعاموں کی غرض سے لڑو اور اس کے دشمنوں کو مارو ۔ اس گفتگو کو سنکر وہ سب لوگ فوراً ہی تعمیل حکم میں مصروف ہو گئے ۔

بسا اوقات عبدالملک دشمنوں کے ہاتھوں کی بلا کو مال کے ذریعے اپنے سر سے ٹالدیا تھا اسطرح کہ وہ روپیہ بکھیر دیتا اور لوگ اُسے چھوڑ کر مال و زر کے لوٹنے میں مصروف ہو جاتے ۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک وہ واقعہ بھی ہے جو عبدالملک کو سعید بن اشدق کے بیٹے عمرو کے ساتھ پیش آیا تھا ۔ جسنے عبدالملک کو ہٹا کر ملک شام پر قبضہ کر لینے کا منصوبہ گانٹھا تھا ۔ اور عبدالملک کو اسکی طرف سے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا تھا ۔ عبدالملک نے پہلے تو اُسے امان دی ۔ اور ایک حیلہ سے اس کو اپنے دربار میں بلوایا ۔ پھر جب وہ حاضر ہوا تو عہد شکنی کر کے اُسے قتل کرادیا ۔ اسکے ساتھیوں کو اس امر کی خبر ملی تو وہ سب جمع ہو گئے اور دربار کو گھیر لیا عبدالملک اسکے انجام سے ڈر گیا اور اسنے ایک شخص کو یہ حکم دیا کہ عمرو بن سعید کا سر باغیوں کے سامنے پھینک دے ایک جانب یہ کارروائی کی اور دوسری جانب اسکے بیٹے عبدالعزیز نے روپیوں کا توڑا لیکر مٹھی بھر بھر روپیے اشرفیاں باغیوں کے اوپر پھینکنی شروع کیں ۔ باغی لوگوں نے اپنے سرگروہ کا سر اور روپیوں کا مینہ برستا ہوا دیکھ کر سر کو تو چھوڑ دیا اور روپے سمیٹنے پر جھک پڑے اور اسے لے کر چلتے بنے ۔

بنو اُمیہ کے عہد سے بھی بڑھ کر خلفائے عباسیہ کے ایام میں مال و دولت کا اثر ترقی پر رہا ۔ انکی حکومت کا زور یا ضعف اس انعام و اکرام کی کمی زیادتی پر منحصر ہوتا تھا جو ہر ایک خلیفہ فوجی سپاہیوں کو تقسیم کیا کرتا ۔ خاصکر جس وقت کہ عباسی سلطنت میں ترکوں کا زور بڑھا تو وہ لوگ اپنی امداد کا بڑی بڑی رقموں سے معاملہ کرنے لگے ۔ ان کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جب کوئی نیا خلیفہ تخت نشین ہوتا پہلے اس سے اپنا حق بیعت مانگتے تھے ۔ اور ایک یا دو سال کی تنخواہیں انعام میں لے لیتے تب اس کی بیعت ہونے دیتے تھے ۔

جن امور نے بنو اُمیہ کی حکومت کو مدد دی اُن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ لوگ اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے

میں طرح طرح کے تریبیت آمیز قسم قسم کی چالیں چلا کرتے تھے؛ اور جو کام کرتے بہت ہی دور اندیشی اور حکمت عملی کیا تہ کرتے تھے۔ چنانچہ اُن باتوں کیوجہ سے مذہب کی توہین اور مذہب والوں کی ہجو منتی ہی کیوں نہوتی ہو اسلئے انہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے کو قتل کرا دیا؛ کعبہ پر آگ اور پتھر برسوائے؛ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بہائی اور انکے داماد کو منبر و ممبر پر کھڑے ہو کر لعنت کہی اور جس شخص نے انپر لعنت نہیں کی اُسے جان سے مروا دیا

بنو اُمیہ کے خلفا

ہم یہ اوپر بیان کر آئے ہیں کہ معاویہ رضہ نے اپنی نسل میں خلافت کا منصب وراثت کے طور پر مقرر کیا تہا؛ لیکن یہ منصب فقط اُن کے بیٹے یزید کے سوا جسکی ولیعہدی کی بیعت انہوں نے اپنی زندگی ہی میں کرا لی تھی ان کی اولاد میں اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ یزید نے بھی محض چند سال تک حکومت کی جس کے اثناء میں بڑے بڑے خراب کام کئے منجملہ اُن کے ایک امام حسین رض بن علی رض کا شہید کرانا بھی تہا یزید کے مرنے پر لوگوں میں بیعت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا؛ اسکا ایک بیٹا معاویہ (ثانی) نام تہا اگرچہ لوگوں نے اُسے خلیفہ مقرر کیا لیکن وہ اپنے تئیں منصب خلافت کا مستحق نہ سمجھتا تہا؛ آخر وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وفات پا گیا معاویہ ثانی کے رحلت کر جانے پر بنو اُمیہ نے ایک اور اموی بزرگ خاندان شخص سے (جو معاویہ کے گہرانے میں سے نہ تہا) بیعت کی؛ اس سردار کا نام مروان بن حکم تہا سنہ ۶۵ھ میں چند مہینوں تک خلافت کر کے یہ بھی وفات پا گیا؛ اور اس کے بعد خلافت اسی کی نسل میں محدود ہو گئی؛ اور جسقدر بنو اُمیہ کے خلفاء اسکے بعد ہوئے سب اُسی کی اولاد میں تھے، جنمیں سب سے زیادہ مشہور حکمران عبد الملک بن مروان تہا جسکا ذکر اوپر آ چکا ہے؛ اُسنے سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ تک (۲۱) سال حکومت کی؛

تمدن اسلام کی تاریخ میں عبد الملک کا ذکر عمدہ پیرائے میں ہوتا ہے؛ اسلئے کہ اسنے ممالک اسلامی کی دفاتر میں عربی زبان کو عام طور پر رائج کیا تہا حالانکہ اسکی حکومت کے زمانہ تک وہ دفاتر اہل ملک کی ہی زبانوں میں لکھے جاتے تھے؛ اور وہیں کے باشندے اسکے اہلکار ہوتے تھے؛ مصری دفتروں میں قبطی زبان کا رواج تہا اور اسکے کارکن مصر کے رہنے والے قبطیوں ہی میں سے تھے؛ شامی دفاتر یونانی زبان میں تحریر ہوتے تھے اور انکا کاروبار شامی نصاریٰ میں سے کچھ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تہا۔ اور عراق کا دفتر فارسی زبان میں تہا جس کی خدمتیں عراق ہی کے بعض باشندے سر انجام دیتے تھے۔ عبد الملک نے عام حکم دیدیا کہ تمام دفتروں میں عربی زبان جاری کر دی جائے اور ان کا کاروبار بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں دے دیا؛ اس حکمت عملی سے اسلامی حکومت کو جس قسم کا استحکام حاصل ہو سکتا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا؛ کیونکہ اس طرز عمل نے ممالک تمام ممالک میں عربی زبان کو عام زبان بنا دیا جسکی وجہ سے وہاں کے رہنے والے رفتہ رفتہ کئی صدیوں کے گذر جانے پر

اپنی جنسیتوں ہی کو بھول گئے اور اپنے تئیں عربوں میں شمار کرنے لگے۔ ایسا کرنے میں عبدالملک کو اسوجہ سے اور بھی امداد ملی کہ عربی زبان مذہبی زبان بھی تھی اور لوگوں نے اسے شوق سے حاصل کرنیکے علاوہ بابرکت اور قابل تقدیس زبان سمجھ رکھا تھا۔

عبدالملک کے کارناموں میں سے سکا عربی خط میں سونے کے سکے بنوانا اور رومانی طرازوں (مارکہ) کو عربی میں منتقل کرنا بھی شمار ہوتا ہے جسکی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ عراق میں عبدالملک کیجانب سے حجاج بن یوسف عامل مقرر تھا جو اپنی انتظامی قابلیت اور تندمزاجی کے لحاظ سے مشہور ہے۔ حجاج عبدالملک کا بڑا بھاری مددگار اور اسکی سلطنت کا رکن عظیم تھا۔ یہی حجاج ہے جسنے عبداللہ بن زبیر سے جنگ کی جو بنوامیہ کے مقابلہ میں اپنے لیے لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ حجاج نے مکہ میں انکا محاصرہ کیا اور کعبہ پہ منجنیق چلا کر انہیں قتل کر ڈالا۔ اور عبدالملک کو بلا نزاع خلیفہ بنا دیا۔

بنوامیہ کے مشہور خلفاء میں سے ایک خلیفہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان اموی بھی ہیں۔ انہوں نے ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک حکمرانی کی۔ یہ خلیفہ تمام اموی خلفاء میں اپنے چال چلن کے اعتبار سے خلفائے راشدین کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان نیک اطوار کی وجہ ان کی وہ قرابت ہی ہو جو انہیں عمر بن الخطاب رضہ سے تھی کیونکہ یہ عمر رضہ کی نواسی کے بیٹے تھے۔ جسوقت یہ مسند نشین خلافت ہوئے تو انہوں نے نیک صفات میں اپنے بزرگ نانا عمر رضہ کے زہد اور انصاف کی پیروی کی۔ بنوامیہ نے جسوقت سے کھلم کھلا خلافت کا مطالبہ کیا تھا اسوقت سے اب تک برابر ان کا یہ شیوہ رہا کہ علی رضہ کو برسر منبر برا بھلا کہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے خیال کیا کہ یہ فعل تبلیغ اور اسلام کی تعلیم سے بعید ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس بدنما کارروائی کو بند کر دیا۔ لیکن انکے یہ کام بنوامیہ کے نزدیک قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے خصوصاً اسلیے وہ اور بھی ان کی نگاہوں میں خار گزرے کہ انہوں نے بنوامیہ کو املاک کے خریدنے سے روک دیا۔ عمر بن الخطاب رضہ نے اپنے عہد خلافت میں بنوامیہ کو اس فعل سے روکا تھا۔ جسکی انہوں نے تعمیل نہیں کی۔ اب عمر بن عبدالعزیز نے پھر اس قاعدہ کو جاری کیا تو بنوامیہ کے دلوں میں یہ ڈر سما گیا کہ اس شخص کی حکومت زیادہ دنوں رہیگی تو غالباً یہ سلطنت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیگی۔ اسی خیال سے انہوں نے اس نیک خصلت حکمران کا چراغ زندگی بہت جلد گل کر دیا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد انکا چچا یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ یہ شخص عیش پسند اور شرابی تھا گانے بجانے کا بھی بہت شوق رکھتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار کو بالائے طاق رکھکر صرف دو لونڈیوں کی صحبت میں رہتا جنمیں سے ایک کا نام سلامہ اور دوسری کا نام حبابہ تھا۔ حبابہ نے اسکے دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ اور

تمام حکومت اس کے زیر حکم ہو گئی تھی وہ جسے چاہتی برطرف کرتی اور جسکو چاہتی ملازم رکھتی تھی۔ یزید کو دنیا کے کسی دوسرے سے غرض نہ رہی تھی آخر کار یزید کے بھائی "مسلمہ" نے ایک دن اُسے بہت لعنت ملامت کی اور اس سے کہا "تم عمر بن عبدالعزیز جیسے عادل حکمران کے بعد خلیفہ ہوئے ہو اور اب حالت یہ ہے کہ ایک لونڈی کے عشق میں مبتلا ہو کر سلطنت کے کاروبار کو تج بیٹھے ہو۔ لوگ تم سے ملنے آتے ہیں اور تمکو خبر بھی نہیں ہوتی فریادی لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور تم ہو کہ غفلت کی گہری نیند سو رہے ہو" بھائی کی ملامت آمیز گفتگو سے متاثر ہو کر یزید بن عبدالملک نے کہا "تم سچ کہتے ہو" اور اُس نے ارادہ کیا کہ اب نہ تو شراب پیئے گا اور نہ عیش و عشرت میں مدہوش رہیگا۔ چنانچہ کچھ دنوں تک وہ "حبابہ" سے علیحدہ رہا، مگر اس جدائی کی وجہ سے خود "حبابہ" کی آتش شوق بھڑک اُٹھی اور وہ اس فکر میں پڑ گئی کہ کسی طرح خلیفہ سے دوچار ہو۔ چنانچہ ایک روز جمعہ کے دن اُسنے اپنی کسی لونڈی سے کہا کہ "امیر المومنین نماز کیلئے نکلیں تو مجھے خبر دینا"۔ لونڈی نے اسکے حکم کی تعمیل کی، اور جس وقت خلیفہ نماز جمعہ کیلئے دیوان خلافت سے باہر جانے کو تیار ہوا اُسنے اپنی مالکہ "حبابہ" کو اطلاع کر دی۔ حبابہ عود ہاتھ میں لیے ہوئے اپنے محل سے نکل کر خلیفہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور یہ شعر بہت ہی دلکش آواز سے گانے لگی ؎

"الا لا تلمہ الیوم ان تیبلدا ٭ فقد غلب المحزون ان تیجلدا"[1]

یزید نے اس شعر کو سن کر اور حبابہ کی دلفریب صورت دیکھ کر اپنا منہ ڈھانک لیا اور اس سے کہا "ٹھہر تو جا کیا کرتی ہے"، مگر حبابہ نے اسکی خفگی کی کوئی پرواہ نہ کر کے دوبارہ ایک عجیب دلفریبی کیساتھ یہ شعر گایا:

"فما العیش الا ما تلذ و تشتھی ٭ و ان لام فیہ ذو الشنان و فندا"[2]

نتیجہ یہ ہوا کہ یزید اپنے آپے سے باہر ہو کر دیوانہ وار اسے لپٹ گیا اور کہنے لگا "واللہ تو نے سچ کہا۔ جس نے مجھے تجھ سے الفت رکھنے کی بابت ملامت کی خدا اسکا برا کرے۔ ارے لڑکے مسلمہ کو میرا حکم سنا دے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے"۔ اسکے بعد حبابہ کے پاس بیٹھ کر شراب ارغوانی کے جام پینے میں مصروف ہو گیا اور حبابہ برابر سریلی و دلکش تانیں اڑاتی جاتی تھی۔ غرضیکہ یزید پھر اسی اپنی اگلی سی سرخوشی میں مستغرق ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد سے یزید برابر انہیں لذائذ میں مصروف رہا، یہانتک کہ آخر کار حبابہ کے مرنے پر اسی کے رنج و غم میں خود بھی گھل گھل کر مر گیا؛ ان دونوں کی وفات کا قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایکمرتبہ وہ ملک شام کی

[1] خبردار آج اس کے تجاہل پر ملامت نہ کیجیو! کیونکہ غمگین پر اس کا تکلف صبر کرنا غالب آ رہا ہے۔

[2] عیش تو صرف وہی ہے جو تجھے لذیذ معلوم ہو اور جسکی تو خواہش کرے اگرچہ کینہ ور اسکے بارہ میں ملامت کرے اور بیوقوف بنا دے۔

ایک سردار کے گھر میں وارد تھا اور حبابہ اس کے ہمراہ تھی۔ یزید نے ولید خیال کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی شخص پورے ایک دن صبح سے ایک رات ہونے تک داد عیش نہیں دے سکتا۔ اس عرصہ میں اسے کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ جس سے تمام مزہ کرکرا ہوجاتا ہے۔ میں بھی اس قول کا امتحان کرونگا۔ یہ سوچکر اُسنے اپنے ہمراہیوں سے کہا کل صبح سے مجھے کسی بات کی اطلاع نہ دینا۔ اور نہ کوئی خط میرے پاس لانا خواہ وہ کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ حکم دیکر حبابہ کے ساتھ خلوت میں جا بیٹھا۔ اور مصروف عیش وتنعم رہا۔ خادموں نے دسترخوان چن دیا تھا جسپر طرح طرح کے لذیذ کھانے اور انواع واقسام کے میوے موجود تھے۔ حبابہ نے ایک انار اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ جسوقت کہ وہ انار کے دانوں کا پھنکا لگا رہی تھی اتفاق سے ایک سالم دانہ حلق میں جا پھنسا۔ اور اچھو ہوتے ہی مرگئی یزید مجنونوں کی طرح تین دن تک اس کے لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ اُسے دفن نہیں کرنے دیتا تھا۔ آخر کار اُسکی لاش بگڑ گئی اور اسمیں سے بو آنے لگی۔ یزید بار بار اس کی میت کو سونگھتا اور چومتا تھا۔ مگر اس کے پاس سے نہیں ہٹتا تھا۔ اس کے عزیزوں نے یہ حالت دیکھکر لعنت ملامت کی اور اسے اس حرکت سے باز آجانے پر مجبور کیا۔ بہت ہی رد وکد کے بعد یزید نے دفن کرنے کی اجازت دی۔ اور اس کے مرنیکے بعد خود بھی صرف پندرہ دن زندہ رہ کر آخر کار ۱۰۵ھ میں مرگیا اور حبابہ کے پہلو میں مدفون ہوا۔

یزید کے بعد اس کا بھائی ہشام ۱۰۵ھ سے لیکر ۱۲۵ھ تک بیس سال حکمران رہا۔ یہ خلیفہ نہایت عقلمند اور منتظم تھا۔ لیکن بخیل تھا۔ اور جو سلطنت سخاوکرم کے ذریعہ سے قائم ہوئی ہو۔ اسمیں کنجوسی کیوجہ سے جس قدر نقصان آسکتا ہے ظاہر ہے۔ ہشام کے بعد یزید کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا۔ یہ خلافت کے قبل ہی سے اپنے باپ کیطرح عیش پرستی۔ شرابخوری۔ اور گانے بجانے کا بیحد شائق اور عادی تھا۔ چنانچہ ان باتوں کی تعریف میں اس کے بہت سے اشعار بھی ہیں۔ خلافت ہاتھ آئی تو کھل کھیلا۔ لذائذ نفسانی اور ارتکاب معاصی کی کثرت تو تھی ہی خیر سے آپنے اپنے خاندان والوں سے بھی بگاڑ کر لیا۔ اور ان کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں کیں کہ آخر انہوں نے برہم ہوکر رعایا میں سے بڑے بڑے سرغنوں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ اور اسپر حملہ کرکے اُسے قتل کرڈالا۔ اس کے بعد ولید بن عبدالملک کے بیٹے یزید سے بیعت کرلی۔ یزید کا پختہ ارادہ تھا کہ جس قدر خرابیاں سلطنت میں پیدا ہوگئی ہیں ان کی اصلاح کریگا۔ لیکن اب معاملہ بہت بڑھ گیا تھا۔ بنوامیہ کی قوت پراگندہ ہوچکی تھی اور عباسی دعوت شروع ہوچکی تھی۔ ان وجوہ سے وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہا۔ اور انجام کار یہ ہوا کہ اسکے جانشین مروان بن محمد بن مروان کے عہد یعنی ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کے ہاتھوں سے خلافت بالکل جاتی رہی۔

حکومتِ عباسیہ

عباسیوں کی دعوت

ہم نے ابو بکر صدیق رضؓ کی خلافت کا حال بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانوں نے بنو ہاشم میں خلافت اور نبوت دونوں منصبوں کو اکٹھا کر دینا پسند نہیں کیا تھا اسلئے انکے علاوہ قریش کے دوسرے گھرانوں میں بیعت کی، مگر بنو ہاشم مسلمانوں کے اس فعل کو حق بات سے متجاوز ہونا سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ (خود بنو ہاشم) اس منصب کے لئے تمام دوسرے لوگوں سے بہتر ہیں اور اسکی کوشش کرتے رہتے تھے کہ خلافت پر قابض ہو جائیں، جن بنی ہاشم کو خلافت کی خواہش تھی ان کی بھی کئی قسمیں تھیں،

(۱) علوی، علی بن ابی طالب رضؓ کی اولاد ان کے بھی دو گروہ تھے، ایک گروہ کا منشا تھا کہ خلافت فاطمہ زہرا کی نسل میں آئے، اور دوسرا گروہ محمد بن حنفیہ کو جو دوسری بیوی سے حضرت علیؓ کے بیٹے تھے، خلیفہ بنانیکی فکر کرتا تھا

(۲) عباسی - نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا عباس رضؓ کی اولاد، ان دونوں جماعتوں کے لوگ عام لوگوں کو اپنی طرف بلاتے رہتے تھے، اور لوگ پردہ پردہ میں ان سے بیعت کرتے رہتے، لیکن ظاہر کرنیکی قوت اور جرأت نہ رکھتے تھے، جس وقت بنو امیہ کی کمزوری اور انکی قوت کی پراگندگی عیاں ہو چلی، تب لوگوں کو بھی ان کی اطاعت سے باہر نکلنے میں آسانی ہونے لگی، خصوصاً اس وجہ سے کہ زیادہ تر لوگ طمع یا خوف کیوجہ سے اموی خلفاء کے مطیع بنے تھے، ورنہ دل سے یہی خیال رکھتے تھے کہ خلافت کے لئے بنو ہاشم سب سے بہتر ہیں،

اُنہیں دنوں میں عباسیوں کو خراسان کا رہنے والا ایک فارسی شخص ایسا مل گیا جو بہت ہی دبنگ اور دلیر تھا، اس شخص کا نام ابو مسلم خراسانی تھا، عباسیوں نے اُسے اُسکے وطن خراسان کیجانب بھیجا تا کہ وہاں جاکر لوگوں سے انکی بیعت لے، اس لئے کہ وہ مقام اموی خلافت کے مرکز سے دور واقع ہوا تھا، ابو مسلم کو اس عمل میں عجیب قسم کی کامیابی ہوئی، اُسنے خوب خوب کوششیں کیں اور لوگوں کو جنگ و پیکار سے دبا کر آخر کار بنی عباس کیلئے خلافت کیلئے ساز و سامان مہیا کر دیئے، اور ۱۳۲ھ میں زمام خلافت اُنہیں کے پہلے خلیفہ سفاح کے سپرد کر دی، عباسی حکومت کی بنیاد قائم کرنے میں ابو مسلم خراسانی کے احسانات عمرو بن العاص رضؓ کے اُن احسانوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں جو انہوں نے معاویہ رضؓ کو خلافت دلانے میں کئے تھے، اسلئے کہ عمرو بن العاص رضؓ نے معاویہ رضؓ کو صرف اپنی رائے سے مدد دی تھی، اور ابو مسلم نے عباسیوں کی امداد اپنی تلوار اور اپنی قدم دونوں سے کی،

عباسی حکومت حکومت بنو امیہ کے بارہ میں یوں چاہے جو کچھ کہا جائے لیکن بنو عباس کی سلطنت سے اس کو یہ امتیاز بہر طور حاصل ہے کہ وہ اصلی عربی حکومت تھی۔ کیونکہ اس کے عامل قاضی اور تمام ارکان سلطنت اہل عرب تھے۔ صرف چند منشی اور طبیب اور اسی قسم کے بعض پیشہ ور یا اہل ہنر تو بیشک غیر اقوام میں سے تھے۔ ورنہ خلیفہ سے لے کر ادنے سپاہی تک تمام لوگ خاص عرب ہوتے تھے۔ مگر بنو عباس کی سلطنت میں فارسی عنصر غالب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اہل فارس نے ہی حکومت اُن کی دلائی تھی جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اسی لئے بنو عباس نے فارسیوں میں سے سربرآوردہ لوگوں کو اپنا وزیر بنایا۔ عربی حکمرانوں میں وزیر مقرر کرنے کی اولیت بنو عباس ہی کو حاصل ہے اُنہوں نے اس منصب کا تقرر بھی اہل فارس کی طرز حکومت سے اقتباس کیا تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر کسی موقعہ پر ذکر آئے گا۔

بنو عباس کا سب سے پہلا خلیفہ ابو العباس سفاح تھا۔ جس کے کئی بھائی اور چچا تھے۔ جنہوں نے انہیں اپنی قوت بڑھانے میں اپنا بازو بنایا سفاح کا پایۂ تخت انبار نام ایک مقام بغداد سے مغرب کی طرف دریائے فرات پر واقع تھا۔ سفاح مرتے وقت تک اسی مقام میں رہا۔ اور اس نے صرف چند سال تک حکومت کی سفاح کے بعد اسکا بھائی ابو جعفر منصور ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ تک خلیفہ رہا۔ ابو جعفر منصور بڑا لبازی عبقری جو عربی ممالک کے نظم ونسق میں اسلام کے مشہور اور بڑے بڑے لوگوں میں گذرا ہے۔ وہ دلیر بھی بے حد تھا۔ اسنے کوفہ کے قریب ایک شہر آباد کر کے اسکا نام ہاشمیہ رکھا تھا۔ جو وقت یہ شہر خوب آباد ہو چکا۔ اتفاق سے اُسے وہاں ایک فرقہ سے لڑائی پیش آ گئی جس کو راوندیہ کہتے تھے۔ اس جنگ کی وجہ سے منصور نے اس شہر کو ناپسند کیا اور اس کی ناپسندیدگی کی ایک اور علت بھی تھی یعنے کوفہ کا قرب منصور کوفہ والوں سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ وہاں کے رہنے والوں نے علی رضؓ اور حسین رضؓ کو شہید کر دیا تھا۔ اسلئے وہ اسکی نظر میں قابل اعتبار نہ تھے پھر منصور ہاشمیہ سے نکل گیا۔ اور اسنے شہر بغداد تعمیر کرایا۔ جو کہ اسلامی سلطنتوں میں سب سے زیادہ مشہور رہے ہے منصور کو معلوم ہوا کہ ابی مسلم کا زندہ رہنا اس کے مرکز کو خطرہ کی حالت میں رکھیگا کیونکہ اور لوگوں کے مقابل میں اُسے بنو عباس کے ہاتھوں سے خلافت کا نکالدینا ویسا ہی آسان تھا جیسا کہ ان کا ان کے قابو میں دیدینا لہذا منصور نے اسے دہوکہ سے قتل کرا دیا۔ اور اس معاملہ میں لوگوں سے یہ عذر پیش کیا کہ میرا سنگ راہ تھا اسلئے میں نے اُسے دفع کر دیا۔ (ہٹا دیا) منصور کا یہ فعل اسی قسم کا تھا جیسا کہ اُسوقت سے گیارہ سو برس بعد محمد علی پاشا خدیو مصر نے مما لیک کے امراء سے اور سلطان محمود روم نے ینگچری سپاہیوں

سے سلوک کیا۔

منصور کا زمانہ شروع سے آخر تک لڑائیوں اور فتوحات ہی میں بسر ہوا۔ منصور کے بعد اسکی اولاد میں سے پے درپے تین شخص اس کے جانشین ہوئے۔ پہلے محمد مہدی دوم موسیٰ ہادی اور پھر تیسرے بمنبر پر ہارون الرشید خلیفہ ہوا۔ ہارون کے بعد اس کا بیٹا امین اور پھر مامون الرشید ابن ہارون الرشید نے مسند خلافت کو زینت دی رشید اور مامون کے عہد میں عباسی حکومت ترقی و عظمت کے اعلےٰ زینہ پر پہنچ گئی اور اس کی قلمرو کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اسی مبارک عہد میں علوم و فنون کا نشو ونما ہوا۔ بہت سی کارآمد کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور دولت و ثروت کے چشمے اسقدر جاری ہوئے جن سے تمام اقلیم سیراب ہو گئی چنانچہ اپنے اپنے موقعہ پر ہم ان تمام باتوں کو مفصل بیان کریں گے۔

اگرچہ منصور نے ابومسلم خراسانی کو محض اس خوف سے قتل کرادیا کہ وہ فارس کا باشندہ ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت میں خود ہی حکمران بننے کا قصد کر بیٹھے تو اس کا تدارک ناممکن ہو جائیگا۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ منصور ہی نے اپنے عہد میں فارس کے بہت سے لوگوں کو اپنے حاشیہ میں معزز عہدوں پر رکھا تھا۔ منصور کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اسی کے طریق عمل پر قدم رکھا۔ اور فارس ہی کے رہنے والوں کو اپنے یہاں کے معزز عہدوں پر مقرر کیا۔ جن مراتب میں سے ایک وزارت کا مرتبہ بھی تھا۔ اور بنو عباس کے عہد میں سب سے بڑا منصب تھا۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید کے زمانہ میں اہل فارس کا زور بہت کچھ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ لوگ جو وزارت پر قابض ہو کر گویا سلطنت کر رہے تھے۔ برامکہ تھے۔ رشید نے یہ دیکھ کر کہ وہ لوگ خلیفہ کے ہوتے ہوئے حکومت کا کاروبار بلا اسکی رائے اور صوابدید کے خود ہی کرنے لگے انکو بالکل نیست و نابود کر ڈالا جسکا قصہ مشہور ہے۔

مامون الرشید کے بعد ۲۱۸ھ میں اسکا جانشین معتصم باللہ خلافت پر قابض ہوا۔ اس خلیفہ نے ترکوں کو اپنی سلطنت میں بڑے بڑے مناصب دیئے اور انہیں سلطنت کی بہت سی خدمتوں پر بکثرت مامور کیا۔ عباسی حکومت کے شروع میں ملک ترکستان کے عاملوں کی جانب سے ترکوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے خلیفہ کے حضور میں نذر کے طور پر پیش ہوا کرتے تھے۔ اور ہر خلیفہ ان غلاموں کی جماعت میں سے حسین اور گرانڈیل جوانوں کو چن کر اپنے حاشیہ کے لوگوں میں بھرتی کرتا رہتا تھا۔ جنکا نام "ممالیک" رکھا جاتا تھا۔

اس کے بعد عباسی خلفاء نے ایسے ترکی غلام بہت کثرت کیساتھ خریدنے شروع کئے اور وہ لوگ ان غلاموں کی کثرت کے لحاظ سے اپنے مقابل فخر کا اظہار کرنے لگے یہانتک کہ معتصم کے زمانہ میں ترکی غلاموں

تعداد ۲ ہزار سے متجاوز ہو گئی ان غلاموں نے مذہب اسلام اختیار کر لیا تھا۔ اور علم ادب سے بھی بہرہ ور ہو چلے تھے جس کی وجہ سے انکی مخفی قوتیں عیاں ہونے لگی تھیں خلفاء نے انکی قابلیت دیکھ کر انہیں حکومت کے بہت سے کاروبار بھی تفویض کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ترکی غلام اپنے اقتدار کے موافق برابر حکومت کے اعلےٰ عہدوں پر ترقی پاتے چلے گئے حتیٰ کہ امارت اور فوجی خدمت کے بلند ترین منصبوں تک جا پہنچے جسکی وجہ سے حکمرانی کی کنجیاں حاصل کرنیکو دوسری قومیں یعنے فارسی اور ترکی باہم نزاع رکھنے لگیں۔ انمیں سے جنکا ہاتھ چڑھ جاتا وہ کوئی نہ کوئی اعلےٰ عہدہ خلیفہ سے حاصل کر لیتا۔

خلیفہ معتصم باللہ عباسی نے ملک مصر میں حوف۔ اشرقیہ اور قہلیہ کے رہنے والوں سے ایک جماعت بنا کر انہیں اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا اور اس کا نام مغربی رکھا تھا۔ انکے علاوہ سمرقند۔ اشروسنہ اور فرغانہ سے بہت سے آدمی اکٹھے کر کے ان کو بھی فوجی خدمت میں رکھا تھا۔ اور انکا نام فراغنہ مقرر کیا تھا۔ جو زیادہ تر اس کے حاشیہ میں رہتے تھے یہ دونوں جماعتیں ان گروہوں کے علاوہ تھیں جو اسکے یہاں خالص عربی فوجوں سے موجود تھے۔ معتصم کے بعد اور خلفاء نے بھی نئے نئے گروہ تیار کئے اور دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنے یہاں رسوخ و اقتدار بخشا جس کے سبب سے سلطنت میں بہت سے مختلف عنصر پیدا ہو گئے اور کام میں دخل دینے والے اجنبی ہاتھ بکثرت ہو گئے نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ خلفاء کمزور ہوتے گئے اور عمال و حکام اپنے اپنے صوبوں اور اقلیموں میں رفتہ رفتہ خود مختار بننے لگے۔ خلفاء کی سلطنت اور حکمرانی کا دائرہ سمٹتے سمٹتے اسقدر تنگ ہوا کہ صرف دجلہ اور فرات کے مابین کا حصہ ملک انکی قلمرو میں داخل رہ گیا۔ اور ابھی چوتھی صدی ہجری شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ یہ قلمرو بھی اُن کے قبضہ اقتدار سے باہر نکل گئی اب محض شہر بغداد خلیفہ کے زیر حکومت تھا۔ اور اسمیں بھی اس کی کامل حکومت نہ تھی۔ چنانچہ نمونہ کے طور پر ہم اسلامی حکومت کے وہ ٹکڑے جو چوتھی صدی ہجری کے پہلے ربع حصہ میں راضی باللہ کے عہد میں ہو چکے تھے ذیل میں دکھاتے ہیں۔

ولایات	انکے حکام
بصرہ (عراق عرب) - - - -	ابن رائق - - - کے قبضہ میں
خوزستان - - - -	بریدی - - - //
فارس - - - -	عماد الدین بن بویہ - - //
کرمان	ابی علی محمد بن الیاس - - //
رے۔ اصفہان اور کوہستان	رکن الدولہ بن بویہ وغیرہ - - //

ولایات	اُنکے حکام
موصل - دیار بکر - مضر اور ربیعہ - -	بنی حمدان - - - کے قبضہ میں
مصر اور شام - - -	اخشید - - //
خراسان اور ماوراء النہر - -	سامانی خاندان والوں - - //
طبرستان اور جرجان - - -	دیلمیوں - - //
بحرین - اور یمامہ - -	قرامطہ - - //

اور جن امور کیوجہ سے معاملات حکمرانی کی صورت زیادہ نازک ہو گئی اُنہیں سے ایک بڑی بات یہ تھی کہ حریم خلافت کے خادموں اور فوجی لوگوں کو قصر خلافت میں مطلق العنانی حاصل ہو گئی تھی اور لوگ وہاں سخت دراز دستیاں اور گستاخیاں کرنے لگے تھے۔ طرح طرح سے خلفاء کی اہانت اور آبرو ریزی کرتے انہیں سخت ایذائیں پہنچاتے جسکی ایک مثال ترکوں اور مغربیوں کی فوج کا وہ سلوک ہے جو اُنہوں نے ۲۵۵ھ میں خلیفہ معتز باللہ عباسی کیساتھ کیا اور اُسے علیحدہ خلافت سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ اُسنے اُنکے انعام واکرام میں کمی کی تھی یہ بیباک سپاہی خلیفہ کے کمرہ میں گھس گئے اور اسکے پیر پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے اُسے گرز دل سے خوب مارا اور اسکا کرتہ وغیرہ پھاڑ ڈالا۔ پھر اُسے جلچلاتی دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر ننگے پیر اور ننگے بدن کھڑا کر دیا بیچارہ خلیفہ گرمی کی شدت سے زمین پر ایک پیر رکھتا تھا۔ اور دوسرا اٹھاتا تھا پھر کچھ سپاہی اُسے تھپڑ مارتے رہے جنکو وہ اپنے ہاتھوں سے روکتا تھا اس ظلم وستم کے بعد اُسے پھر اسکے کمرہ میں داخل کیا اور ابن ابی شوارب قاضی کو اور بہت سے معزز لوگوں کیساتھ بلا کر خلیفہ کی معزولی پر گواہ بنایا اور پھر بھی خلیفہ کو رہا نہ کیا بلکہ اسے ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا جو اسکو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہے تین دن تک اُسے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا اور اسکے بعد اسے ایک تہ خانہ میں ڈالکر اوپر سے پختہ گچ کی ڈاٹ لگا دی جس کے اندر اس مظلوم وستم رسیدہ حکمران نے عالم بیکسی میں جان دی۔

اگرچہ خلفا کی حالت اسقدر ردی ہو گئی تھی کہ ادنے سپاہی تک اُنہیں طرح طرح کے رنج والم پہنچا دیتا تھا لیکن باینہمہ ضعف وخواری فارس والوں ترکوں مغربیوں اور فرغانہ کے باشندوں میں سے کسی کے دلمیں یہ خیال تک نہ آسکا کہ بنی عباس کے قابو سے خلافت کو نکال لیں خیر مذکورہ بالا لوگ تو عجمی الاصل تھے انکو اسکی ہمت نہ ہوئی تو تعجب بھی نہیں لیکن خاص ان اہل عرب کو بھی جو خاندان قریش کے علاوہ تھے۔ اس امر کی جرأت نہ پڑی عباسی خلافت بغداد میں اسوقت تک برابر قائم رہی جبوقت کہ چین کے صحراؤں سے تاتاری قوم نے

آکر اسے فتح کیا ہے اور اسکے خلیفہ کو قتل کیا ہے یہ واقعہ ۶۵۶ھ میں پیش آیا تھا اسوقت خاندان خلیفہ کے لوگ جو تاتاریوں کی بے پناہ تلواروں سے بچے رہے تھے، ملک مصر کو بھاگ گئے اور انہوں نے وہاں کے بادشاہوں کے پاس جو امرا ممالیک کے سلسلہ سے تھے پناہ لی۔ سلاطین مصر نے انہیں بہت اعجاز و اکرام سے اپنے یہاں جگہ دی اور ان کو بدستور خلیفہ سمجھتے اور ویسی ہی عزت و حرمت کرتے رہے یہانتک کہ جس زمانہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم عثمانی نے ملک مصر کو فتح کیا تو اسنے عباسی لوگوں سے خلافت بھی لے لی۔ عباسی خلفا کی تعداد پچاس سے بھی زائد لیکر شخصوں تک پہنچی تھی، جنمیں سے سینتیس ۳۷ لوگ نے خاص عراق میں حکومت کی ان لوگوں میں پہلا شخص سفاح بانی خلافت عباسیہ اور پچھلا شخص معتصم باللہ تھا اور باقیماندہ لوگ مصر میں گذرے لیکن خلفاء مصر محض نام کے خلیفہ ہوتے تھے اور انکا یہ عہدہ اب دینی حیثیت سے قابل احترام تھا ورنہ دنیاوی حکومت سے انہیں کچھ تعلق نہ رہا تھا

اندلس میں اموی حکومت

مسلمانوں میں سب سے پہلے جو شخص اندلس میں داخل ہوئے وہ دو آدمی تھے، پہلا طارق بن زیاد اور دوسرا موسیٰ بن نصیر، ان دونوں نے ۹۲ھ کے زمانہ میں جبکہ ملک شام میں اموی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی، اندلس کو فتح کیا تھا، اور اسوقت سے سلطنت بنو امیہ کے قیام اور اس کے کسیقدر بعد تک بہت سے امیر دں نے خلفاء بنو امیہ کیجانب سے وہاں حکومت کی تھی، بنو عباس کو خلافت ملی تو ابو العباس سفاح نے اموی لوگوں کا اسقدر قتل عام کیا کہ توبہ ہی بھلی، جوان، بوڑھا، عورت، بچہ، جو ملتا وہی بے محابا ہلاک کر دیا جاتا تھا گویا اسوقت بنو امیہ پر پناہ پانے کا دروازہ بند تھا، نتیجہ تمام بنو امیہ قتل ہو چکے تھے۔ مگر ایک نوجوان عبد الرحمن نامی جو معاویہ بن ہشام بن عبد الملک کا بیٹا تھا، کسی طرح بچکر ملک مغرب کو بھاگ گیا تھا، وہاں سے دریا کو عبور کرکے اندلس میں جا پہنچا، ان دنوں اندلس میں عبد الرحمن بن یوسف فہری نامی امیر حکمران تھا، اموی شہزادہ نے اُسے علیحدہ کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور تھوڑے دنوں تک سفاح کے نام کا خطبہ پڑھتا رہا، اسکے بعد عباسیوں نے اُسے معزول کر دیا، جسکے جواب میں عبد الرحمن نے بھی انکا خطبہ پڑھنا بند کرکے ۱۳۸ھ میں خود ہی حکومت کا دعویٰ کر دیا اور قرطبہ کو اندلس کا پایہ تخت قرار دیکر نہایت پر زور سلطنت قائم کر لی، عبد الرحمن کو رکے

بعد ۳۱۶ھ تک بہت سے امیر اس کے جانشین ہوئے جو اپنے تئیں امیر ہی کے لقب سے ملقب کیا کرتے تھے۔
مگر ۳۱۶ھ میں جبکہ اندلس کی حکومت عبدالرحمن سوم کے قبضہ میں آئی اسنے اپنے تئیں خلیفہ کے مشہور نام سے
کیا اور وہ ان خلفاء بنو امیہ میں جو اندلس میں گذرے ہیں سب سے بڑا خلیفہ تھا۔ عبدالرحمن سوم نے کئی مرتبہ
اہل فرنگ سے معرکہ آرائیاں کیں اور انہیں بڑی ہی شکستیں دیں۔ اسکے مرنیکے بعد کئی اور خلیفہ ہوئے لیکن انمیں
ایک بھی اسکا ہمسر نہ ہوسکا۔ پانچویں صدی میں ملک اندلس کئی گروہوں میں منقسم ہوگیا اور ہر گروہ پر ایک علیحدہ
رئیس تھا۔ ان رئیسوں میں سب سے بڑے رئیس عبادیہ تھے۔ جو اشبیلیہ کے عرب تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں
عبادیہ کے ہاتھوں میں اندلس کی عام حکومت آگئی اور چونکہ فرنگ والوں سے جنگ و جدل ہوا کرتی تھی اسلئے ان کو
مغرب کی حکمران اقوام مرابطین سے مدد لینے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کو اپنا شریک کرکے اہل فرنگ کو دفع کریں
مغربی لوگ اندلس میں آئے تو اس ملک کی سرسبزی دیکھ کر خود ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور کچھ
ہی عرصہ کے بعد انہوں نے اسے فتح کرکے اپنی ماتحت ولایت (صوبہ) بنا لیا اسکے بعد پے در پے اندلس
کے ملک پر مختلف حالتیں گذریں۔ جو اسکا زور گھٹاتی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۹۲ء میں اسپر اہل فرنگ
کا پورا تسلط اور مسلمانوں کی حکومت کا وہاں سے کلیتہً خاتمہ ہوگیا۔

اسلامی تاریخ میں اندلس کو بہت کچھ شان و شوکت حاصل ہے اسی کی خاک سے بڑے بڑے علماء
اور اہل کمال شعراء پیدا ہوئے جن کے علوم و فنون اور تصانیف سے آجکل کی متمدن دنیا میں بڑے بڑے فائدے
حاصل کیے جاتے ہیں مسلمانوں نے اس ملک میں بہت سے مدرسے اور کتب خانے قائم کیے عظیم الشان
محل اور عجیب و غریب عمارتیں بنوائیں جن کی تفصیل ہم موقعہ بموقعہ بیان کریں گے۔

مصر میں فاطمی حکومت کا دور

اس حکومت کا نشوونما بلاد مغرب میں ہوا۔ یہ خاندان حضرت جعفر صادق رضؓ کے واسطے سے فاطمہ رضؓ
بنت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیجانب منسوب ہوتا ہے اس گھرانے کے خلفاء میں سب سے اول جو شخص علانیہ
دعوت کیلئے اٹھا وہ عبیداللہ المہدی تھا۔ جسنے تیسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں خلیفہ ہونے کا دعوے
کیا اور اسی لحاظ سے اس سلطنت کو عبیدیہ بھی کہتے ہیں چوتھی صدی ہجری کے وسط میں سپہ سالار جوہر کی ماتحتی

مصر پر بھی ان کی حکومت کا سکہ جم گیا۔ اس سے پہلے ملک مصر عباسیوں کے تصرف میں تھا۔ لیکن جوہر نے اسے فتح کرنے کے بعد بنو فاطمہ کے قبضہ میں دیدیا۔ اور ۳۵۸ھ میں اس پر کامل تسلط کر کے قاہرہ کا عظیم الشان شہر تعمیر کرایا جو آجتک قائم ہے اسکا ابتدائی نام "قاہرہ معزیہ" رکھا گیا تھا۔ جسکی نسبت خلفاء بنو فاطمہ میں سب سے اول ملک مصر میں آنیوالے خلیفۃ المعز لدین اللہ کیجانب کیگئی تھی۔ معز لدین اللہ کے بعد اسکے کئی جانشین حکمران ہوئے اور جنہوں نے نوبت بہ نوبت بہت استقلال کے ساتھ فرمانروائی کی۔ یہاں تک کہ ان کو بھی اسی بلا میں مبتلا ہونا پڑا۔ جسمیں خلفائے بنی عباس غیر قوموں مثلاً کردوں اور ترکوں کو دخیل کار بنانے سے مبتلا ہو چکے تھے۔ بنی فاطمہ کے بعد ۵۶۷ھ میں مصر کی حکومت مشہور سلطان صلاح الدین ایوبی کے قابو میں آگئی حکومت بنی فاطمہ کی بہت بڑی بڑی یادگاریں اب تک ملک مصر میں موجود ہیں جو زبان حال سے اپنے بانیوں کا جاہ و جلال ظاہر کر رہی ہیں ان یادگاروں میں سے ایک تو خود قاہرہ کا شاندار شہر ہے اور ازہر کی یونیورسٹی بھی بہت بڑی یادگار ہے صلاح الدین کے بعد اس کے بیٹے اور بھائیوں نے بھی عرصہ تک مصر پر حکمرانی کی اور اس خاندان کے زوال پذیر ہونے پر سلاطین مما لک کا دور دورہ رہا۔ یہانتک کہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم خان عثمانی نے مصر کو فتح کیا۔

جسقدر اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اگر ہم ان سب کو ایک ایک کر کے گنائیں تو بہت طوالت ہو جائیگی۔ لہذا اسوقت انکا مختصر ذکر کافی ہوگا۔ ہمنے سال چہارم کے الھلال نمبر ۲ میں ایک جدول شائع کی تھی جسمیں تمام اسلامی سلطنتوں کا بیان کر دیا تھا۔ ان کے دار السلطنتوں اور حکمرانوں کی تعداد مدت حکمرانی اور سنہ جلوس و وفات بھی ذکر کر دی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آغاز اسلام سے اسوقت تک جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان کی کل تعداد (۱۰۴) ہے اور ان کے حکمرانوں کی مجموعی تعداد (۱۱۹۵) جنمیں خلفاء سلاطین۔ ملوک۔ امرا۔ آتابکہ۔ خشیدیہ۔ خدیوی لوگ شرفا۔ بائیہ لوگ۔ اور دائہ لوگ وغیرہ سب شامل ہیں۔ خواہ وہ اہل عرب سے ہوئے ہوں، یا فارسیوں، ترکوں، چرکسوں، کردوں، ہندیوں، تاتاریوں، منگولوں، اور افغانوں، وغیرہ میں سے، اور ان کے پائہ تخت حسب ذیل مقامات رہ چکے ہیں

مدینہ، کوفہ، شام، بغداد، مصر، قیروان، قرطبہ، آستانہ، صنعا، عمان، اور دہلی وغیرہ۔

اسلامی تمدن کی تاریخ جو آگے چل کر بیان ہوگی اس کی تمہید میں اس مقام تک تاریخی مقدمات لکھے گئے جن سے اسلامی حکومت کی بنیاد پڑنے اور اسلامی تمدن کے نشو و نما پانے کا حال کھلیگا یہ بات تو دیکھ ہی لی گئی ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی حکومتیں قائم کیں، جو مختلف زمانوں تک تمدن کا رنگ دکھاتی رہیں

مگر چونکہ عباسی حکومت ان سب بہدوں میں بہت مشہور اور حصول تمدن کے اختیار کرنیمیں ان سب پر فوقیت رکھتی تھی، لہذا اگلے بیان میں ہم اکثر و بیشتر وہی امور بیان کریں گے جو عباسی سلطنت کے ساتھ مخصوص تھے اور جنہیں اسلامی تمدن میں خاص فوقیت حاصل ہے۔

اسلامی حکومت اور اسکی مردم شماری

پچھلے واقعات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کی تعداد دہائیوں سے اوپر نہیں ہوئی تھی اور مدینہ کی شہر پناہ سے باہر کی زمینیں بھی ان کے ملک میں نہیں تھیں اور صحابہ کے علاوہ ہر شخص ان کا دشمن تھا۔ ایسی حالت اور ۱ھ میں "مدینہ" کے اندر اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی اس سلطنت کی حدود "یثرب" اور اسکے بعض مقامات سے گھری ہوئی تھیں۔ ان دنوں دارالامارۃ اور دارالقضاء مسجد نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) تھی یا نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا حجرہ یا صحابہؓ کے مکانات تھے تک اسکی یہی حالت رہی جس کے بعد مسلمانوں نے بنی نضیر کی اراضیاں بھی اسپر اضافہ کردیں اور اس کے بعد آخر اسی برس میں "خیبر" کی سرزمین بھی اسلامی قلمرو میں داخل ہوگئی۔ اور زمانہ مابعد میں رفتہ رفتہ مقامات فدک وادی القریٰ اور تیماء بھی مملکت شام میں شامل ہوگئے۔ اسکے بعد مسلمانوں نے مکہ کو فتح کیا۔ اور اسی کے ضمن میں پے درپے مقامات طائف، تبالہ، اور جرش، پر بھی قبضہ کرلیا۔ بعد ازاں شمالی سمت میں تبوک اور ایلہ تک اور جنوبی جانب میں نجران، یمن، عمان، بحرین اور یمامہ تک پے درپے فتوحات حاصل کرتے ہوئے اسلامی حدود ملک کو ترقی دیتے گئے۔

سنہ ۱۱ھ میں جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا سے رحلت فرمائی، اسوقت اسلام کی سطوت تمام جزیرہ عرب پر سایہ ڈال چکی تھی اور خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی مملکت کو شمالی سمت میں تبوک اور ایلہ سے لے کر جنوب میں سواحل یمن تک اور مشرق کیطرف خلیج فارس سے شروع ہو کر مغربی سمت میں بحر قلزم تک وسیع دیکھ لیا تھا۔

ابوبکرؓ حکمران ہوئے اور مرتدین کے جھگڑے سے فراغت پائی تو انہوں نے عراق اور شام کو فتح کرنے کیلئے فوجیں روانہ کیں اور عمر بن الخطابؓ نے ان دونوں ملکوں کی فتح کا اتمام کیا جس کے ساتھ ہی مصر کو بھی قبضہ میں لے آئے اسلامی فتوحات کا زیادہ تر حصہ صرف انہیں خلیفہ دوم کے ہاتھوں انجام پایا عمرؓ کے جانشین

عثمان ہوئے اور انہوں نے بھی کئی جدید ممالک فتح کئے لیکن اُن کے شہید ہونے کے بعد مسلمان لوگ فتوحات سے غافل ہو کر اس باہمی فساد میں مبتلا ہو گئے جو عثمان رض کے قتل کئے جانے کے بعد انمیں پھوٹ پڑا تھا یہاں تک کہ جب وقت خلفائے راشدین کا مبارک عہد ختم ہو گیا، تو معاویہ رض نے عنان خلافت اپنے ہاتھ میں لی اس زمانہ میں مصر، شام، نوبہ، افریقیہ، عراق، فارس، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان، طبرستان اور اہواز وغیرہ ممالک پر اسلامی پھریرا اُڑ رہا تھا،

خلیفہ کا قیام مدینہ (یا کوفہ) میں رہا کرتا تھا، اور وہ اپنے عاملوں کو ولایتوں کی جانب بھیجا کرتا تھا، اس زمانہ میں اسلامی مملکت کا سب سے بڑا صوبہ ملک شام تھا، جس کے ماتحت حمص، قنسرین، اردن، فلسطین، اور سرحدوں کے اخبار (چھاونیاں) تھے اس کے بعد عراق کا ملک تھا، جس کا سب سے بڑا صوبہ سواد کا علاقہ تھا یعنی وہ خطہ زمین جو دجلہ اور فرات کے مابین واقع ہے اور اسکا پایۂ تخت کوفہ تھا، جو نہر فرات کے کنارہ پر ایک عظیم الشان شہر ہے سواد کے علاوہ بصرہ، قرقیسیہ، رے، اصفہان، نہاوند، آذربائیجان حلوان، حمدان، اور ماذوان وغیرہ بھی علیحدہ علیحدہ صوبے تھے، عرب کے صوبے مکہ، طائف، عمان، بحرین اور صنعا تھے، اور براعظم افریقیہ میں مصر مع اپنے ماتحت مقامات افریقیہ کے مثلاً بارا و مغرب اور نوبہ جو وادی نیل کی ملحقہ میں ہیں ایک جداگانہ ملک تھا، خلفاء کا قاعدہ تھا، کہ ملک شام کے سوا اور مقامات پر اپنی طرف سے براہ راست مدینہ ہی سے عامل مقرر کرکے بھیجا کرتے تھے اور ملک شام کا عامل خود دمشق میں رہتا تھا اور اپنی ماتحت ولایتوں اور چھاونیوں میں اپنی طرف سے عاملوں کا تقرر کرتا تھا، مصر کے عامل کا بھی ایسا دستور تھا کیونکہ اکثر حالتوں میں وہ اپنے ہی حکم سے افریقہ اور نوبہ میں عاملوں کا تقرر کرتا تھا،

عمر بن الخطاب رض کے زمانہ میں معاویہ بن سفیان رض ملک شام کے عامل بنائے گئے انکی امارت خلفائے راشدین کے آخری زمانہ تک برابر قائم رہی اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو خلیفہ بنا کر مرکز خلافت دمشق میں منتقل کر لیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، عرب کے تمام ملک نے معاویہ کی بیعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وہاں کے رہنے والے علی رض اور انکی اولاد کی بیعت پر قائم رہے تھے حسین رض کے شہید ہو جانے کے بعد یہ جزیرہ بنو امیہ کے قابو میں نہیں آیا، بلکہ عبداللہ بن زبیر کے زیر اثر رہا، یہانتک کہ حجاج بن یوسف ثقفی نے عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت یعنی ۷۲ھ میں انکو قتل کر ڈالا جس کے بعد سے یہ جزیرہ بھی بنو امیہ کی سلطنت میں شامل ہو گیا،

بنی امیہ کے زمانہ میں اسلامی قلمرو بتدریج ہوتی [illegible] مغرب کی جانب اندلس اور تمام مغرب

ملک کو فتح کر لیا تھا بنی امیہ سپین کی طرف سے یورپ میں داخل ہوئے اور بڑھتے چلے گئے یہاں تک
کہ انہوں نے کوہ پرینیز کو عبور کر کے مملکت فرانس پر حملے کئے اور اسمیں جا داخل ہوئے اہل عرب فرانس کے
ملک میں بڑھتے بڑھتے سنہ ۱۱۴ھ میں دریائے رون تک پہنچ گئے تھے۔ اہل فرنگ غنیم کی چیرہ دستی دیکھ کر
کانپ اٹھے انہیں خوف پیدا ہوا کہ مبادا ہم کو بھی وہی روز بد دیکھنا نصیب ہو جو سپین کو دیکھنا پڑا ہے
لہذا انہوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اہل عرب کی مدافعت میں زور لگایا۔ اور فریقین میں تورس اور
پواٹیرز کے مابین کئی سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں اور کئی دنوں تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں لڑائی کی صورت
تذبذب رہی کبھی اہل عرب کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ اور کبھی فرانس والے غالب آجاتے تھے۔ اس جنگ کے
حالات میں بجز چند مختصر اشارات کے اور کوئی تفصیلی امور نہیں بیان کئے گئے ہیں ہاں اہل فرنگ نے خود ان واقعات
کا مفصل حال لکھا ہے بموقعہ بموقعہ اہل عرب کی دلیری اور ہمت پر ظاہر کیا ہے اور اسکے معترف ہوئے ہیں یہ
جنگ مشہور فرانسیسی سپہ سالار "شارل مارٹل" کے عہد میں ہوئی تھی جو کہ امپرور شارلمین کا دادا تھا۔ فرانس کے
مورخوں نے بہت سی ہولناک لڑائیوں کا ذکر کیا ہے جو مذکورہ بالا شارل اور اہل عرب کے مابین ۷۳۲ء
میں ہوئیں اور اہل عرب کے سپین کی جانب پسپا ہونے اور ان کے سپہ سالار عبدالرحمن کے شہید ہونے
پر ختم ہوئیں تاریخ ابن اثیر میں لکھا ہے کہ اندلس کا امیر عبدالرحمن بن عبداللہ غافقی سنہ ۱۱۴ھ (قریباً
سنہ ۷۳۲ عیسوی) میں ممالک فرنگ کی طرف جہاد کرتا ہوا بڑھا تھا مگر وہ معہ اپنے ساتھی مجاہدین کے شہید ہوا
اس لئے زیادہ راجح خیال یہی ہوتا ہے کہ شارل مارٹل مذکور نے اسی فوج سے جنگ کی تھی۔

اس بارہ میں جو باتیں اعتبار اور تامل کی مقتضی ہیں منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر
اہل عرب اس لڑائی میں کامیاب ہو جاتے تو اسمیں کلام نہیں ہو سکتا کہ فرانس میں اسلام پھیل گیا ہوتا اور
اس کے بعد تمام یورپ میں اس کی اشاعت ہو کر رہتی کیونکہ ان دنوں اہل فرانس ہی یورپ بھر میں
سب سے زیادہ عربوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تمام عالم اسلامی اور براعظم
ایشیا و افریقیہ کے اکثر حصوں کے باشندوں کی زبان عربی سننے میں آتی ہے ویسے ہی آج براعظم
یورپ کے رہنے والوں کی بھی زبان عربی ہی ہوتی۔ لیکن خداوند پاک کی حکمتیں جو اس نے اپنی مخلوقات
میں رکھی ہیں ایسی ہیں جن کو انسانی عقلیں نہیں پا سکتیں خدا جانے اہل عرب کی اس ناکامیابی میں
کیا راز تھا۔

شارل مارٹل کی لڑائی عربوں کیساتھ تورس اور بواکیتہ کے بین



اموی خلیفوں کی فتوحات کا سلسلہ بلاد فارس، اس کے بعد خراسان اور پھر دیگر ممالک میں جاری رہا، یہاں تک کہ وہ ہندوستان کی حدود تک پہنچ کر رک گیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اسلامی [illegible] کی جو تقسیم تھی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ شام (اسکے چار صوبے یا کمشنریاں تھیں)
۲۔ کوفہ،
۳۔ بصرہ کہ فارس سجستان بحرین اور عمان پر مشتمل تھا،
۴۔ آرمینیا،
۵۔ مکہ،
۶۔ مدینہ،
۷۔ افریقیہ،
۸۔ مصر،
۹۔ یمن،
۱۰ خراسان۔

اور جس وقت خلافت بنو عباس کے ہاتھوں میں پہنچی ہے۔ اسوقت ولایات (صوبجات) کی ترتیب مندرجہ ذیل صورت پر ہو گئی تھی۔

۱۔ کوفہ اور سواد، ۲۔ ابصرہ اور مہرجان قباد، کنارہ دجلہ تک اور وہ حصہ ملک جو دجلہ کے اس پار بحرین اس کے بعد عمان تک چلا گیا ہے، ۳۔ حجاز اور یمامہ، ۴۔ یمن، ۵۔ اہواز، خوزستان اور سوزیانا،

۶ فارس، ۷ خراسان، ۸ موصل، ۹ جزیرہ (مابین النہرین اور آذربائیجان و ارمینیا) ۱۰ شام ۱۱ مصر اور افریقیہ ۱۲ ملک سندھ ـ حدود ہند میں، ۱۳ اندلس،

عباسیوں کے عہد میں مملکت اسلامی کا دائرہ بہت کچھ وسیع ہوا یہانتک کہ عہد اسلام میں آجتک جتنی وسعت اسلامی قلمرو کو حاصل ہوئی ہے وہ سب سے زیادہ اُن کے عہد میں تھی اسکا کچھہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بعض بعض صوبے عباسیوں کی حکمرانی سے خارج ہو کر خود مختار بن گئے تھے، مثلاً اندلس جبکہ بنو اُمیہ اس کے مالک بن بیٹھے یا کچھہ دوسرے صوبے خودسر ہوگئے، مثلاً طاہری سامانی، اغلبی اور طولونی وغیرہ حکومتیں اگرچہ خودسر حکمران تھے لیکن سب لوگ خطبہ عباسی خلیفہ کا ہی پڑہتے تھے، ایک اُندلس تو ضرور اس کلیہ سے خارج تھا مگر ہمارے خیال میں خواہ کتنی ہی جداگانہ حکومتیں کیوں نہ رہی ہوں پھر بھی اسلامی سلطنت تو بہرحال تھی، اور مسلمان لوگ اسپر حکمران عباسی مملکت کی حدود شمال میں ترکستان کے بالائی حصہ تک ایشیا میں اور کوہستان پرینیز تک سپین میں جنوب میں بحر عرب ـ بحر اعظم ہندوستان اور صحرائے افریقیہ تک مشرق میں ملک سندھ اور پنجاب تک ملک ہندوستان میں اور مغرب میں اطلانطک اوشن تک پھیلی ہوئی تھیں اور اسکا رقبہ یورپ کے رقبہ سے دوگنا تھا،

اس وسیع سلطنت کی عظمت کا بیان کرنے کیلئے ہم پہلے اس کے صوبوں کے نام ذیل میں لکھتے ہیں اور بعد ازاں مقدار بیان کریں گے،

۱	سواد	۱۱	بصرہ	۲۲	جرجان	۳۳	دیار مضر
۲	اہواز	۱۲	ہمدان	۲۳	طبرستان	۳۴	طریق فرات
۳	فارس	۱۳	ماسیذان	۲۴	تکریت	۳۵	قنسرین اور عواصم
۴	کرمان	۱۴	مہرجان قذق	۲۵	شہر زور	۳۶	حمص
۵	مکران	۱۵	ایغارین	۲۶	صامغان	۳۷	دمشق
۶	اصفہان	۱۶	قم اور کاذان	۲۷	موصل	۳۸	اردان
۷	سجستان	۱۷	آذربائیجان	۲۸	دیار ربیعہ	۳۹	فلسطین
۸	خراسان	۱۸	رے	۲۹	ازرن اور میافارقین	۴۰	مصر
۹	حلوان	۱۹	قزوین	۳۰	طرون	۴۱	حرمین
۱۰	کوفہ	۲۰	زنجان	۳۱	اربینیا	۴۲	یمن
		۲۱	قومس	۳۲	آمد	۴۳	یمامہ اور بحرین
						۴۴	عمان

عباسی مملکت اسلامیہ کے اتنے صوبے تھے اور یہ اندلس کی سلطنت سے علاوہ ہیں جسکے حکمران بنی امیہ تھے اندلس کی اموی حکومت عباسی سلطنت کی ہمعصر تھی اور اس نے بحر متوسط کے کئی جزیرے مثلاً سسلی اور مالٹا وغیرہ بھی فتح کر لئے تھے؛ مذکورہ بالا صوبجات میں سے ہر ایک صوبہ کا ایک والی (گورنر) یا عامل (حاکم) ہوا کرتا جسے خلیفہ یا اُس کا وزیر یا نائب مقرر کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا؛ لہذا ان اعمال کی جنہیں آجکل صوبے کہتے ہیں؛ کل تعداد ۴۰ صوبے تک پہنچی تھی؛ اور ہر ایک صوبہ کا ایک خزانہ (بیت المال) ایک دیوان خراج اور ایک اس سے زائد قاضی ہوتا تھا؛ اس سلطنت کے رہنے والے لوگ اس زمانہ کی متمدن قوموں میں سب سے بڑھے ہوئے تھے؛ جنمیں عرب؛ اہل فارس؛ ترک؛ مغل؛ کرد؛ تاتاری؛ افغان؛ ہنود؛ ارمن؛ سریان؛ کلدان؛ روم؛ گاتھ؛ قبطی؛ نوبی؛ اور بربری وغیرہ قومیں شامل تھیں؛ اور عربی؛ فارسی؛ پہلوی؛ ہندی؛ رومی؛ سریانی؛ ترکی؛ کردی؛ ارمنی؛ قبطی؛ اور بربری وغیرہ زبانیں بولی جاتی تھیں ان باشندوں میں سے بعض اس قسم کے تھے کہ ان کی اصلی زبان بالکل نیست و نابود ہو کر عربی انکی مادری زبان بنگئی تھی؛ جیسے شام مصر اور مغرب و عراق کے رہنے والے لوگ اور بعض ایسے تھے کہ ان کی اصلی زبانوں میں عربی زبان کے الفاظ کثرت کے ساتھ مل جل گئے تھے؛ مثلاً فارس والے؛ ترکستانی؛ ہندوستانی اور افغان وغیرہ اور آجتک ایشیا کی بہت سی قومیں اس عظیم الشان تمدن کا اثر سے اپنی زبانوں کو عربی خط میں لکھتی ہیں؛

اسلامی قلمرو کی مردم شماری

اس موقعہ پر ہم کو اس سلطنت کی ان دنوں کی مردم شماری پر غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر یہ بات ہماری طاقت سے ہے ذرا بالاتر؛ کیونکہ اہل عرب کو اپنی مملکت کے رہنے والوں کی مردم شماری کا ذرا خیال نہ تھا۔ البتہ ہم ان صوبوں کی آجکل کی مردم شماری پر غور کرتے ہیں اور ان اعداد کو ان مقامات کے مقابل لکھ کر اسبات کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ مقامات کس حکومت کے ماتحت ہیں اسکے بعد ہم اسکی آجکل حالت کا اس زمانہ کی حالت سے مقابلہ کریں گے:۔

ملکوں کے نام	آجکل کس حکومت کے ماتحت ہیں	ان کی آبادی کا حال
تمام ملک ایران؛	شاہ عجم	۹۰۰۰۰۰۰
افغانستان؛	خود مختار	۴۰۰۰۰۰۰
بلوچستان؛	انگلستان	۵۰۰۰۰۰
سندھ؛	"	۳۰۰۰۰۰۰

ملکوں کے نام	آجکل کس حکومت کے ماتحت ہیں	انکی آبادی حال
ترکستان	روس	۴۰۰۰۰۰۰
کارکیشیا (قوقاسیا)	〃	۵۰۰۰۰۰۰
آرمینیا اور کردستان	ٹرکی	۲۵۰۰۰۰۰
عراق، جزیرہ	〃	۲۵۰۰۰۰۰
شام، فلسطین	〃	۲۷۱۱۰۰۰
جزیرہ عرب	〃	۵۰۰۰۰۰۰
مماک مصر	〃	۱۰۰۰۰۰۰۰
نوبیہ اور کچھ حصہ سوڈان کا	سوڈان[1]	۱۰۰۰۰۰۰
طرابلس الغرب	ٹرکی	۱۰۰۰۰۰۰
جزائر غرب	فرانس	۴۴۲۹۰۰۰
ٹیونس	〃	۱۵۰۰۰۰۰
مراکو	خود مختار	۹۰۰۰۰۰۰
سپین	〃	۱۷۰۰۰۰۰۰
قبرس	انگلستان	۲۰۹۰۰۰
کریٹ	ٹرکی	۲۹۴۰۰۰
میزان کل		۷۲۶۴۳۰۰۰

یہ تو آج ان ملکوں کی مردم شماری ہے مگر بہت سے ایسے اسلامی شہر ہیں جو اسوقت بمقابلہ اس حالت کے جو انہیں اسلامی عہد حکومت میں حاصل تھی گویا بالکل ویران اور تباہ ہو چکے ہیں، درحقیقت ملک عراق یادہ حصہ جو سواد کے نام سے مشہور ہے اور اسمیں بھی مخصوص طور پر بغداد، بصرہ، کوفہ، اور تمام ملک عراق کے شہر اصطخری نے شہر بصرہ کی ایسی حالت بیان کی ہے جسے مطالعہ کرنے سے عقل چکرا جاتی ہے، ہم اس زرین زمانہ میں ملک عراق کی حالت کا نقشہ کھینچنے کی غرض سے اس عبارت کو ذیل میں درج کرتے ہیں:-

[1] جس کی ایک عظیم الشان اسلامی حکومت کا حال ہی میں خاتمہ ہوا ہے، یعنے سلطان سکوٹو کے مقبوضات کو سرکار انگلیشیہ نے فتح کر لیا۔

بصرہ ایک بہت بڑا شہر ہے جو اہل عجم کے زمانہ میں نہ تھا۔ اُسے صرف اہل عرب نے آباد کیا تھا اس میں کوئیں وغیرہ کا پانی نہیں ملتا بلکہ نہریں ہی نہریں ہیں۔ بعض اہل اخبار نے لکھا ہے کہ بلال بن ابی بردہ کے زمانہ میں بصرہ کی نہروں کا شمار کیا گیا تھا تو ایک لاکھ بیس ہزار نہروں سے زائد نکلی تھیں جن میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلا کرتی تھیں مجھ کو اس مذکورہ تعداد کے سچ ماننے میں کلام تھا یہاں تک کہ میں نے خود ان مقامات کو جا کر دیکھا پس بسا اوقات صرف ایک تیر پرتاب کی مسافت میں کئی چھوٹی چھوٹی نہریں دیکھیں جن میں چھوٹی کشتیاں چلتی تھیں اور ہر ایک نہر کا ایک نام تھا جس کے ساتھ یا تو وہ اپنے کھدوانے والے کیطرف منسوب ہوتی تھی یا اس سمت کی جانب جدھر کو بہ کر وہ گرتی تھی پھر میں نے اپنے دل میں تجویز کی کہ یہ نہر اسقدر مسافت کے طول و عرض میں رہی ہوگی۔ لہذا اب آپ اس مسافت کا قیاس کر لیں جس میں (۱۲۰۰۰۰) نہریں یا نالیاں کھد سکتی ہیں کہ وہ کسقدر ہوگی اور اسکے اندر رہنے والوں کی تعداد کتنی ہو سکتی ہے۔

یہ حالت تو بصرہ کی تھی۔ اب بغداد کیطرف توجہ کیجئے جو کہ دار الخلافت اور دار السلام تھا۔ اسکی حالت کا بھی اصطخری نے ان الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے جیسا کہ خود اس نے اپنے زمانہ ہجری کی چوتھی صدی میں معائنہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔ "وتفترش[1] قصور الخلافة وبساتينها من بغداد الى نهر بين فرسخين على جدار واحد حتى تتصل من نهر بين الى شط دجلة ثم يتصل البناء بدار الخلافة مرتفعاً على دجلة الى الشماسية نحو خمسة اميال ويحاذي الشماسية في الجانب الغربي الحربية فيمتد نازلاً على دجلة الى آخر الكرخ الخ" پھر لکھتا ہے:۔ "وبين بغداد والكوفة (ای بين دجلة والفرات) سواد مشتبك غير مميز تخترق اليه انهار من الفرات" اس کے بعد ان نہروں کی تعداد لکھی ہے۔ جو دجلہ سے نکال کر فرات میں گرائی گئی تھیں۔

پس خیال کرنا چاہئے کہ مذکورہ بالا آبادی کا اس حالت سے کب مقابلہ ہو سکتا ہے جو آجکل بغداد کی ہے اس لئے

---

[1] دار الخلافت کے محلات اور باغات بغداد سے نہر بین کی طرف ایک قطار میں دو فرسخ تک برابر چلے گئے ہیں حتے کہ نہر بین پر جا کر وہاں سے سیدھے دجلہ کے کنارے پھر یہ عمارتیں اوپر کو ہوتی ہوئی شماسیہ کی طرف جو قریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہے دار الخلافت سے جا ملتی ہیں۔ اور شماسیہ مغرب کی طرف مقام حربیہ کے محاذ میں واقع ہے پھر یہ بستی دجلہ کی طرف اترتی ہوئی کرخ کے پچھلے سرے تک پھیلتی چلی گئی ہے اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اور بغداد و کوفہ (یا دجلہ و فرات) کے درمیان بڑی گنجان آبادی ہے جس میں کچھ تمیز نہیں ہوتی اور دریائے فرات سے پھوٹ کر بہت سی نہریں اس کی طرف آتی اور سیراب کرتی ہیں۔

کہ موجودہ حالت میں تمام ولائیت بصرہ کی مردم شماری ۲۰۰۰۰۰ ہے اور ولائت بغداد کی مردم شماری ۸۵۰۰۰۰
ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں ولائیتوں کی موجودہ مردم شماری اس تعداد سے کہیں کم ہے جو اس زمانہ میں اکیلے
شہر بغداد کی آبادی رہی ہوگی، اور اسی امر پر دمشق وغیرہ ممالک اسلام کے بڑے بڑے شہروں کا اندازہ کرلو
جو ان دنوں نہایت کمزور حالت میں ہیں۔ اور اس موقعہ پر چند اور شہر بھی تھے، جو آج اسم بلامسمی رہ گئے ہیں
جیسے مصر میں فسطاط، عراق میں کوفہ، افریقہ میں قیروان، اور حوران میں بصرہ وغیرہ جن کے ذکر کا یہاں
موقع بھی نہیں ہے، باقی رہا ملک مصر اس کی بابت مورخین عرب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت مسلمانوں
نے اُسے فتح کیا ہے، تو وہاں کے رہنے والوں میں سے صرف مردوں کی تعداد نوجوانوں سے لیکر ادھیڑ عمر والوں تک
(جنمیں کوئی عورت بچہ۔ بوڑھا شامل نہ تھا) اسی لاکھ تھی، صرف اسکندریہ میں ۳۰۰۰۰۰ آدمی تھے لہذا اگر ہم
اسی تعداد پر عورتوں، بچوں، اور بوڑھوں کی تعداد کا اضافہ کردیں تو کل تعداد ۳۰۰۰۰۰۰۰ سے بڑھ جائیگی اور یہ تعداد
اُسی ملک کے آجکل کے باشندوں کی تعداد سے دگنی ہے، گو اس روائت کے صحیح ہونے میں کلام بھی کیا جاتا ہے، لیکن
مورخین عرب کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں مصر کی حالت بہت اچھی تھی، اور وہاں کی زرخیزی و ارزانی
قابل تعجب جسکی وجہ سے اس کی آبادی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مقریزی کا بیان ہے کہ ۱۰۵ھ میں ہشام بن
عبدالملک نے اپنے عامل عبیداللہ بن الحجاب کو جو مصر کا خراج وصول کرنے پر متعین تھا، حکم دیا کہ ملک مصر کی پیمائش
کرے اُسنے بذات خاص اس کی پیمائش کی تو اس کی صرف ان زمین مزروعہ کا رقبہ جو دریائے نیل سے سیراب
ہوتی تھی ۳۰۰۰۰۰۰ فدان نکلا، یہ رقبہ آجکل کی زیر کاشت زمین سے دگنا ہے باوجودیکہ حکومت مصر اسوقت
اراضی کی سرسبزی اور زرخیزی کے باب میں بہت کچھ توجہ سے کام لے رہی ہے، اور جسوقت ممکن ہوتا ہے اسکی
آبادی میں کوشش کرتی ہے، اسپر بھی وادی نیل کی زیر کاشت زمین ساٹھ لاکھ فدان سے کہیں کم ہے، اور تمام وادی نیل
کی ساحت یعنی وجہ بحری اور صعید دریائے نیل کے دونوں سمت کی زمین چھ ملین فدان سے کچھ ہی زائد ہے اسلئے
امر محال معلوم ہوتا ہے کہ آغاز اسلام میں وادی نیل کی مساحت اس سے دگنی رہی ہو۔ لیکن یہ بات خیال میں آتی ہے
کہ اہل عرب نے اس خطہ کو بھی جو اس وادی کے جانب شرق بحر احمر کے قریب تک چلا گیا ہے اور وہ خطہ بھی جو اسی
کی غربی سمت میں وادی نطرون تک پھیلا ہوا ہے کاشت میں لے لیا ہو، کیونکہ مع اس زمین کی جسمیں نخلستان
لگے ہیں اور وہ صحرائے لیبیا میں واقع ہے اور دریائے نیل اور بحر احمر کے مابین والی زمین اور بحر احمر سے لیکر بحر روم
کے مابین کا وہ حصہ اراضی جو عریش تک ہے، اس تمام خطہ کی ساحت چار لاکھ مربع میل سے بڑھ جائیگی اور چار لاکھ مربع میل

مربع ایک سو تاسی ملین فدان کے برابر ہوتے ہیں اتنا معلوم ہو جانے کے بعد یہ کچھ تعجب خیز امر نہ ہو گا کہ اس قدر وسیع خطہ میں سے تین ملین فدان زمین زیر کاشت رہی ہو، اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ وہاں کے باشندوں کی تعداد تیس ملین سے کم نہ ہو۔

ہمارے اس قول کی تائید ان بات سے ہوتی ہے کہ مورخین عرب ملک مصر کی مساحت قریب قریب اتنی ہی بیان کرتے ہیں جتنی کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مقریزی لکھتا ہے۔ ملک مصر کی سرزمین کی آخری حالت جس کا اعتبار کیا گیا حسب ذیل تھی، اس کی مدت کاشت ساٹھ دن تھی اور زمین کی مساحت ۱۰۰۰۰۰۰۰ فدان جس میں ابن المدبر کے زیر نگرانی و اہتمام تیسری صدی ہجری کے وسط میں ۲۴۰۰۰۰۰ فدان زمین مزروعہ تھی اور اس میں کلام نہیں کہ جب تک اس زمین میں ۴۸۰۰۰ کسان ہمیشہ تردد نہ کرتے رہیں اس کا خراج پورا نہیں ہوتا۔۔۔ الخ

اسی قسم کی آبادی ان بڑے بڑے اسلامی شہروں کو بھی سمجھنی چاہیئے جو اپنے اپنے ملک کے صدر مقام تھے جیسے اندلس میں قرطبہ۔ غرناطہ اور طلیطلہ اور عراق و شام کے بے شمار بلاد جو اس زمانہ میں عظیم الشان شہر تھے اور آج چھوٹے چھوٹے گاؤں رہ گئے ہیں۔

لہذا اگر ہم تمام ان باتوں کو پیش نظر رکھیں جنہیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں تو یہ امر بعید از قیاس نہ ہو گا کہ ممالک اسلامی کی مردم شماری اس کے عروج کی حالت میں بیس کروڑ سے لے کر پچیس کروڑ تک رہی ہو اور یہ تعداد تمام یورپ کی آبادی کے قریب بہ تقریب برابر ہے۔ چنانچہ سلطنت اسلام کی دولتمندی کا بیان کرتے ہوئے پھر کہیں اس کا تذکرہ کریں گے۔

اسلامی سلطنت کے امور مملکت

اسلامی حکومت

اسلامی حکومت کا سنہ ۱ ہجری میں مدینہ کے اندر آغاز ہوا ان دنوں مسلمان صرف صحابہ تھے جن کی تعداد چند ہائیوں سے زیادہ نہ تھی، انہیں سے کچھ مہاجر تھے اور تھوڑے سے انصار، اسلیے انہوں نے اسلامی حکومت کی بنیاد مساوات۔ برادرانہ برتاؤ اور ایکدوسرے کی مدد کرتے رہنے پر رکھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کے بین بھائی چارے کی رسم قائم کی تھی اور اس رشتہ برادری کی مضبوطی یوں فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کا مال اور ان کے کاروبار ایک کر دیئے تھے۔ جیسا اس کے قول من ترک کلا[1]

[1] جس نے کسی قسم کا بوجھ (یعنی قرضہ وغیرہ) چھوڑا وہ ہمارے ذمہ ہے جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے۔

قالینا و من ترک مالاً فلورثتہ" سے استدلال کیا جا سکتا ہے اسطرح پر تمام لوگوں کے کاروبار کا ایک کر دینا اتحاد کی زیادتی کا موجب تھا" اور ان دنوں حکومت کے تمام کاروبار صرف نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پر منحصر تھے " حکومت" " انتظام ملک" اور "دین" صرف یہی تین اسوقت حکومت اسلامی کے کاروبار تھے چنانچہ مسلمانوں نے سب سے پہلے نماز۔ زکوٰۃ اور اس کے علاوہ اور اسی قسم کی باتیں اپنے اوپر فرض قرار دیں جو دینداری کی قسم سے شمار ہوتی ہیں ہم ان میں سے صرف اسی ایک پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو ایک حکومت کے قیام میں دخل رکھتا ہے

باجماعت نماز ادا کرنیکا نفع دنیا میں باہمی اتحاد کا بڑھنا اور امام کی اطاعت کا عادی ہونا ہو سکتا ہے باقی رہی زکوٰۃ وہ حکومت کی بیخ و بنیاد اور اس کے کاروبار کی اصل ہے اس لئے کہ وہ بیت المال (خزانہ) کی جڑ ہے جسے ہم صیغہ مال سے تعبیر کرتے ہیں"

یہ امر مخفی نہیں کہ سلطنتوں کے انتظامات مختلف طریقوں پر ہوتے ہیں جنمیں ملکی جمہوری مطلق اور مقید۔ چار قسم کی حکومتیں پائی جاتی ہیں اور ہر سلطنت کے قواعد و ضوابط دوسری حکومت کے آئین و قوانین سے جدا ہوتے ہیں جن کا بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن جسقدر حکومتیں ہیں" وہ سب آخرکار دو بنیادی باتوں میں مشترک پائی جاتی ہیں وہ باتیں یہ ہیں (۱) مال۔ (۲) سپاہ۔ سلطنت خواہ کوئی سی ہو اور اسکے قواعد و قوانین چاہے کچھ ہی کیوں نہوں لیکن اس میں مال اور سپاہ کا وجود ضرور ہوگا" کیونکہ بغیر ان دونوں چیزوں کے سلطنت کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا" اور اکثر صورتوں میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ قیام حکومت کی ابتدائی حالت میں بہ نسبت حالت مابعد کے ان دونوں باتوں کا وجود زیادہ ضروری پایا جاتا ہے اسلامی حکومت کے اوائل میں خود مسلمان لوگ سپاہی تھے" اور نماز کے ذریعہ سے انکا اتحاد اور انکے باہمی برادرانہ تعلقات ذریعہ انتظام تھے" اور زکوٰۃ سے وہ مال مراد ہے جو فوج کے قائم رکھنے کیلئے لازم ہوتا ہے لہذا اسلامی سلطنت کے بنیادی ہونے پر ایک آیت میں درج ہیں۔ "واقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین" زکوٰۃ سے اس رشتہ اتحاد کا مزید استحکام مقصود تھا جو اسلام کی بنیاد پر" وہ اسطرح کہ مالدار مسلمانوں سے کچھ رقم ان کے زائد مال میں سے لیکر غریب مسلمانوں کو دیدی جاتی تھی گویا کہ لینے میں زکوٰۃ اور دینے میں صدقہ کے طور پر مستعمل ہوتی تھی" چنانچہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کرتے ہوئے ان سے یہ بات فرمائی تھی" کہ تم عنقریب ایک صاحب کتاب قوم کے پاس پہنچو گے ان کو اسبات کی گواہی دینے کیجانب بلانا کہ پرستش کے قابل کوئی معبود بجز اللہ پاک کے نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں" اگر وہ لوگ اسکو مان لیں تو انہیں بتا دینا کہ خداوند پاک نے رات اور دن میں انپر پانچ نمازیں فرض کی ہیں

وہ لوگ اس کو بھی تسلیم کرلیں تو پھر کہنا کہ حق تعالےٰ نے انپر ایک صدقہ بھی فرض کیا ہے جو انکے مالداروں کے لیکر انہیں میں کے غربا کو دیا جاتا ہے جس وقت وہ لوگ اس کی بھی اطاعت کریں، تو خبردار پھر اُنکے عمدہ مالوں کو ہاتھ نہ لگانا؛ (یعنے انکے مال و دولت سے تعرض نہ کرنا) اور مظلوم کی آہ سے بچتے رہنا، اس لئے کہ اس کی آہ اور جناب باری کے مابین کوئی حجاب نہیں ہے؛ اسی قول کو بنظر غور دیکھنے سے ہمارا دعوےٰ صاف صاف ثابت ہو جاتا ہے؛

زکوٰۃ کو مالداروں پر واجب ٹھہرانے اور فقیروں کے حوالہ کرنے میں ایک قابل قدر حکمت مخفی ہے؛ اسلئے کہ یہ بات غریبوں کو راضی کرنے والی ہے؛ جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے؛ خاصکر ایام جاہلیت میں جو کہ ظلم اور خودنمائی کا زمانہ گزرا ہے ایسا برتاؤ ہونا اور بھی مناسب تھا؛ اسلام کمزوروں کی امداد اور اُسے طاقتوروں کا ہم پلہ بنادینے کیلئے آیا تھا؛ اور اُسنے اپنا یہ عمل پورا کیا؛ اسی وجہ سے جو لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن تھے وہ سب سردار قوم تھے جنکو یہ بات بُری لگتی تھی؛ کہ اپنی قوم کے غریب لوگوں کو اپنے مال و دولت کا حصہ دار بنائیں اور وہ مسکین انکے بھائی بنیں؛ اور واقعہ بدر کبریٰ کے بعد ۲ھ میں غنائم اور جزیہ (ٹکس) کی آمدنی اور بھی اضافہ ہوئی جسکا مفصل بیان آگے چل کر آئیگا؛ اسوقت سے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابو بکرؓ کے عہد میں سلطنت کے کاروبار کا انحصار ان امور پر تھا؛ زکوٰۃ جو مالدار مسلمانوں سے لے کر غرباء کو تقسیم کیجاتی تھی؛ جنگ جہاد سے حاصل شدہ مال غنیمت جو مجاہدین کے مابین بانٹا جاتا تھا اور ذمی یعنے یہود و نصاریٰ میں سے جو اہل عرب مسلمانوں کی ذمہ داری میں آگئے تھے؛ انپر جزیہ وغیرہ محاصل کا مقرر کرنا ان تمام کاموں کے والی اور افسر خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا اُن کے خلیفہ ہوتے تھے؛ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ مال کہیں سے آتا تھا وہ تمام مسلمانوں پر برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا چھوٹے بڑے آزاد و غلام اور مرد و عورت کا کوئی امتیاز و تفریق نہ تھی؛ لیکن اگر مال غنیمت ہوتا تھا؛ تو اسمیں سے خلفاء بھی اپنا حصہ لے لیا کرتے تھے؛ جو آگے چل کر بیان ہوگا؛ قاعدہ یہ تھا کہ جسوقت باہر کے ملکوں سے مال و متاع مدینہ میں آتا مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لاکر رکھا جاتا تھا؛ اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا خلیفہ اُسے بلا کسی قید اور ضبط کے اپنی مرضی کے موافق لوگوں پر تقسیم کر دیتے؛ یہاں تک کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا جاتا تھا؛

جسوقت عمر بن الخطاب کے عہد میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا نئے نئے ملک مسلمانوں کے قبضے میں آنے لگے؛ اور عرب والے رومیوں اور فارسیوں سے ملے جلے تو انکی آمدنیاں بڑھ گئیں اور یہ کیفیت ہوئی کہ چاروں طرف سے مال و دولت پھوٹ پڑا؛ اسلئے وہ مجبور ہوئے کہ اُسے ضبط و قید میں رکھیں اور آمد و خرچ کی تعیین کریں عمرؓ کو خیال گذرا کہ آمدنیوں کو دفتروں میں ضبط کیا جائے؛ اور اسمیں سے ہر سال لوگوں کو بقدر استحقاق وظیفہ دینے کو بعد جو رقم

باقی بچے اُسے وقت ضرورت کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ لہذا عمر رضؓ نے ۲۰ھ میں (اور بقول بعض ۱۵ھ میں) یہ انتظام شروع کیا، اس عمل کو دیوان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسا کرنیمیں رومیوں اور فارسیوں کی پیروی کیگئی تھی عمرؓ نے اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں پر غور کی نظر ڈالی تو ان کے کئی طبقے اور درجے پائے جو حکومت اسلامی کے قیام و توسیع میں اُن کے مؤثر ہونیکے لحاظ سے قائم ہوتے تھے، اسلیئے انکو مناسب معلوم ہوا کہ انہیں سے ہر شخص کا وظیفہ اسکی خدمات کے لحاظ سے مقرر کریں، مگر اسکے ساتھ ہی انہوں نے قرابت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھی خیال رکھا اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتہ داروں کو ایک خاص طور پر ممتاز بنایا جسے ہم آگے چل کر بیان کرینگے، دفتر دیوان کی درستی اور ترتیب میں ایک محرر خلیفہ کیجانب سے مقرر ہوا جو ان کی دیکھ بھال اور حساب کتاب میں مشغول رہتا تھا۔

پھر جس زمانہ میں مدینے کے اندر بکثرت مال آنے لگا اسوقت عمر رضؓ نے ایک خزانہ یا گھر بھی تعمیر کرادیا جس کا نام بیت المال رکھا گیا، بیت المال کا قائم کرنا عمر رضؓ کی اولیات میں سے ہے اگرچہ ہم ابوبکر رضؓ کے عہد میں بھی بیت المال کا ذکر سنتے ہیں، لیکن یہ صرف ایک قیاسی بات ہے، اسلیئے کہ ابوبکر رضؓ کے پاس اسقدر مال کہاں بچتا تھا، جسے وہ کسی خزانہ یا مکان میں جمع کراتے۔

۴۰ھ میں خلفائے راشدین کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اسوقت سلطنت کے عہدہ دار حسب ذیل تھے۔

(۱) خود خلیفہ (حاکم عام) (۲) اُن کے عمال یعنی حکام اطراف اور شہروں میں (۳) کاتب جو اُن کے خطوط لکھتا تھا، اور خزانہ کے داخل و خارج کا حساب بھی رکھتا، (۴) ایک خاص خادم جسے لوگ حاجب کہا کرتے تھے، (۵) خزانچی جو بیت المال کا نگران ہوتا تھا، (۶) قاضی جو مقدمات کا فیصلہ کیا کرتا،

خلافت بنو امیہ کے ہاتھوں میں جاتا ہی اس کا شاہانہ انتظام اور دنیوی حکمرانی کا پہلو اختیار کرتا تھا اب مسلمان لوگوں کا میل جول عجمی لوگوں سے بڑھ گیا تھا، اور حکومت کے کاروبار بھی اصول ترقی کے موافق بڑھنے اور وسعت پانے لگے تھے، بنو امیہ نے چند نئے صیغے جنکو انہوں نے رومیوں اور فارسیوں سے اقتباس کیا تھا، اور بھی بڑھا دیئے تھے، پھر شکوہ سلطنت اور دولتمندی و ثروت کے اقتضا سے ان کو خدم و حشم رکھنے حاشیہ نشین اور حاجب و حارس مقرر کرنیکا بھی شوق ہوا اور اس طرح رفتہ رفتہ بنی امیہ کے عہد میں چار سو دیوان خاتم یعنی ڈاک اور دفتر خراج کی بنیاد پڑگئی جن کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

جسوقت حکومت کی باگ بنو عباس کے قبضہ میں پہنچی، غیر قوموں سے میل ملاپ کے باعث زیادہ ہونے لگے، خلفاء کو عیش پسندی اور آرام طلبی کی چاٹ پڑگئی تھی لہذا انہوں نے ایسے عہدہ داروں کو بڑھایا جو سلطنت کے

کاروبار میں انکے قائمقام اور نایب ہو سکیں۔ انہوں نے وزارت اور حاسبت وغیرہ کا عملہ بڑھایا اور اعلیٰ اعلیٰ منصبوں کی ضرورت وحالت کے موافق مختلف شاخیں ہوتی گئیں پھر اس کے بعد ہر ایک اسلامی حکومت نے اپنی اپنی ضرورت کے موافق نئی عہدوں کو اپنے یہاں داخل کرنا شروع کیا جسکے سبب بغداد کے عہدے اور امور مملکت قرطبہ سے جدا اور ان دونوں مقاموں کے محکمے قاہرہ کے محکموں سے الگ تھے، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

محکموں کی شاخیں

اسلامی حکومت کے دور اوّل میں جبکہ اس کے اندر ایک قسم کی دینداری بھی تھی خود خلیفہ بذات خاص تمام کاموں کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اس کے عامل اس وقت تک متقی و پرہیزگار لوگ ہوتے تھے، اور اسبات کی بالکل حاجت نہ پڑتی تھی کہ کوئی ان کی کارگذاری کی نگرانی رکھے یا انکی پوشیدہ طور پر تحقیق کرے، خلیفہ کے پاس کچھ ذاتی مال و ملک یا جاگیر تو ہوتی نہ تھی جس کے حساب کتاب کی ضرورت پڑے بلکہ اس زمانہ میں تو یہ حالت تھی کہ جس وقت خلیفہ اپنے کسی عامل کو خط لکھتا تھا، تو اپنے ہاتھوں سے اسپر مہر لگاتا یا بسا اوقات خط بھی اپنے ہی دست خاص سے لکھا کرتا، مگر جس وقت کہ خلفاء کا اقتدار بڑھا، اور خلافت کا معاملہ دینی پہلو سے ہٹکر حکومت ملکی سے تبدیل ہوگیا، خلفائے نے کاہلی اور قیصر و کسریٰ کی پیروی کو اپنا شیوہ بنایا اور ان کاموں پر اپنی جانب سے قائمقام مقرر کئے، لہذا انہوں نے ایک ایسا عہدہ رکھا، جسکا عہدہ دار سلطنت کے تمام کاموں کا نگران رہے، اس خدمت کے انجام دینے والے وزیر کہلائے اور جو عہدہ دار عمال صوبجات کا نگران رہتا تھا اسکا نام "صاحب دیوان البرید" ہوا اور جو شخص کہ خطوط اور فرمانوں پر مہر لگانے اور انہیں لفافوں میں بند کرنے کی خدمت پر متعین ہوتے وہ صاحب دیوان توقیع (یا) خاتم کے نام سے موسوم ہوئے اور جن عہدہ داروں کو خلفاء کے املاک و اراضیات کی حفاظت سپرد ہوتی وہ لوگ عمال دیوان الضیاع کہے جاتے تھے، اور جو عہدیدار حاشیہ نشینوں اور خدام خلفا کے حساب کی نگرانی رکھتے، وہ عمال دیوان خاص کہلاتے نیز بعد کے زمانہ میں خلفاء کی حضارت نے یہ ضرورت بھی پیدا کردی کہ سکے ڈھلوائیں اور نشان (طراز) سلطنت منقوش کرائیں اسلئے انہوں نے دار الضرب (ٹکسال) اور دیوان الطراز کی بنیاد رکھی اسکے علاوہ چند عدالتیں بھی قائم کیں جنمیں سے بعض درخواستیں پیش کرنے کی غرض سے تھیں اور کچھ اسکے سوا دوسری باتوں کیلئے مثلاً دیوان الترتیب اور دیوان العزیز۔ یہ آخری عدالت بالعالی کے مشابہ تھی۔

خلفائے راشدین کے عہد میں جو شخص کاتب (میر منشی) ہوا کرتا تھا۔ وہی عمرؓ کے ترتیب دیئے ہوئے دفتر کا سارا کاروبار بھی سنبھالتا تھا، جسقدر خراج اور جزیہ وغیرہ کی رقمیں آتیں انکو آمدنی میں اور جو کچھ فوج کی تنخواہ اور عاملوں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرات میں خرچ ہوتا اسے مصارف میں درج کیا کرتا اسی کیساتھ عاملوں

خط و کتابت رکھنے کی خدمت بھی انجام دیتا۔ پھر جس زمانہ میں حکومت کے محکمے اور کاروبار وسیع ہوئے تو انکی محکمہ کی مختلف شاخیں ہو کر کئی محکمے بنگئے۔ چنانچہ جتنا حصہ خراج اور جزیہ کی حسابات سے مخصوص تھا وہ عملہ الگ ہو کر دیوان خراج کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اور جو حصہ فوجی اور ملکی اخراجات سے وابستہ تھا اسکا عملہ جدا ہو کر دیوان الزمام و النفقہ (بخشی گری) کے لقب سے ملقب کر دیا گیا۔ اور جس کام کا تعلق فوجیوں کے ناموں کا رجسٹر مرتب رکھنے اور انکے طبقوں اور تنخواہوں کو قلمبند کرنیسے تھا اس کے عملہ کو دیوان الجند (فوجی دفتر) سے موسوم کیا گیا پھر اور آگے بڑھکر اسی فوجی دفتر سے دیوان الاساطیل (بیڑہ جات جہاز کا دفتر) اور دیوان للثغور (سرحدی چھاؤنیوں کا دفتر) وغیرہ کی نئی شاخیں پیدا ہوئیں۔ صوبجات کے حاکموں اور عاملوں وغیرہ سے خط و کتابت رکھنے کیلئے ایک جداگانہ دفتر قائم کیا گیا جس کے لئے دیوان الرسائل یا دیوان الانشاء کا نام تجویز ہوا۔

ابتدا میں بیت المال مسلمانوں کے تمام مالوں اور ہر قسم کی رقموں کا عام مخزن تھا۔ پھر اموی لوگوں اور عباسیوں کے زمانہ میں اس کی بھی کئی شاخیں ہو گئیں جنمیں سے کوئی شاخ صرف صدقہ کے مالوں کیلئے تھی اور کوئی جرمانوں اور تاوانوں کی آمدنیوں کیلئے اور کوئی اموال وراثت جمع رہنے کیواسطے اور چند ان کے علاوہ دیگر متفرق رقموں کی غرض سے بس اسی طرح اور کاموں میں بھی شاخیں نکلتی گئیں جیسے کہ ایک قضاء کے عہدہ سے بڑھکر دفتر فوجداری اور محاسبت اور پولیس کا عملہ مقرر ہوا اور اسی کی مانند اور عملے جنکا شمار ناممکن ہے۔

چونکہ ہم اس موقعہ پر اساسی (اصولی اور بنیادی) دفتروں اور انکی تواریخ پر غور کرنیکے خواہاں ہیں اور انکے تمام حالات سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور یہ صورت اسوقت تک صاف عیاں نہو گی۔ تاوقتیکہ ہم انکے اصول اور آغاز کی حالت پھر انکے شاخ در شاخ ہوتے رہنے کی کیفیت پر غور نہیں کریں گے۔ لہذا ہم پہلے خلافت اور اسکے توابع اور ملحقات سے ابتدا کر کے بعد ازاں صوبوں کی گورنریوں اور پھر وزارت کے عہدوں کا بیان کرینگے پھر فوج اور مال کیلئے ایک علیحدہ باب خاص کرینگے۔ اور دوسرے کاروبار کو بھی اسی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔

خلافت

اسکی ماہیت شرطیں اور حقوق

خلافت کی ماہیت | خلافت ایک قسم کی حکمرانی ہے جو اسلام کیساتھ خاص ہے اور اسکے سوا کسی

قوم اور ملت میں پیشتر سے نہیں تھی۔ اگرچہ خلافت خود مختارانہ شخصی حکومت کی قسم سے ہے مگر وہ رومی قیصروں اور امپیروں اور فارسی کسراؤں کی طرز حکومت سے یہ امتیاز بھی رکھتی ہے کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی حکومت مشتمل ہے اسی لحاظ سے وہ عام مخلوق کو انکے دینوی اور اخروی کاروبار میں شرعی احکام کے مطابق عملدرآمد کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور قیصر و کسریٰ کی حکومتیں صرف عقلی دلائل کی بنا پر عام خلقت کو محض دنیوی مفاد حاصل کرانا چاہتی ہیں۔

اسمیں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں حکومتوں (یعنے خلافت اور دنیوی سلطنت) کے درمیان ایک بین فرق ہے اور بہت بڑا تفاوت، لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے، اسلئے کہ جو شخص خلق خدا کا حاکم اور انکے کاروبار کا مطلق العنان نگراں ہوتا ہے وہ یا تو کسی مفروض قانون کا پابند ہو کر لوگوں سے اسکے مطابق عملدرآمد کراتا ہے اور یا اپنی خواہشوں اور غرضوں کے موافق انسے کام لیتا ہے، متمدن دنیا کے اکثر حاکم اور بادشاہ اپنی رعایا پر ایسے قوانین کے ذریعہ سے حکمرانی کرتے ہیں، جو انتظامی غرض کو مدنظر رکھکر سلطنت کے عالی مرتبہ مشیروں اور قوم کے دانشمند لوگوں نے بنائے ہوں انہیں قوانین کی پیروی کرانی حکام ملک کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسلام سے قبل رومیوں اور فارسیوں کی یہی حالت تھی، اور آجکل یورپ کے خود مختار بادشاہوں کا طرز عمل بھی اسی قسم کا ہے۔ باقی رہی خلافت تو وہ دینی اور شرعی قوانین سے جکڑی ہوئی ہوتی ہے، جن کے ذریعہ سے خلیفہ اپنی قوم پر حکمرانی کرتا اور اس شریعت کے پیغمبر کا نائب بنکر عام مخلوق کو اس کا پابند بناتا ہے، اسی قسم کی باتوں میں سے خلافت کا امامت پر شامل ہونا بھی ہے اور مسلمانوں نے خلیفہ کا نام امام بھی اسی مشابہت سے رکھا ہے، کہ جیسے نماز کے امام کی پیروی کیجاتی ہے اسی طور سے خلیفہ کے احکام واجب العمل ہوتے ہیں۔

خلافت کی شرطیں

خلافت کی شرطیں چار ہیں جنمیں سے اکثر کا خلیفہ میں پایا جانا ضروری ہے وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) علم (۲) عدالت (۳) کفائتہ (نیک چلنی اور اعتبار کے قابل ہونا) (۴) عقل و حواس کی صحت و سلامتی، انکے علاوہ ایک پانچویں شرط اور بھی ہے، جس کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے وہ شرط قریشی النسب ہے، یعنے قبیلہ قریش کے سوا اور کسی خاندان کا شخص خلافت کا دعویدار نہیں ہو سکتا، اس صورت میں یہ بات دشوار ہو گئی، کہ کوئی عجمی شخص خلیفہ کے نام سے مسلمانوں کے معاملات کا والی بنجائے اس شرط کی اصل ایک حدیث نبوی ہے جو قریش و اولین نے انصار کے مقابلہ میں انکی طرف سے حصول خلافت کی خواہش ہونے پر بطور حجت پیش کی تھی جیسا کہ بیعت ابی بکرؓ کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے، یہ شرط اسلامی حکومتوں میں بہرحال پورے طور پر ملحوظ رہتی تھی۔

چنانچہ قریش والوں کے علاوہ اور کسی شخص نے کبھی خلافت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اگرچہ خلفاء کے آخری زمانہ میں آکی کمزوری بیحد بڑھ گئی تھی اور والیان ملک کا زور بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا تھا۔ کہ انہوں نے خلیفہ کو تمام دنیوی قوتوں سے الگ کر دیا تھا۔ اور خلفاء کو بے قابو بنا کر خود مختار حکومتیں قائم کرنیکے بعد اپنے آپکو سلاطین کے لقب سے ملقب کر لیا تھا۔ باوجود ان تمام حالتوں کے ان سلاطین میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہ آیا۔ کہ وہ خلافت کا دعوے کریں یا خلیفہ بن بیٹھیں۔ یہی بنی بویہ۔ سلجوقی لوگ۔ غزنوی اور طاہری وغیرہ سلاطین جنکی نہایت قوی اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں انہیں سے بعض تو ایسے تھے جو خود خلفاء پر بیحد حاوی ہو گئے تھے اور انکو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے تئیں سلطان کے سوا کسی اور نام سے موسوم نہیں کیا بلکہ اور خلفاء کی خوشامدیں کرتے رہتے تھے تاکہ وہ انہیں مسند حکومت پر قائم رکھیں سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر میں بھی یہی برتاؤ کیا۔ کیونکہ جبوقت اسنے آخری فاطمی خلیفہ سے حکومت مصر کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اسوقت کوئی شخص اسکا روکنے والا نہیں تھا۔ اور نہ اسکے مقابلہ میں کوئی دعویدار ملک و حکومت ہو سکتا تھا۔ انتظام ملک کی کنجیاں اسکے قبضے میں تھیں مگر جب اسنے مستقل حکمران بننے کا ارادہ کیا تو عباسی خلیفہ کا نام خطبوں میں پڑھوایا اور اپنے تئیں خلیفہ نہیں کہلایا۔ بلکہ صرف سلطان کے لقب پر اکتفا کی۔ خاندان قریش کے علاوہ اور قبیلہ کے جس شخص نے سب سے پہلے اسلامی خلافت حاصل کی۔ وہ سلطان سلیم فاتح عثمانی تھا اسنے سنہ ۹۲۳ھ میں منصب خلافت حاصل کیا۔ آئمہ مذہب حنفی کی دلیل در بارۂ صحت خلافت بنی عثمان یہ ہے کہ خلیفہ مندرجہ ذیل چار حقوق کے پائے جانے پر متولی خلافت ہو سکتا ہے۔

۱۔ تلوار کا استحقاق اس کے معنے یہ ہیں کہ طالب خلافت کی دعوت پر اتنے مددگار ہونے چاہئیں کہ ان کے مقابلے میں روئے زمین پر کوئی دوسرا سر نہ اٹھا سکے اور اسمیں کلام نہیں کہ جب سلطان سلیم نے مصر کو فتح کرنیکے بعد حصول خلافت کی خواہش کی ہے اس کی یہی حالت تھی۔

۲۔ انتخاب کا استحقاق یعنے اہل عقد کی تصدیق جو کہ اماموں اور علماء کی ایک مجلس ہوتی ہے اسبارہ میں انہوں نے یہ حجت قائم کی ہے کہ مجلس اسلام کے اول عہد میں مدینہ کے اندر تھی پھر وہاں سے دمشق میں منتقل ہو آئی۔ بعدہٗ بغداد میں اور اس کے بعد مصر کے دار السلطنت قاہرہ میں لہذا اسکا قاہرہ سے قسطنطنیہ میں منتقل ہو جانا بھی کچھ ناجائز نہیں ہو سکتا۔ اسلئے جبوقت سلطان سلیم نے مصر کو فتح کیا ہے وہ اپنے ہمراہ علماء ازہر کی ایک جماعت کو قسطنطنیہ لے گیا تھا۔ پھر انکے حلقہ میں چند ترکی علماء کا اضافہ کرکے ایک باقاعدہ مجلس مرتب کر لی تھی جسنے

اس کے انتخاب پر تصدیق کی اور خلافت کی تلوار اس کو سپرد کی چنانچہ آجتک یہ رسم جاری ہے کہ عثمانی خلفاء کو علماء کے ہاتھوں سے مسندنشینی کے وقت تلوار حمائل کرائی جاتی ہے اور یہ رسم آجکل جامع ایوب میں ادا ہوتی ہے۔

۳۔ وصیت کر جانا یعنے خلیفہ وقت اپنے بعد جس شخص کو خلیفہ بنانے کی وصیت کر جائے جب سلطان سلیم نے مصر کو فتح کیا ہے وہاں کا آخری عباسی خلیفہ متوکل تھا۔ جس نے سلطان ممدوح کے لئے خلافت کی وصیت کی تھی۔

۴۔ حرمین کی حمایت چنانچہ جو وقت سے عثمانی سلاطین خلافت کے متولی ہوئے ہیں سوا ان سات برسوں کے جن میں صنعا کے اماموں نے دسویں صدی ہجری کے اندر ان متبرک مقامات پر حکمرانی کی اور کچھ ان سات سالوں کے جنہیں ان امکنہ مقدسہ کی حکومت وہابیوں کے قابو میں رہی ان چودہ برسوں تک تو بے شک انہیں اس خدمت کا موقعہ نہیں ملا۔ باقی آج تک یہی لوگ حرمین شریفین کے حامی اور نگران ہیں۔

۵۔ امانتوں کی حفاظت یہ امانتیں کیا ہیں؟ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تبرکات جو آستانہ علیہ میں محفوظ ہیں۔ مسلمانوں کا قول ہے کہ آثار نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) بغداد میں تاتاریوں کی دستبرد سے محفوظ رہے تھے۔ جن کو عباسی خلفاء اپنے ہمراہ مصر لے گئے اور اسوقت سے برابر ملک مصر میں بحفاظت رہتے چلے آئے یہانتک کہ سلطان سلیم ان کو قسطنطنیہ میں لے آیا اور وہ ابتک ایک چاندی کے صندوق میں باسفورس کے کنارہ پر سرائے قدیم کے ایک کمرہ میں محفوظ ہیں۔

خلفاء کی بیعت کا طرز

بیعت لینے کی صورت خلفاء راشدین کے عہد میں خلافت شورے کے ذریعہ سے ہوتی تھی یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ شورے کیا چیز ہے؟ اسکی یہ صورت تھی کہ خلیفہ وقت جس شخص میں اس امر کی صلاحیت وقابلیت پاتا تھا۔ کہ وہ خلافت کے کاروبار کو عمدگی سے نباہ سکیگا اُسے اپنے بعد جانشینی کیلئے نامزد کر دیتا تھا۔ جیسا کہ ابوبکرؓ نے عمرؓ کی نامزدگی کے باب میں کیا تھا۔ لیکن ابوبکرؓ نے ان کو اسیوقت نامزد کیا جبکہ انہوں نے صحابہ سے اس معاملہ میں رائے لے لی تھی۔ اور جس حالت میں خلیفہ کو یہ خوف ہوتا تھا۔ کہ انکا کسی خاص شخص کو نامزد کرنا قیل وقال کا باعث ہوگا۔ تو وہ ایک گروہ کو متعین کر دیتے تھے۔ کہ انہی میں سے کسی کو خلیفہ منتخب

کر لیا جائے جس کی مثال عمرؓ کا طرز عمل ہے۔ خلفاء راشدین میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خلافت کو اپنی نسل کیلئے بطور وراثت مخصوص کریں۔ یہانتک کہ جوقت عمرؓ نے ایک جماعت کو شوریٰ کے طور پر نامزد کیا۔ تاکہ انہیں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں تو اپنے فرزند عبداللہؓ کو بھی اسی جماعت میں نامزد کیا تھا لیکن ساتھ ہی اس امر کی بھی ممانعت کر دی تھی کہ انہیں خلافت کے لئے انتخاب نہ کریں چنانچہ آخرکار لوگوں نے اسی گروہ میں سے عثمانؓ بن عفان کو خلافت کیلئے چن لیا۔ یہ خلیفہ عثمانؓ شہید ہوئے اور کسی شخص کے لئے بیعت نہ کر سکے لہذا لوگوں نے بلا شوریٰ کے علی کو خلیفہ قائم کر لیا۔ علیؓ کا اسطرح بلا ان سے دریافت کئے منتخب ہو جانا بہت سے بڑے بڑے صحابہ کو ناگوار گزرا کیونکہ وہ لوگ عثمانؓ کی شہادت کے وقت اور ملکوں میں منتشر تھے۔ اور علیؓ کی بیعت میں حاضر نہ ہو سکے اسی لئے انمیں سے کسی نے تو بیعت کر لی اور کوئی اس خیال سے رک گیا کہ سب لوگ کسی شخص کی خلافت پر اجتماع کر لیں تو ہم بھی اس سے بیعت کریں ان لوگوں نے خلافت کے معاملہ کو یونہیں چھوڑ رکھا تھا۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے مابین شوریٰ کے قاعدہ سے عمل میں آئے اور اہل شوریٰ جسے چاہیں متولی خلافت بنائیں پھر اسکے بعد مشہور فساد کا واقعہ پیش آگیا اور جو کچھ گذرا وہ سب پر ظاہر ہے۔

جسوقت حضرت علیؓ شہید ہوئے ان کے شیعوں نے قصد کیا کہ خلافت کو انہیں کی نسل میں مخصوص کر دیں ان لوگوں نے یہ خیال اس لحاظ سے کیا تھا۔ کہ اولاد علیؓ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جگر گوشہ ہے چنانچہ ان لوگوں نے علی سے اس امر کے متعلق اس حالت میں جبکہ وہ بستر موت پر پڑے تھے دریافت بھی کیا کہ کیا ہم حسنؓ سے بیعت کریں؟ جس کے جواب میں علیؓ نے فرمایا کہ "میں تم کو منع نہیں کرتا۔ اور نہ ایسا کرنیکا حکم دیتا ہوں۔ تم خود اس معاملہ کو جیسا مناسب سمجھتے ہو" مگر شیعیان علیؓ نے ان کے فرزند حسنؓ سے بیعت کر ہی لی لیکن معاویہ بن ابی سفیان کیلئے خلافت سے دستکش ہو گئے اور عہدہ خلافت معاویہ کے قابو میں آنیسے کار دبار خلافت بنوامیہ کے گھرانے میں چلا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین کا طریقہ جو ان مقدس لوگوں نے انتخاب خلفاء کے معاملہ میں برتا ان تمام طریقوں میں افضل تھا۔ جو آجتک کی متمدن قوموں نے بڑی کوششوں اور کاوشوں کے ساتھ اختیار کئے ہیں خلفاء راشدینؓ کا طرز عمل جمہوری شاہی اور شوریٰ تینوں طریقوں کا جامع تھا۔ جمہوری اسطرح پر تھا کہ خلیفہ کا انتخاب عام اہل قریش میں سے یا کسی حصر اور تعیین کے ہوتا تھا اور شوریٰ اسطرح کہ انتخاب عام مشورہ

سے ہوتا تھا اور مطلق العنان حکمرانی اس بات سے ثابت کی جاتی تھی کہ جب کوئی خلیفہ منتخب ہو کر کاروبار مملکت کی باگ پر قابض ہو جاتا تھا تو وہ بلاقید و بندش جو چاہے کر سکتا تھا۔ لہذا جب ان امور مذکورہ بالا پر وہ چار دیگر شرطیں بھی اضافہ کر دی جائیں جو ہم نے ابھی بیان کی ہیں تو یہ حکومت بادشاہت اور شخصی حکومت سے افضل و اعلیٰ ہو جائیگی اس لئے کہ جب مطلق العنان حاکم [illegible] اور ریاست حواس سے بھی بہرہ ور، تو پھر کاروبار سلطنت کے ترقی دینے اور ملک کو وسیع کرنے اور رعایا کو [illegible] رکھنے میں اس سے بڑھ کر کوئی حاکم صاحب قدرت نہ ہو سکیگا۔ یہ سب فائدے اس خوبی و خصوصیت کے علاوہ ہیں جو ان خلفاء میں تقویٰ اور زاہدانہ زندگی کی قسم سے پائی جاتی تھی۔ جیسا کہ خلفائے راشدین کے حالات دیکھنے سے واضح ہوتا ہے۔

مگر جب کہ اسلامی حکومت بنو امیہ کے قابو میں آئی اور وہ لوگ ملک شام میں رومیوں سے ملے جلے اور حکومت کے ان طریقوں سے واقف ہوئے جو اہل روم کے یہاں زیر عمل تھے، جنمیں سے ایک طریقہ نسلاً بعد نسلاً ایک شخص کے گھر میں حکومت کا قائم رہنا بھی تھا، تو معاویہؓ کو بھی رومیوں کی دیکھا دیکھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی نسل میں بھی موروثی طور پر حکومت کا سلسلہ قائم کریں۔ لیکن ابتداءً وہ ایسا کرنے میں جھجکتے اسلئے کہ ان کو معلوم تھا کہ اسمیں خلفائے راشدین کے طرز عمل کی مخالفت ہوگی۔ لہذا انہوں نے اپنے بعض خواص اور مقرب لوگوں سے اس معاملہ میں شورہ کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے انکو ہمت دلائی اور سب سے زیادہ جرأت انہیں اس خیال نے دلائی کہ اگر اپنے بعد خلافت کے معاملہ کو یونہی بلا کسی وصیت وغیرہ کے چھوڑ جائینگے تو باہم نفاق اور فساد بڑھے گا، ادھر بنو ہاشم دعوے دار خلافت ہونگے، ادھر بنو امیہ اپنے سوا کسی غیر کی خلافت تسلیم نہیں کرینگے۔ اسلئے یہ صورت ایسی چاہئیں کہ نبوت کی دہشت لوگوں کے دلوں سے نکل گئی ہے، ملکی طبیعت غالب آچکی ہے اور لوگ عصبیت کیجانب رجوع ہو گئے ہیں۔ آخر کار فساد چھڑنے کا باعث ہوگی لہذا اس فتنہ سے بچنے کیخاطر انہوں نے اپنے بیٹے یزید کیلئے بیعت کا سر انجام کیا۔ اور پیش بندی کے طور پر اس خیال سے کہ کہیں ان کے بعد پھر کوئی فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو اپنی زندگی ہی میں یزید کیواسطے بیعت طلب کی اور آہستگی کے ساتھ اس امر کو دیکھنا چاہا کہ لوگ کیا خیال ظاہر کرتے ہیں مگر کوئی خرابی اور دنگہ نہیں دیکھا۔ اسی قاعدہ پر ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی عملدرآمد کیا۔ مگر عمر بن العزیز رحمہ نے اس قاعدہ کو توڑ کر خلفائے راشدین کا طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ مگر عام لوگوں کی شورش کے باعث نہ کر سکے اور انکی مدت خلافت بھی کچھ طویل نہ تھی، جس کے بعد بنو امیہ نے پھر وہی معاویہ والا طرز اختیار کر لیا۔

عباسی عہد حکومت میں مامون الرشید نے بھی ایسا ہی قصد کیا تھا چنانچہ اس نے علی بن موسیٰ بن جعفر صادق کو جو امام علیؑ کے نسل سے تھے اپنا ولیعہد بنا کر ان کا نام "رضا" رکھا تھا لیکن بنو عباس اس کے اس فعل سے سخت ناراض ہوگئے اور مامون الرشید کی بیعت توڑ کر اس کے چچا ابراہیم بن المہدی سے بیعت کرلی اور اگر مامون جھٹ پٹ اس معاملہ کی تلافی کرنے پر آمادہ نہ ہوجاتا تو خلافت اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی۔ اسی لئے اپنا ارادہ فسخ کرکے اس نے وراثت کے طور پر ہی خلافت قائم رکھی اور اسی کے موافق عباسی اور فاطمی وغیرہ دیگر مسلمان خلفاء کا عمل درآمد رہا۔

بیعت اور اسکی قسم بیعت سے مراد اطاعت کا اقرار ہوتا تھا یعنے جب کسی شخص نے کسی امیر سے بیعت کی تو گویا اُسنے اسکی فرمانبرداری کا اقرار کرلیا اور اپنی ذات کے تمام معاملات کا اُسے مختار بنا دیا اور اب خلاف طبع ہو یا حسب منشا، غرض جس بات کا بھی حکم اس امیر کی جانب سے ہوگا وہ اس کے ماننے میں ہرگز انکار نہیں کریگا اور کسی امر میں امیر کے حکم سے انحراف و سرتابی کا مرتکب نہوگا۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ جب وہ کسی امیر سے بیعت کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو اس کے ہاتھ میں دیتے اس طرز عمل سے اقرار کی مضبوطی کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ اور چونکہ یہ صورت مشتری و بائع کے فعل سے مشابہ ہوتی تھی لہذا بیعت کے نام سے موسوم ہوئی جو لفظ "باع" کا مصدر ہے بعد میں رفتہ رفتہ ہاتھوں کا ملانا بیعت قرار پا گیا اور عرف لغت کے اعتبار سے بھی بیعت کا مدلول یہی امر ہے۔ اسلام میں سب سے مقدم بیعت، بیعت عقبہ تھی اور اسی بیعت کے اصول پر وہ قسمیں بھی ہیں جو خلفائے اسلام اقرار اطاعت کراتے وقت بطور حلف لیا کرتے تھے اور جتنے طریقوں سے قسم کھائی جاتی ہے ان سب طریقوں سے قسم کھلواتے تھے۔

یمین (قسم) بیعت کی عبارت حکومتوں اور حالتوں کیساتھ بدلتی گئی گو اسکا مقصود مدعا ایک ہی رہا۔ جسوقت انصار نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مقام عقبہ میں بیعت کی ہے تو انہوں نے یوں کہا تھا۔ "یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم لوگ آپ کو پناہ دہی سے اسوقت تک بے تعلق ہیں جبتک کہ آپ ہمارے گھر کو تشریف لے چلیں۔ لہذا جب آپ ہمارے وطن میں پہنچ جائینگے تو ہماری پناہ میں آجاویں گے اسوقت جن باتوں سے ہم خود اپنا اور اپنے آل بچوں کا بچاؤ کرتے ہیں آپکو بھی ان باتوں سے محفوظ رکھیں گے"۔ اس مقام پر ایک اور عبارت بھی ہے جو مقام عقبہ میں بیعت کیلئے استعمال کیگئی تھی۔ اور یہ بیعت، بیعت نساء کے نام سے مشہور ہے۔ وہ عبارت حسب ذیل ہے۔ ہمنے بیعت کی اس اقرار پر کہ خدا کیساتھ کسی

شریک نہ بنائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہ کرینگے، اپنی اولاد کو (بیٹیوں کو) قتل نہ کریں گے اور کسی پر بہتان نہ باندھیں گے، نہ کسی امر معروف میں نافرمانی کریں گے،

جس زمانہ سے ابو مسلم خراسانی نے بنی عباس کیلئے بیعت طلب کرنی شروع کی تو اسکی عبارت یہ ہوتی تھی: میں تم سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کیلئے انکی اطاعت کرنیپر بیعت لیتا ہوں اور تمپر اس قول کے نباہنے کیلئے خداوند پاک کا عہد اور اسکا میثاق ہے تم روزینہ کا مطالبہ نکرو گے اور نہ کسی قسم کا لالچ کرو گے، جبتک کہ تمہارے حکام از خود تمہیں روزینہ دینا شروع نکریں اگر تم اسکے خلاف کرو تو تمہاری عورتوں کو طلاق، غلام کا آزاد کرنا اور پاپیادہ کعبۃ اللہ کا سفر کرنا لازم ہوگا۔

جب کسی خلیفہ کی بیعت کرنی چاہتے تھے، تو دستور یہ تھا کہ سب سے پہلے اکابر سلطنت بیعت کرتے تھے اور انکے بعد اصحاب مناصب میں سے جو ان سے دوسرے درجہ پر ہوتے عباسی عہد حکومت میں سب سے پہلے خلیفہ سے بیعت کرنیوالے فوجی لوگ اور سپہ سالار اور بغداد کے قاضی ہوا کرتے تھے، اور اکثر اوقات ان لوگوں سے قسم لینے پر فوج کا میر منشی مقرر ہوتا تھا اور لوگوں کا نام لیکر پکارتا جاتا تھا اسکے بعد وزیر یا اسکا قائمقام اٹھ کر خلیفہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ باندھتا اور اسے چادر اڑھاتا تھا، جو وقت بیعت کی کارروائی ختم ہوجاتی تو خلیفہ کے روبرو بہت سے القاب پیش کئے جاتے تھے، جنمیں سے کسی ایک لقب کو پسند فرما کر وہ اپنے لئے خاص کر لیتا، اس قسم کے القاب صرف مسلمانوں ہی کے زمانہ میں ایجاد ہوئے تھے عباسی حکومت کے پہلے دور میں یہ القاب بہت ہی سادے سادے ہوا کرتے تھے، مثلاً۔ امین۔ مامون اور رشید۔ مگر جب معتصم کا زمانہ آیا تو ایک بزرگی کا نام بھی اس کے لقب پر بڑھایا گیا، اور اس کا نام المعتصم باللہ قرار پایا، پھر اس کے بعد خلفاء عباسیہ کی عادت ہی یہ ہوگئی،

جب خلیفہ سے اسکے محل میں بیعت کر لیجاتی تو پھر خلافت کا جلوس اس کے سامنے حاضر کیا جاتا یہ بہت سے گھوڑے ہوتے تھے، جڑاؤ ساز و سامان سے آراستہ اور ان کے سائیس بھی بہت ہی زرق و برق وردیاں پہنے ہوا کرتے تھے، پھر خلیفہ سوار ہوتا اور بڑے بڑے عمائد سلطنت گھوڑوں پر سوار اسکے گرداگرد حلقہ باندھ لیتے خلیفہ کے روبرو ایک شخص ننگی تلوار ہاتھ میں لئے پیادہ پا چلتا اور فوجیں سر راہ دو رویہ صف بستہ رہتیں انہیں صفوں کے بیچ میں شاہراہ پر ہوکر موکب خلافت قصر خلافت تک جاتا جو کہ بغداد کا دیوان عام تھا خلیفہ کے دیوان عام میں جلوس کرنیکے بعد حسب حالات و موقع ممالک غیر اور صوبجات ماتحت سے تہنیت جلوس پیش

کرنے کے لئے آیوالے وفد حاضر دربار ہوتے اور لوگ تہنیت نامے پیش کرتے تھے۔

بیعت کی عبارت اور جشن جلوس خلافت کی کیفیت میں تغیر حکومت کے ساتھ ساتھ اختلاف پیدا ہوتا رہا لیکن نتیجہ اور اصول سب کا ایک تھا مدعائے اصلی یہ ہوتا تھا کہ کتاب و سنت کے حکم کے مطابق عمل کرنیپر خلیفہ اور اس کی رعیت کے مابین باہمی عہد وپیمان لیا جائے خلفائے راشدین کا طریقہ تھا کہ بیعت لینے کی عبارت میں اختصار مدنظر رکھتے تھے، جیسا کہ آپ حکومتوں کی سیدھی سادہی ابتدائی حالت کے بیان میں انکے طرز عمل کی سادگی ملاحظہ کر چکے ہونگے، پہلے تو بیعت کی عبارت زبان سے کہی جایا کرتی تھی، بعد ازاں لکھ کر محفوظ رکھی جانے لگی اور ابتداءً چند کلمے ہوا کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ کئی سطروں تک نوبت پہنچی کیونکہ اس میں حشو الفاظ کی بھرتی اور طوالت کی جانے لگی تھی جس کا مقتضی حکومتوں کا دولتمندی کے زعم میں مستغرق ہونا تھا، اور عزت وعظمت کے ساتھ یاد کئے جانے کی خواہش کا پیدا ہو جانا، اسلئے کہ جب قوت حکومت وسلطنت کا اقتدار جم جاتا ہے تو تمام حکمرانوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی نمائش اور زیبائش کو بہت کچھ ترقی دینے لگتے ہیں، چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں بیعت کی جو عبارت خلیفہ حاکم بامر اللہ عباسی کیلئے لکھی گئی، وہ اسقدر لمبی تھی کہ اس کتاب کے چار صفحے اس سے بھرے جا سکتے ہیں۔

ولیعہدی کی بیعت ہمنے خلافت کے موروثی ہو جانیکے بعد کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا تھا کہ خلفاء اپنے بیٹوں کیواسطے ولیعہدی کی بیعت لیا کرتے تھے، یا اولاد نہونے یا اسکے صغیر سن ہونیکی صورت میں اپنے اور قرابتداروں کو ولیعہد بنایا کرتے تھے وہ لوگ اس بیعت لینے کیواسطے بھی ویساہی جشن ترتیب دیتے تھے جیسا کہ خلفاء کی بیعت لینے کیوقت ہوا کرتا تھا۔ نیز خلفاء کو جس وقت ایسا کرنا منظور ہوتا کہ کسی شخص کو ولیعہدی کیلئے نامزد کریں تو اپنے ارادہ کو اہل الرائے لوگوں سے ظاہر کرکے اُنسے مشورہ لیتے جس طرح کہ خلیفہ منصور عباسی نے کیا، کیونکہ اسنے جسوقت اپنے فرزند مہدی کیلئے بیعت لینی چاہی اور جعفر اس معاملہ میں اسپر معترض ہوا، تو منصور نے لوگوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا چنانچہ جلسہ ہوا اور مقرر لوگوں نے کھڑے ہو کر تقریریں کیں شاعروں نے نظمیں پڑھیں چونکہ ان سبھوں نے مہدی کی تعریف زیادہ کیگئی تھی، اس لئے مہدی کی بیعت غالب رہی۔

خلفا کا یہ بھی دستور تھا کہ جب اپنے بیٹوں یا بھائیوں میں ایک سے زائد شخص کو اپنے خلافت کے قابل دیکھتے تھے، تو ایک بیٹے یا بھائی سے ولیعہدی کی بیعت لیتے اور شرط لگا دیتے کہ اسکا جانشین فلاں ابن فلاں

شخص ہو جیسا کہ یزید بن عبدالملک نے جس وقت اپنی ولیعہدی کی بیعت لینی چاہی اور اسوقت تک اس کا بیٹا بہت ہی کم عمر تھا تو اسنے اپنے بھائی ہشام لئے اس شرط پر بیعت کی کہ اسکے بعد میرا بیٹا ولید بن یزید جانشین ہو اور اکثر صورتوں میں جبکو ضروری اور لازمی بات خیال میں آجاتی تو وقتاً فوقتاً شرائط بیعت میں کچھہ تغیر و تبدل بھی کر دیا کرتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خلیفہ اپنے کسی بیٹے کی ولیعہدی کی بیعت لیتے ہوئے اس شخص کو نامزد کر دیتا جو ولیعہد کا جانشین ہو سکے اور ولیعہد کو اختیار دیدیتا تھا کہ وہ چاہے تو نامزد شدہ شخص کو خلیفہ بنائے اور چاہے نہ بنائے جیسا کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے مامون کیلئے ولیعہدی کا حکم لکھتے ہوئے اور اس کے بعد اپنے دوسرے فرزند قاسم کو نامزد کرتے ہوئے مامون کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ اگر اسکی مرضی ہو تو قاسم کی ولیعہدی قائم رکھے ورنہ اسے علیحدہ کر دے

عہد یا اقرار نامہ یہ ایک تحریر ہوتی تھی جسے خود خلیفہ یا اس کا کاتب (میر منشی) لکھا کرتا تھا اور اسپر خلیفہ اپنی اور اپنے خاندان والوں کی مہریں ثبت کر کے ولیعہد کو یا اسکے متولی کو سونپ دیتا تھا کہ اسے وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھے یہ اقرار نامہ کسی امانت دار کے مکان یا خزانہ یا مسجد یا کعبہ میں محفوظ رکھا جاتا تھا جیسا کہ رشید نے ان دو تحریروں کو جو اسنے اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کیلئے لکھی تھیں اور جنمیں بعد مامون کے قاسم کو نامزد کیا تھا خانہ کعبہ میں ودیعۃً رکھوا دیا تھا ۔

خلافت کی علامتیں

خلافت کی تین علامتیں تھیں ۔ چادر ۔ انگوٹھی اور عصا

چادر یہ چادر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر تھی جسے وہ برابر اوڑھتے رہتے تھے اور آخرکار کعب بن زہیر ابن ابی سلمان نامی ایک مشہور عربی شاعر کو انعام میں دیدی تھی کعب نے درصل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو کی تھی اور مسلمانوں کے مقابلہ میں بھاگ گئے تھے جس زمانہ میں اہل اسلام نے مکہ کو فتح کیا ہے کعب کے بھائی بجیر ابن زہیر نے انکو یہ لکھہ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے ایسے لوگوں کو مکہ میں قتل کر ڈالا ہے جنہوں نے انکی ہجو کی تھی یا انہیں ایذا دی تھی اور قریش کے جتنے شاعر باقی بچے تھے وہ جہاں تہاں بھاگ گئے ہیں لہذا اگر تمہارے دلمیں کچھہ خواہش ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

بہت جلد حاضر ہو جاؤ کیونکہ وہ کسی ایسے شخص کو جو توبہ کرتا ہوا ان کے پاس آئے قتل نہیں کرتے۔ کعب کو اس کے سوا اور کسی صورت میں بہتری نظر نہ آئی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب رجوع کر کے توبہ کریں وہ مدینہ میں آئے اور اپنے آپ کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالہ کر دیا اور اپنے اس مشہور قصیدہ کے ساتھ جس کا مطلع یہ ہے، بانت سعاد فقلبی الیوم متبول ۔ متیم اثرھا لم یفد مکبول نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح کی، آنحضرت نے اُن کی بہت کچھ خاطر مدارات فرمائی بعض صحابہ نے کعب کو قتل کرنا چاہا۔ آپ نے انہیں منع کر دیا اور اپنی چادر مبارک کعب کو عطا فرمائی۔ یہ چادر کعب کے گھرانے میں اسوقت تک موجود رہی جبکہ معاویہ رضؓ بن ابی سفیان نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اُن سے چالیس ہزار درہم کے معاوضہ میں خرید لی اس کے بعد سے اموی اور پھر عباسی خلفاء میں وراثتاً منتقل ہوتی رہی ابوالفدا نے ذکر کیا ہے کہ وہ چادر عباسیوں کے ہاتھ سے نکل کر تاتاریوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی مگر اب یہ چادر مبارک آستانہ (استنبول) میں سرائے قدیم کے اندر (تبرکات نبوی) صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے شاید ابوالفدا یہ معلوم ہونے پر کہ تاتاریوں نے بغداد کو بہت کچھ تاخت و تاراج کیا تھا اور عباسی خلفاء بدحواسی میں مصر کی طرف بھاگ گئے تھے اس وہم میں پڑ گیا ہو کہ تاتاریوں نے خلیفہ کے محل سے جو سامان لوٹا تھا اُسی میں چادر بھی چلی گئی مگر دراصل عباسی لوگ چادر کو اپنے ساتھ مصر لیتے گئے تھے جب سلطان سلیم نے مصر کو فتح کر کے عباسیوں سے خلافت لی تو چادر بھی اسی کے ساتھ لے لی۔

انگوٹھی یا مہر خلفاء نے مہر کا رکھنا محض نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا تھا، اس لئے کہ جس زمانہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قیصر اور کسریٰ کو دعوت اسلام کے خطوط لکھنے چاہے تو اُن سے کہا گیا کہ اہل عجم کسی ایسی تحریر کو نہیں مانتے جس پر اول یا آخر میں مہر نہ ہو لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چاندی کی مہر بنوائی اور اس پر "محمد رسول اللہ" کھدوایا۔ یہ مہر نوبت بہ نوبت ابوبکر رضؓ عمر رضؓ اور عثمان رضؓ تک پہنچی اور عثمان رضؓ کے ہاتھ سے چاہ اریس میں گر گئی اس کے بعد باوجود بڑی تلاش کے جب اس کا پتہ نہ لگا۔ تو عثمان رضؓ نے اسی کے مثل ایک اور مہر بنوالی عثمان رضؓ کے بعد جتنے لوگ خلافت کے متولی ہوئے سب اپنے لئے مہریں بنواتے رہے جن سے خطوط کے شروع یا آخر میں گیرو مٹی یا سیاہی کے ذریعہ سے مہر لگواتے تھے اس کے بعد خطوط بند کرنے کے بعد موم لگا کر اُن مہروں سے نشان دیتے رہے موم مہر کرنیکا عمل خلفاء میں سب سے پہلے معاویہ رضؓ نے فریب ہی سے بچنے کیلئے

اختیار کیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ایک بار زیاد بن ابیہ کو جو کوفہ میں ان کا عامل تھا یہ لکھا کہ عمر بن زبیر کو ایک لاکھ درہم دیدو اور وہی خط عمر کو دیدیا کہ اُسے زیاد کے پاس لیجائیں عمر بن زبیر نے سود کو دو سو بنادیا زیاد نے اتنی ہی رقم انہیں ادا کردی جب اس خرچ کا حساب معاویہ رضی کے سامنے پیش ہوا تب فریب کھلا۔ اسی وقت سے معاویہ نے خطوط اور دستوں کی نگرانی اور ان کے لپیٹنے یا شکن ڈالنے کے بعد دونوں کناروں پر مہر کرنے کا حکم دے دیا۔

بلاذری نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں دیوان خاتم کی بنیاد سب سے پہلے زیاد بن ابیہ نے ولائیت (گورنری) عراق کے زمانہ میں رکھی اُس نے اس طریقہ کو اہل فارس سے حاصل کیا تھا۔ بلاذری ہی کا بیان ہے کہ اسلام سے قبل فارس کے حکمرانوں کی کئی ایک مہریں ہوا کرتی تھیں جنمیں سے ہر ایک ایک خاص غرض کے لئے مستعمل ہوتی تھی۔ ایک مہر رازداری کی تھی ایک خطوط اور مراسلات کی ایک فرمانوں اور جاگیرناموں کی۔ اور ایک مہر خراج کے لئے مخصوص تھی۔ جو شخص ان مہروں کے لگانے پر مامور ہوتا تھا وہ صاحب زمام کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

معاویہ کے عہد سے بنی عباس کے زمانہ حکومت کے وسط تک دیوان خاتم کا شمار بڑے اہم دفتروں میں ہوتا رہا اس کے بعد یہ سررشتہ بالکل نابود ہوگیا۔ کیونکہ اب ان تمام کاموں کی انجام دہی خلیفہ کے قابو سے نکل کر امیروں وزیروں اور سلاطین وغیرہ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید عباسی نے بجائے فضل بن یحییٰ کے جعفر بن یحییٰ کو وزیر بنانا چاہا۔ تو یحییٰ برمکی سے یوں کہا تھا۔ "بابا میں چاہتا ہوں کہ اپنی انگوٹھی کو داہنے ہاتھ سے نکال کر بائیں میں پہن لوں"۔ گویا کہ انگوٹھی کیساتھ وزارت کا کنایہ تھا۔ خلفا کی مہر بہت عزت اور عظمت کی چیز شمار ہوتی تھی۔ جوقت وزیر وغیرہ عہدہ داران حکومت اُسے کسی خط پر لگانے کیلئے اپنے ہاتھ میں لیتے تو خلافت کی تعظیم دینے کیلئے کھڑے ہوجاتے۔ جب کسی تحریر پر مہر کرنی ہوتی تو سیاہی یا رنگین مٹی اسپر ملکر کاغذ پر چھاپ لیتے یا کسی نرم شے پر لگاتے تھے مثلاً معلوم ہوتا کہ اس کے نقش ابھر آئیں کبھی مہر تحریر کے آخر میں کیجاتی تھی اور کبھی شروع میں جس کے ساتھ تسبیح۔ تحمید، یا خلیفہ کے نام کے مسلسل اور مسجع فقروں کی عبارت بھی ملا لی جاتی تھی یا جوان کا جی چاہتا وہ عبارت ملادیتے یہ گویا تحریر کی صحت کی سند ہوتی تھی اور بلا اس عبارت یا مہر کے تحریر نکمی اور غیر مستند سمجھی جاتی تھی۔ مہر کو علامت بھی کہتے تھے۔ +

جب زمانہ میں سلطنتیں قائم ہونے لگیں تو سلطانوں نے بھی علامت خلافت کے انداز پر اپنی علامتیں مقرر کیں اور ان کا نام طغرا رکھا، طغرا ایک قسم کی تحریر ہوتی تھی جو بقلم جلی لکھی جاتی اور اس میں بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا۔ سلاطین کے ہاں طغرا خطوط اور فرمانوں پر خود شاہی دستخط کے قائم مقام متصور ہوتا تھا اور پھر اس کی حاجت نہیں رہتی تھی کہ سلطان اپنے دست خاص سے اسپر کوئی چیز لکھے یا کچھ نشان کرے سلجوقی حکومت میں دیوان انشاء کا نام ہی دیوان طغرا رکھا گیا تھا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس تحریر کا نام طغرا اس لیے رکھا گیا کہ یہ حسین بن ابی اسمٰعیل کی طغرائی کی جانب سے منسوب ہے جو مشہور قصیدہ لامیۃ العجم کا مصنف ہے۔ حسین بن ابی اسمٰعیل مذکور سلطان مسعود سلجوقی کا وزیر تھا وہ بہت خوشنویس تھا اور اس طغرے کو نہایت عمدہ طور سے لکھا کرتا۔ لہذا یہ تحریر اُسی کے نام سے ملقب ہو گئی کیونکہ وہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے ایسی تحریر لکھی تھی (یہ شخص ۵۱۵ھ میں مقتول ہوا) گمان غالب یہ بات کا ہے کہ عثمانی طغراء کی اصل بھی یہی ہے۔ اور وہ سلطان مراد کے کف دست کی صورت نہیں جیسا کہ الہلال نمبر ا جلد ا میں لامارٹین اور جوائن کی سند سے بیان ہوا ہے۔ +

خلفاء مہروں پر اپنے نام نہیں کھدواتے تھے بلکہ وہ اسپر ایسی عبارتیں منقوش کراتے جنہیں کوئی پسند نصیحت ہوتی تھی۔ چنانچہ ابوبکرؓ کی مہر پر نعم القادر اللہ[۱] منقوش تھا اور عمرؓ کی مہر پر یہ عبارت کندہ تھی۔ "کفی بالموت واعظاً یا عمر[۲]" عثمانؓ کی انگوٹھی پر کندہ تھا "لتصبرن اولتندمن[۳]" اور علیؓ کی مہر پر "الملک للہ[۴]"۔ خلفائے بنی امیہ اور بنو عباس بھی اسی طریق کے پابند رہے۔ انمیں سے ہر ایک کے واسطے ایک خاص فقرہ تھا جسے اُسنے اپنی مہر پر کندہ کرایا تھا، اور اکثر اس مہر کی عبارت میں اور خلیفہ کے نام میں کوئی معنوی مناسبت بھی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے کہ مامون کی مہر کا نقش تھا "عبداللہ یومن باللہ مخلصاً[۵]" اور واثق کی مہر پر "اللہ ثقۃ الواثق[۶]" کندہ تھا۔ متوکل کی انگوٹھی پر "علی اللہ توکلت[۷]" اور معتمد کی خاتم پر "اعتمادی علی اللہ وحدہٗ" منقوش تھا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

ان دنوں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تبرکات کو علامات خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو آستانہ علیہ کے محل موسومہ سرائے قدیمہ کے اندر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ایک خاص کمرہ میں چاندی کے صندوق کے اندر محفوظ ہیں۔

---

[۱] اللہ ہی سب سے بڑھکر قادر ہے۔ [۲] اے عمر موت کافی واعظ ہے۔ [۳] یا صبر یا ندامت [۴] ملک اللہ ہی کا ہے [۵] بندۂ خدا خدا پر اخلاص کیساتھ ایمان لاتا ہے [۶] خدا کا بھروسہ پکا ہے [۷] میرا بھروسہ اللہ پر ہے اور وہی میرے لئے کافی ہے

یہ تبرکات حسب ذیل ہیں۔ (۱) چادر (۲) نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک دندان مبارک (۳) حضور اطہر کے چند موئے مبارک (۴) آپ کی پاپوش مبارک (۵) علم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کچھ باقی حصہ (۶) دو لوہے کے برتن جنکی بابت کہا جاتا ہے کہ انہیں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تمزم کا پانی پیا کرتے تھے۔ (۷) امام ابی حنیفہ کا جبہ (۸) سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا ذراع۔ ہر سال رمضان شریف کی ۱۵ تاریخ کو ان تبرکات کی زیارت ہوتی ہے جلالتمآب سلطان المعظم معہ اپنے جلوس سواری کے محل موصوفہ بالا کی جانب تشریف لے جا کر وہاں رسم زیارت ادا فرماتے ہیں اور ان متبرک چیزوں سے برکت حاصل کرتے ہیں اسموقعہ پر سلطنت کے بڑے بڑے ارکین اور عہدہ دار بھی سلطان کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔

عصا خلافت کی تیسری علامت تھی جبکوئی نیا خلیفہ مسند نشین ہوتا تو چادر انگوٹھی عصا اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ بنی امیہ اور بنی عباس میں یہ دستور ہمیشہ جاری رہا۔

خلافت کی نشانیاں

خلافت کی نشانیاں بھی تین تھیں۔ خطبہ، سکہ، اور طراز (مارکہ)

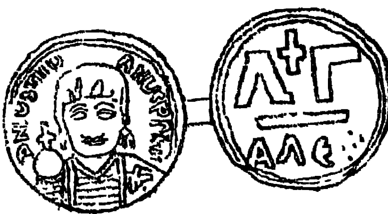
خطبہ خلافت کے نشانات میں سے ایک یہ تھا کہ نمازمیں منبروں پر خلیفہ کیلئے دعا مانگی جائے اس کی اصلیت یوں تھی کہ خلفاء بذات خاص نماز پڑھانے کا کام انجام دیتے تھے، وہ لوگ نماز کے فرائض کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیلئے دعا و صحابہ کیواسطے رضائے خدا کی استدعا پر تمام کیا کرتے تھے جس زمانہ میں خلفائے نے ممالک فتح کئے اور انپر عمال اور والیوں کا تقرر کیا تو یہ حکام اپنی لائق ہیں امامت کے متولی ہونے لگے انکا یہ دستور ہو گیا کہ جب نماز پڑھاتے تو اسے خلفا کیلئے دعا کرنے پر ختم کرتے سب سے پہلے جس والی نے یہ کام کیا وہ عبداللہ بن عباس رضی تھے جب حضرت علیؓ کے عہد میں عامل بصرہ مقرر ہوئے تو منبر پر ایستادہ ہو کر کہا "اللھم انصر علیا" پھر انکے بعد بھی یہ طرز برابر جاری رہا رفتہ رفتہ کسی ملک میں خلیفہ کیلئے دعا کا مانگا جانا وہاں اسکی حکومت ہونیکی علامت قرار پا گیا۔ بغداد میں خلفاء کی حالت کمزور ہونے لگی تو وہ امیر و سلطان جو خلیفہ کو قابو کر لیا کرتے تھے، اس دعا میں خلفاء کے شریک بن گئے اور خلفاء کے ناموں کے بعد اپنے ناموں کو ذکر کرنے لگے اسکے اور بعد والے زمانہ میں خود سلاطین خاص اپنے ہی واسطے مستقل طور پر دعا منگوانے لگے گو خلفاء راشدین

کے حق میں دعا کرنا آجتک جاری ہے اور تمام اسلامی ملکوں اور اسلامی آبادیوں میں ہر ایک جماعت جمعہ کے وقت ان کے لئے منبر پر دعا کیجاتی ہے۔

سکّہ خلافت یا علی الاطلاق شاہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ نقود (روپیہ پیسہ اور اشرفی) پر ایک لوہے کے ٹھپے سے نقش ابھارے جاتے ہیں جس میں خلیفہ یا سلطان کا نام کھدا ہوتا ہے، اس کو سکّہ کہتے ہیں، اور سکہ حکومت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔

اسلام سے پیشتر اہل عرب کے نقود اسلام سے قبل اہل عرب کسریٰ اور قیصر کے سکوں سے کام چلاتے تھے جو درہم اور دینار کہلاتے تھے، دینار سنہری اور درہم روپہلی سکّے ہوتے تھے، ایسے جیسے آجکل ہمارے ہاں گنی اور ریال ہوتے ہیں اہل عرب سونے کو "عین" اور چاندی کو "ورق" سے تعبیر کرتے تھے، اُن کے یہاں ٹھپہ سکے تانبے کے بھی رائج تھے، جنہیں "حبہ" اور "دانق" کا نام مشہور ہے۔ لیکن ان تمام نقدیات کا صحیح وزن تھا۔ کیونکہ دینار سے وہ سونے کا ٹکڑا مراد تھی جسکا وزن ایک مثقال ہو اور جس پر اُس بادشاہ یا شہنشاہ کا سکہ ہو جس نے اُسے ضرب کیا ہو درہم سے ایک درم کے ہموزن چاندی کا سکہ مراد ہوتا تھا۔ جس کو "وافی" بھی کہتے تھے، آجکل دینار اندازاً دس فرانک کے برابر ہوتا ہے، اہل عرب کے یہاں دینار دس درم کا ہوتا تھا اور بسا اوقات اس کی قیمت ۱۲ آنک دس اور پندرہ کے مابین بدلتی رہتی تھی یا حالات کے موافق کبھی اس سے بھی بڑھجاتی گویا درہم فرانک کے برابر ہوتا تھا یا بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ ایک چاندی کا درم تقریباً چار غروش مصری کے مساوی ہوتا تھا۔ +

احکام السلطانیہ کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ فارسی درہم تین وزنوں کے ہوا کرتے تھے (۱) مثقال کے وزن سے بیس قیراط بھر اسی کو دراہم بغلیہ کہتے تھے (۲) جس کا وزن ۱۲ قیراط ہوتا تھا (۳) وہ درم جو وزن میں دس قیراط ہوتا مصنف مذکور کے علاوہ اور لوگوں نے ایسے درموں کا ہونا بھی بیان کیا ہے جنہیں سے صرف ایک درم کا وزن

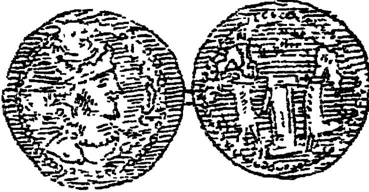


(دینار رومی)

چھ مثقال ہوتا تھا اور ان کو "بھاری درہم" کہتے تھے اور ایک درم پانچ مثقال کے برابر ہوتا جسکا سنہری

درہم کہتے تھے یہ سب درہم ملک فارس کے سکے تھے۔

اسلام سے قبل عرب والوں کے یہاں دو طرح کے دینار پائے جاتے تھے (۱) ہرقلی یا رومی (۲) کسروی یعنی فارسی درم بھی ایسے ہی تھے لیکن گمان غالب ہے کہ انکے لین دین میں رومی دینار اور فارسی درہموں کا استعمال ہوتا تھا اسی وجہ سے ہرقلی دینار انہیں بہت عزیز اور پسند تھے یہانتک کہ ان کی خوبصورتی اور چمک دمک کو انہوں نے ضرب المثل بنا رکھا تھا:



(دینار فارسی)

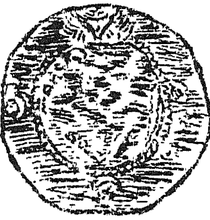
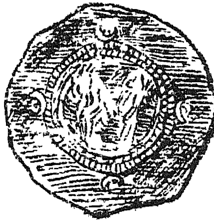
دینار لاطینی زبان کا لفظ ہے اسکی اصل ایک ایسے چاندی کے ٹکڑے پر دلالت کرتا ہے جو دس "آس" کے مساوی ہو "آس" رومی درہموں میں سے ایک قسم کا درہم ہوتا تھا اسی لئے پہلے پہل دینار مضروب ہوا تھا دینار کا لفظ لاطینی زبان والوں کے یہاں لفظ (Deni) سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں دس۔ اس دینار کا وزن سات رومانی اوقیہ یا ایک رطل (لیبرہ) کے سویں حصے کے برابر ہوتا تھا یعنے وہ لوگ ایک لیبرہ چاندی کو سو دینار پر تقسیم کرتے تھے اس کے بعد اُن لوگوں نے طلائی دینار مضروب کیا۔ اسی سبب سے انکے یہاں دو قسم کے دینار ہوگئے ایک چاندی کا اور دوسرا سونے کا۔ لاطینی لوگوں سے اہل فارس نے سیکھہ کر اپنے یہاں بھی ویسے ہی سکے مضروب کئے اور انہیں ناموں سے موسوم کیا۔

اسلامی سکے۔ اہل عرب ظہور اسلام اور ملکوں کو فتح کرنے کے بعد حکومت اسلامی کے زمانہ قیام تک رومی اور فارسی سکوں سے لین دین کرتے رہے، مگر قیام سلطنت کے بعد ان کو اپنا تمدن قائم کرنا منظور ہوا اس تمدن کی ضروریات میں سکہ بھی داخل تھا، لہذا انہوں نے پہلے پہل اپنے اور اہل روم و فارس کے مابین مشترک وضع کے درم و دینار مضروب کئے۔



ان سکوں میں سے ایک سکہ وہ تھا جسے سنہ ۱۵ھ میں خالد بن الولید رض نے بمقام طبریہ مضروب کرایا یہ سکہ بالکل رومی دینار کے ہمشکل تھا، اسمیں ایکطرف صلیب، تاج اور چوگان وغیرہ کا نقش تھا اور دوسری طرف یونانی حروف میں خالد کا نام (XA.ΛΕΑ)

اور یہ حروف (Bom) منقوش تھے اس شکل ناقابل طبع آلکٹر ہوا مشہور جرمن مورخ گمان کرتا ہے کہ یہ حروف "ابو سلیمان" کے مقطع ہیں، جو خالد کی کنیت تھی۔

(نقود معاویہ بن ابی سفیان)

ایک اور دوسرا قطعہ بھی تھا جو معاویہؓ کے نام پر مضروب ہوا تھا۔ لیکن اس کی شکل فارس کے ایک دینار سے نقش و نگار وغیرہ میں ملتی ہوئی تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ اس پر معاویہؓ کا نام تھا اور فارسی دینار پر نہیں۔ اس کی شکل بھی ہم نے ڈاکٹر مولر مذکور سے نقل کی ہے دمیری نے ایک قسم کے نقود کا ذکر کیا ہے جن کو "بغلیہ" کہتے تھے، وہ کہتا ہے کہ "راس البغل" نے اسے عمر بن الخطابؓ کیلئے ایک کسروی سکہ سے مضروب کیا تھا جس پر بادشاہ کی تصویر تھی اور کرسی کے نیچے فارسی عبارت میں "نوش خور" لکھا تھا جس کے معنی ہیں آرام سے کھاؤ۔

جودت پاشا مرحوم کا بیان ہے کہ میں نے ایسے نقود بھی دیکھے جن کو امیروں اور والیوں نے خلفائے راشدین کے عہد میں مضروب کرایا تھا، ان سکوں میں سب سے قدیم سکہ طبرستان کے قصبہ ہرنگ میں سنہ ۲۸ھ کے اندر مضروب ہوا تھا جس کے دائرہ پر خط کوفی میں "بسم اللہ ربی" لکھا ہوا تھا اور ایک قسم کا سکہ سنہ ۳۸ھ کا ضرب کیا ہوا دیکھا۔ جس کے دائرہ پر بھی یہی عبارت موجود پائی اور ایک سکہ سنہ ۶۱ھ میں بمقام یزد مضروب ہوا تھا جس کے دائرہ پر پہلوی خط میں "عبداللہ بن زبیر امیر المومنین" منقوش تھا، مگر یہ سکے اسلامی حکومتوں میں رواج معتبر نہ تھے بلکہ اکثر ان کے لین دین رومی اور فارسی نقود سے ہوتے تھے سنہ ۶۵ لغایت ۸۶ھ) عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں یہ صورت پیش آئی کہ اس خلیفہ نے طراز (مارکہ) کو رومی سے عربی میں بدلنا چاہا جس کا بیان آگے آئیگا شاہنشاہ روم کو یہ بات ناگوار گذری اس نے خلیفہ عبدالملک کو دھمکی دی کہ تم طراز کو بدلوگے تو میں اپنے دیناروں پر نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے خلاف شان الفاظ منقوش کراؤنگا۔ عبدالملک کو اس بات کے سننے سے سخت صدمہ گزرا اس نے مسلمانوں میں سے بڑے بڑے ذی وجاہت اور اہل الرائے لوگوں کو جمع کرکے ان سے اس بارہ میں رائے لی انہیں لوگوں میں سے کسی نے اسے بتایا کہ اس معاملہ میں امام محمد باقر سے جو اہل تشیع کے بارہ اماموں میں سے ایک امام ہیں

اور اسوقت مدینہ میں رہتے تھے) مشورہ لو۔ اگرچہ عبدالملک کو گوارا تو نہ تھا کہ بنو ہاشم کے کسی امام سے کچھ مدد مانگے اس لئے کہ وہ حکومت اور ملکداری میں اس کے مقابل بنتے تھے۔ لیکن مجبوری تھی اُن سے مدد لئے بغیر کام بھی نہ چل سکتا تھا اس لئے انہیں بلوانا ہی پڑا۔ عبدالملک نے اپنے عامل کو جو اسکی طرف سے مدینہ میں معتبر تھا، لکھا۔ محمد بن علی بن حسینؓ کو بہت عزت کے ساتھ میرے پاس بھیجدو اور انہیں ایک لاکھ درم سفر خرچ کے لئے اور تیس ہزار درم خرچ خانگی کیواسطے نذر کرو۔ اس کے علاوہ وہ خود وہ یا جو لوگ ان کے ہمرکاب سفر کرنے پر آمادہ ہوں سب کے لئے سفر کے سامان میں آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ جب امام محمد باقر دمشق میں آگئے تو عبدالملک نے اُن سے شاہنشاہ روم کی نیت کا حال بیان کرکے اُن سے بارہ میں مشورہ چاہا۔ کیونکہ رومی شاہنشاہ اسلام کیساتھ بدسلوکی پر آمادہ تھا۔ امام موصوف نے فرمایا۔ تم اسبات پر پریشان نہ ہو۔ بہتیرے کاریگروں کو بلاؤ وہ تمہارے سامنے ہی بیٹھ کر درم اور دینار کے سکے تیار کریں۔ پھر توحید باری اور ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منقوش کراؤ۔ درم اور دینار کے ایک طرف ذکر خدا ہو اور دوسری جانب ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور درم و دینار کی گولائی میں اس شہر کا نام ہو جہاں وہ مضروب ہوں اور سنہ جس میں ضرب کیا گیا۔ علاوہ بریں تیس درہموں کو تینوں قسم کے درہموں میں سے منگا کر وزن کرو۔ دس وہ جنکا وزن دس مثقال فی درہم ہوتا ہے اور دس چھ مثقال فی درہم وزن والے اور دس درہم پانچ پانچ مثقال کے۔ ان تینوں کا وزن ۲۱ مثقال ہوگا مجموعی وزن کو تیس پر تقسیم کرنے سے فی درہم سات مثقال کا وزن پڑیگا۔ کانچ کے باٹ ڈھلوائے جائیں جو سات مثقال سے کم یا بیش نہوں اس کے بعد دینار دس مثقال وزن کے اور درم سات مثقال کے مضروب کئے جائیں گے

عبدالملک نے اس رائے پر عمل کرکے اپنے سکے تمام اسلامی ممالک میں بھجوا دیئے اور لوگوں کو انہیں کا لین دین کرنے کی ہدایت کی۔ ان درہموں اور دیناروں کے علاوہ اور سکوں سے معاملہ کرنے والوں کو قتل کی دھمکی دی اور ہدایت کی کہ اس سے پہلے کے رائج سکے بیکار کرکے ٹکسالوں میں داخل کردیئے جائیں تاکہ وہ دوبارہ اسلامی سکوں کی شکل میں مضروب کئے جائیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ میری کا قول تھا۔ لیکن ابن اثیر نے یہ رائے خالد بن یزید بن معاویہ کی جانب منسوب کی ہے اور ابن اثیر کے علاوہ اور لوگوں نے اسے بعض دوسرے شخصوں کیجانب بھی منسوب کیا ہے عبدالملک کے ضرب کرائے ہوئے دینار "دینار دمشقی" کے نام سے منسوب ہیں۔ عبدالملک کے عامل حجاج نے

جو ملک عراق کا گورنر تھا۔ یہ حکم دیا کہ دینار کی قیراطوں سے پندرہ قیراط کا درم مضروب ہو اسکے بعد عراق کے امراء (حکام) اکثر حالتوں میں بنی اُمیہ کے لئے سکے ضرب کرتے رہے۔

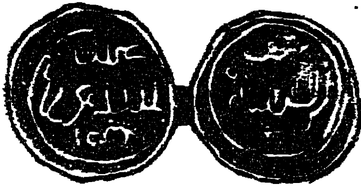
بنو اُمیہ کے سکوں کا نقش ایک جانب بیچ میں "لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" اور اس کے گرد "بسم اللہ ضرب ہذا الدرہم ببلد کذا سنۃ کذا" ہوتا تھا اور دوسری طرف وسط میں "اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد" جس کے گرد "محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" منقوش ہوتا تھا۔ یہ عبارت دینار اور درم دونوں پر یکساں نقش کیجاتی تھی



(نقود عبد الملک بن مروان)

اُسی وقت سے مسلمانوں نے رومی اور فارسی سکوں کا استعمال ترک کر دیا۔ بنی اُمیہ کے نقود میں سب سے زیادہ جید سکے وہ تھے جن کو عمر بن ہبیرہ نے مسکوک کرایا تھا اور وہ "ہبیریہ" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے علاوہ دو سکے اور بھی تھے (۱) "خالدی" منسوب بہ خالد بن عبد اللہ البجلی (۲) "یوسفیہ" یوسف بن عمرو کے مضروب کئے ہوئے۔ یہ سب لوگ اموی خلفاء کی جانب سے ملک عراق پر عامل تھے۔ چنانچہ جس وقت عنان خلافت بنو عباس کے ہاتھ میں گئی ہے۔ تو خلیفہ منصور عباسی وصول خراج کے وقت سوائے ان تین سکوں کے زمانہ بنی اُمیہ کے دوسرے سکے ہرگز نہیں لیا کرتا تھا۔

اسلامی نقود کی تاریخ نہایت طویل ہے جس کے بیان کا یہ موقع بھی نہیں ہماری کتاب "تاریخ مصر الحدیث" میں اکثر نقود اسلامی کی شکلیں اور اُن کے مضروب کرانیوالوں کے نام مذکور ہوئے ہیں۔ مگر مختصراً اسقدر کہنا ضروری ہے کہ اسلامی مسکوکات مسلمانوں کی تمام دار السلطنتوں اور اُن کے مشہور شہروں میں جو ممالک عراق۔ شام۔ اندلس۔ خراسان اور ہندوستان وغیرہ میں واقع ہیں مضروب ہوئے تھے۔ اور وہ سب سکے شکل۔ جسامت اور عبارت میں ایک دوسرے سے ویسے ہی جدا ہوتے تھے۔ جیسے زمانہ اور حکومتیں جدا جدا ہوتی تھیں۔ پہلے ان کی تحریر خط کوفی میں ہوا کرتی تھی بعد ازاں مروجہ خط نسخ میں لکھی جانے لگی۔ یہ تغیر سنہ ۶۲۱ھ میں العزیز محمد بن صلاح الدین الایوبی حاکم مصر کے عہد میں ہوا۔



بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام اوائل میں
دوسری صدی ہجری کے آغاز تک سکوں کی عبارت میں
اس شہر کا ذکر نہیں کیا کرتے تھے جس میں وہ مضروب
ہوا ہو بلکہ جس وقت ضرب کی تاریخ کا ذکر کرتے تو اس کے
پہلے سنہ کا لفظ لکھتے تھے، بعد میں اس لفظ کو بھی

(نقود العزیز بن صلاح الدین)

لفظ "عام" سے بدل دیا اور اکثر حالتوں میں یوں لکھتے تھے "فلاں سنہ کے مہینوں یا فلاں کے مہینوں میں یا فلاں شخص کے عہد حکومت میں"۔ تاریخ ابتداءً تعداد جمل کے حساب سے حرفوں میں لکھی جایا کرتی تھی، بعدہٗ رقموں میں لکھی جانے لگی، سب سے پہلے جو سکے ایسے پائے گئے کہ ان پر رقموں میں تاریخ لکھی تھی، وہ سنہ ۶۱۴ھ کے ڈھلے ہوئے تھے۔

دار الضرب یا ٹکسال

سلطنت کے لئے اس وقت بھی دار الضرب کا وجود ویسا ہی ضروری تھا جیسا کہ ہم آجکل دیکھتے ہیں اور اسلامی حکومتوں کی ان کے ہر ایک دور میں یہی حالت تھی، چنانچہ کوئی پائے تخت یا صدر مقام ٹکسالوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔ بغداد، قاہرہ، دمشق، بصرہ، اور قرطبہ وغیرہ میں تو بہت بڑی بڑی ٹکسالیں تھیں، دار الضرب میں ان نقود پر جو وہاں مضروب ہوتے تھے ایک قسم کا محصول (ٹکس) لیا جاتا تھا جسے لکڑی کی قیمت اور سکہ ڈھالنے والوں کی اجرت سے موسوم کرتے تھے، اس ٹکس کی مقدار ایک درم فیصدی تھی بسا اوقات باختلاف مقامات یہ ٹکس بھی مختلف ہوتا تھا، اور حکومت کو اس مد سے معقول آمدنی ہو رہتی تھی۔

جس تعداد کے سکے کوئی سلطنت مضروب کراتی تھی اس کی حالت مختلف ہوتی تھی، لہذا اسبات کا صحیح اندازہ کرنا کہ ہر سلطنت میں اتنے سکے مضروب ہوئے ایک دشوار امر ہے کیونکہ مسلمانوں کے یہاں سکے کی حالتیں بہت کچھ بدلتی رہتی ہیں کبھی تو ایک حکومت کے قیام کو کئی کئی سال گذر جاتے تھے مگر وہ اپنا سکہ مضروب نہ کراتی تھی بلکہ کسی دوسری سلطنت کے سکوں سے کام چلاتی رہتی تھی کبھی ایسا ہوتا کہ اپنے یہاں بھی نقود ڈھلواتی اور دوسری حکومتوں کے نقود سے بھی معاملت رکھتی تھی، ان سب باتوں کا مفصل بیان تو محال ہے لیکن ہم مثال کے طور پر جو کچھ اسبات کے متعلق ہمیں مل سکا یہاں لکھے دیتے ہیں:-

"نفح الطیب" میں آیا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جبکہ اندلس کی حکومت بنی مروان کے قبضہ میں تھی وہاں کے علاقہ ٹکسال کی آمدنی جو صرف درہموں اور دیناروں کے ڈھلنے سے حاصل ہوتی تھی ۳۰۰۰۰۰ دینار تک

پہونچ گئی تھی، دینار کا تبادلہ سترہ درہموں سے ہوتا تھا ہم اس آمدنی کو ایک فیصدی مال مضروب کے اعتبار سے دیکھیں تو محض ان نقدیات کی تعداد جو اندلس میں مضروب ہوتے تھے ۲۰۰۰۰۰۰ دینار ہوتی تھی جو ایک کروڑ گنی کے مساوی ہے اور اس تعداد سے دو حصے بڑھ کر جو آجکل دولت انگلشیہ مضروب کراتی تھی حالانکہ اسکی عظمت و جبروت تمام عالم میں آشکارا ہے، اور وہ اسوقت پورے عروج پر ہے اگر نقود مضروبہ اندلس ان سکوں کی تعداد کا بھی اضافہ کیا جائے جو دولت فاطمیہ کے پایۂ تخت قاہرہ اور حکومت عباسیہ کی دارالسلطنت بغداد اور اس کے ماسوا اُن دیگر بڑے بڑے اسلامی شہروں میں جو اُنکی حکمرانی کے مرجع بن رہے تھے مضروب ہوتے تھے، تو ان سب مسکوکات کی تعداد بڑی بھاری ہو جائیگی۔

اُس زمانہ میں نقود کی ضرب نہایت سادہ حالت میں تھی یعنے ایک لوہے کا سانچہ لے کر اسمیں وہ عبارت جس کا درم یا دینار پر اُبھارنا مقصود ہوتا، الٹی نقش کیجاتی پھر سونے یا چاندی کے ٹکڑے جسکا وزن درم اور دینار کے برابر ہوتا تھا، لیکر سانچہ (ٹھپہ) کو اسپر رکھتے اور اوپر سے ایک بھاری گھن لے کر چوٹیں لگاتے یہانتک کہ ٹھپہ کے حروف اس طلائی یا نقرئی ٹکڑے پر نمایاں ہو جاتے، پہلے ہی لوہے کے ٹھپے کا نام سکہ رکھا گیا تھا اسکے بعد اس نشان کو کہنے لگے جو نقدیات پر بن جاتا تھا، پھر اس سے بھی لمبے زمانہ میں معنے منتقل ہو کر اس کام کے انتظام اور انجام دہی کیلئے مستعمل ہونے لگے جو کہ ایک عہدہ تھا، لہذا یہ لفظ اس منصب کا علم (مخصوص نام) ہو گیا۔ دارالضرب میں بہت سے چھوٹے بڑے عہدے ہوتے تھے، اور انکے علاوہ بہت سے کاریگر تولنے ناپنے ضرب لگانے اور ٹھپے کہنے والے وغیرہ۔

طراز | طراز (مارکہ) بھی علاماتِ خلافت میں داخل تھا۔ مارکہ کا وجود سلطنتوں میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، اہل روم و فارس کے یہاں بھی اس کا استعمال جاری تھا۔ مارکہ کی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ لوگ یا سلاطین اپنے ناموں یا مخصوص علامتوں کو اپنے لباس کے کپڑوں پر جو دیبا یا حریر یا ریشمی قسم کے ہوتے تھے، منقوش کراتے۔ مگر اس طور سے کہ گویا وہ کوئی تحریر ہے جو بناوٹ ہی میں کپڑوں کے لکھدی گئی ہے، یہ تحریر کلابتوں یا کپڑے کی رنگت سے کسی مختلف رنگ کے دھاگوں سے بنی جاتی تھی اسکی وجہ سے اعیان دولت کے یا شاہی لباس میں ایک خاص قسم کا امتیازی فرق پیدا ہو جاتا تھا اور دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا کہ اس لباس کا پہننے والا خود بادشاہ ہے یا اسکا کوئی عزیز و قریب جیسا کہ آجکل فوجی لوگوں کے لباس میں طرح طرح کی علامتیں ہوتی ہیں کسی کی وردی پر سنہری روپہلی فیتے لگے ہوتے ہیں اور کسی میں دو تمغے وغیرہ مختلف علامتوں کا

امتیاز ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً تاج کی تصویریں، تلواروں کے نقش یا ستارے وغیرہ بنے ہوتے ہیں اور
ان سے عہدوں اور مراتب کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

روم اور فارس کے حکمران اپنے یہاں کے نامور بادشاہوں یا خود اپنی ہی تصویروں کو طراز پر منقور
کیا کرتے تھے، یا اور ایسی صنع کے دیگر نشانات جو حکمرانی پر دلالت کرتے ہوتے تھے، مسلمانوں نے قیصر و
کسریٰ کے تخت پر جلوس کرنے کے بعد عظمت شاہانہ کے زمانہ میں انکی پیروی پسند کی لیکن انہوں نے
بعض حدیثوں کی عبارت میں تصویروں کی حرمت پائے جانے کا خیال کر کے تصویروں کو ترک کر دیا اور
انکے بدلے اپنے ناموں کا لکھنا یا بعض ایسے کلموں کا منقوش کرانا مناسب سمجھا جو فال یا دعا کے قائم مقام ہوں۔

مسلمان شاہنشاہوں میں سب سے پہلے جس شخص نے طراز کو عربی زبان میں نقل کیا وہ عبدالملک بن
مروان اموی تھا خلفائے راشدین اپنی اسی دیانہ سادگی کے دلدادہ رہے اور انہوں نے اس قسم کی شان و شکوہ
دکھانے کا خیال تک نہیں کیا تھا کاروبار خلافت پر بنی امیہ کا قبضہ ہونا اور انکا اہل روم سے میل جول اس بات
کا موجب ہوا کہ مسلمان حکمران بھی حکومت کے اکثر طرز و انداز میں اہل روم کے قدم بقدم چلیں منجملہ انہیں
تقلیدوں کے ایک بات یہ بھی تھی کہ روم والوں کے کپڑوں، بار برداری اور سواری کے جانوروں
اور قرطاسوں پر مارکہ بنا ہوتا تھا (قرطاس ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جو ملک مصر میں بنا کرتی تھی اور اس میں
باندھ کر ظروف اور کپڑے ملک عرب کو بھیجے جاتے تھے) مسلمانوں نے طراز کو بالکل اسی انداز سے استعمال
کرنا شروع کر دیا جیسا کہ اہل روم کے یہاں مستعمل تھا، اور اسپر کی عبارت بھی رومی زبان ہی میں تحریر ہوتی رہی
عبدالملک بن مروان کے عہد تک وہ اسی طریقہ پر عامل رہے جس نے اس طراز کو عربی زبان خط میں بدلا
اور اس جدید تغییر کی ابتداء قرطاسوں ہی سے شروع کی۔ قرطاس ملک مصر میں بنی جاتی تھی مصر کے اکثر
باشندے اس زمانہ میں اپنے اصلی مذہب عیسائیت ہی کے پابند ہونے کے لحاظ سے قرطاسوں پر رومی زبان
کا طراز بناتے تھے جس کی عبارت بسم الاب والابن والروح القدس ہوتی تھی۔ اسلام کا ظہور ہوا ملک مصر
اور شام فتح ہو کر اہل اسلام کے قبضہ میں آ گئے لیکن طراز اپنی پہلی حالت پر قائم رہا، عبدالملک اس
بات سے یوں مطلع ہوا کہ ایک دن وہ اپنے دربار میں بیٹھا تھا کہ اس کی نظر کسی قرطاس پر جا پڑی اُسنے دیکھا
کہ اسپر رومی زبان اور خط میں طراز بنا ہے اُسے خیال گذرا کہ اس کے مضمون سے آگاہی حاصل کرے
حکم دیا کہ اس عبارت کا عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ ترجمہ ہوا اور مضمون سے مطلع ہو کر عبدالملک کو یہ بات نہایت شاق

گذری اور اس نے کہا "دین اور اسلام کے اندر یہ کیسی سخت نازیبا بات ہے کہ قرطاسوں وغیرہ کا طراز جو ملک مصر میں جانوروں وغیرہ کی شکل میں بنایا جاتا ہے ساری دنیا میں رائج رہے اور اس میں اس قسم کی لغو صورتیں اور باتیں لکھی ہوں" اس کے بعد اس نے اپنے بھائی عبد العزیز بن مروان کو جو حاکم مصر تھا لکھا کہ اس طراز کو بند کر دے جو قرطاس یا کپڑوں پر بنایا جاتا ہے۔ اور جو عبارت اس پر تحریر ہوتی ہے اُسے توحید کے کلمۂ "لا اله الا ھو" سے بدل دے۔ عبد العزیز نے اپنے حکمران بھائی کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد تمام اسلامی حکومتوں میں یہی طراز مستعمل رہا۔ اس کے اصل اصول میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔ نیز عبد الملک نے اپنے ملک کے تمام عاملوں کو حکم بھیجا کہ اہل روم کے طراز سے آراستہ قرطاس جسقدر انکی حدود اثر میں دستیاب ہوں ان سب کو تلف کر دیں اور آئندہ جس شخص کو ایسے قرطاس کا استعمال کرتے دیکھیں اُسے بڑی بھاری قید اور سخت ضرب کی سزا دیجایا کرے۔

اس امتناعی حکم کا نتیجہ ظاہر ہے کہ جسقدر رومی طراز بنے ہوئے قرطاس اور دیگر سامان اسلامی ممالک میں فروخت کی غرض سے موجود تھے وہ سب بیکار ہو کر ممالک روم کو واپس گئے اور نیز نئی ساخت کے قرطاس بھی رواج پا کر ملک روم میں پہنچے۔ شاہنشاہ روم کو اس بڑے انقلاب کی اطلاع ملی۔ اور جب وہ اسلامی وضع کے قرطاسوں پر لکھی ہوئی عبارت سے مطلع ہوا تو اُسے بہت غصہ آیا۔ جوش غضب میں اُسنے عبد الملک بن مروان کو لکھا کہ "ملک مصر میں قرطاسوں کا بنانا اہل روم کے ہاتھ ہے اور وہاں جتنی چیزوں پر طراز بنایا جاتا ہے وہ سب رومی زبان میں ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے پس اگر تم سے پہلے خلفا اس عمل کے جاری رکھنے میں حق پر تھے تو تمنے بڑی غلطی کی ہے کہ اب اسے باطل کر دیا اور اگر تمنے امر حق کو رائج کیا ہے تو تمکو ماننا پڑیگا کہ تمہارے اگلے پیشوا غلطی پر تھے اب تم کو اختیار ہے کہ ان دو الزاموں میں سے جونسا پسند کرو اپنے اوپر لیلو" اس اشتعال دلانیوالی تحریر کے ساتھ ہی کچھ دوستانہ تحفے بھی روانہ کئے جن سے مقصود یہ تھا کہ عبد الملک خوش ہو کر اگلے طراز کو رائج رکھے۔ عبد الملک نے ہدیہ واپس کر دیا اور سفیر روم کو صاف جواب دیدیا۔ کہ "میں اپنے فرمان کی تردید نہیں کرونگا" دوبارہ قیصر روم نے اور بہت سے عمدہ عمدہ تحائف نذر کرکے اسی قدیم طراز کا رواج چاہا۔ اور اپنی تحریر کا صاف جواب طلب کیا۔ عبد الملک نے کوئی جواب نہیں لکھا۔ اسپر شاہنشاہ روم کو اور بھی جوش آیا اور اسنے عبد الملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر میری بات نہ مانوگے تو میں نقدیات پر نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف شان الفاظ

منقوش کرا دونگا۔ یہ تخویف عبدالملک کو چونکا دینے اور خالص اسلامی نقود بنوانے کی محرک ہوئی جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ قرطاسوں کا معاملہ تو یہ تھا جس سے ظاہر ہو گیا کہ اہل اسلام کپڑوں پر طراز بنانے کیلئے اُس وقت سے متنبہ ہوچکے تھے۔ اُنہوں نے فوجی سپاہیوں کے اور عہدہ داران سلطنت کے لباسوں پر حکومت کا طرز بنایا جو کہ خلیفہ کا نام یا اُس کا لقب ہوا کرتا تھا۔ یا اسی کے مثل کوئی اور عبارت اُس طراز کا علامات حکومت یعنے علموں، جھنڈوں، اور وردیوں پر باقی رہنا اس کے قیام اور بقاء پر دلالت کرتا ہے اسلئے جب کوئی والی (حاکم صوبہ) خلیفہ کی اطاعت سے نکلنے کا قصد کرتا تو اس کا خطبہ بند کر دیتا اور طراز سے اُسکے نام کو خارج کر دیتا تھا جیسا کہ مامون الرشید نے اپنے گورنر خراسان ہونیکے زمانہ میں کیا تھا جب اُسے یہ خبر لگی کہ اسکے بھائی امین نے جو خلیفہ تھا اُسکی بیعت کا عہد توڑ ڈالا ہے تو وہ بھی باغی بن بیٹھا اور اپنے حق کا مطالبہ کرنیکے لئے جنگ پر تیار ہو گیا۔

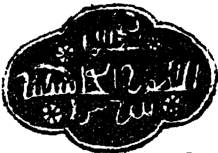
خلفاء نے اپنے قصروں میں طراز بنانے کے بڑے بڑے کارخانے کھولے تھے جنمیں اُنکے خاص لباس بنے جاتے تھے اور ان پر اس طراز کو منقوش کیا جاتا تھا اس کارخانہ کا نگران و منتظم "صاحب الطراز" کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ صاحب الطراز۔ رنگ اوزار اور بننے والوں کے کام کا نگراں رہتا تھا انکی مزدوری اور تنخواہیں تقسیم کراتا اور ان کی کارگزاریوں کو اپنے ذریعہ سے بارگاہ خلافت میں پیش کرتا خلفاء کا اصول تھا کہ اس کارخانہ کا کاروبار اپنے خاص الخاص اراکین دولت اور معتمد غلاموں کے سپرد کیا کرتے تھے۔ اندلس میں دولت امویہ اور مصر میں حکومت فاطمیہ نے بھی اسی طریقہ پر عمل کیا اور اس زمانہ میں جو بادشاہان عجم حکمران تھے ان کے یہاں بھی یہی حالت تھی۔

حکومت بنی فاطمہ کے عہد میں جس مکان کو دار الکسوہ کے نام سے نامزد کرتے تھے وہ بھی اسی قسم کا ایک کارخانہ تھا اسمیں طرح طرح کے پہننے کے کپڑے اور بنے ہوئے دیگر پارچات تیار ہوا کرتے تھے چنانچہ اس کارخانہ سے جسقدر کپڑے ایک سال میں بنکر نکلتے تھے اُنکی قیمت .....۶ دینار ہوتی تھی خلفاء بنو فاطمہ اپنے دربار کے امیروں کو قیمتی پوشاک اور سنہری طراز بنے ہوئے عمامے کا خلعت عطا کیا کرتے تھے اس طراز و عمامہ کی قیمت پانچسو دینار ہوتی تھی۔ مذکورہ بالا حکومت کے حکمران سال میں دو مرتبہ خلعتیں تقسیم کرتے تھے، ایکدفعہ گرمی کا لباس اور دوسری دفعہ سردی کا یہ کپڑے اُدنےٰ خادموں سے لیکر مقربین بارگاہ خلافت تک سب کو حسب لیاقت ملتے تھے اور عمامہ سے لیکر پائجاموں تک پورا لباس ہر شخص کو ملتا تھا۔ ۱۶ھ میں جتنے قطعات پارچہ کے اس کارخانہ سے برآمد ہوئے انکی تعداد ۳۰۵ ۱۴ تھی اور تقریباً

میں ایک خاص فصل ہے جس میں صرف ان لباسوں کی قسمیں بیان کیگئی ہیں جو مذکورہ بالا کارخانہ سے تقسیم ہوتے تھے۔

اسلامی حکومتوں میں طراز بافی کے کارخانے اُسی پیمانہ پر برابر قائم رہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے لیکن جبکہ اس حکومت کا دائرہ اقتدار تنگ ہو کر اس کی قوت کمزوری سے بدل گئی اور اسکی بہت سی خودسر شاخیں پھوٹ نکلنے سے طوائف الملوکی کی سی حالت پیدا ہوگئی تو اکثر حکومتوں سے یہ کاروبار ناپید ہو گیا مگر طراز بذات خاص باقی رہا اُس کا وجود اُن کے لباسوں پر حسب معمول ضرور ہوتا تھا لیکن اب وہ کارخانے قائم کر کے نہیں بنوائے جاتے تھے، بلکہ جسقدر درکار ہوتے ملک کے کاریگروں سے ریشم یا سنہری سچے کام کے بنوائے جاتے تھے اور وہ "مزرکش" کے نام سے موسوم ہوتے تھے، جب سلطان یا امیر کا نام کاڑھا ہوا ہوتا تھا۔ سلاطین ممالیک (غلام سلاطین) نے مصر میں اسی طرح کام چلایا۔ دولت علیہ عثمانیہ کے عہد میں عثمانی طغرا کا نقش اور فوجی افسروں کی وردیوں کے سنہری فیتے اور دیگر منصبداران سلطنت کے نشانات اور علامتیں دوسری حکومتوں سے کچھ کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔

دولت عثمانیہ کے یہاں کا ہلال ایک ایسی علامت ہے جس کے مقابل ہم خلفاء کے عہد میں کوئی چیز معلوم نہیں کر سکے۔ ہاں جھنڈوں کا رنگ البتہ ہر ایک خاندان کے خلفاء نے جدا جدا رکھا تھا اور وہ رنگ اسی کیساتھ مخصوص رہا جیسا مفصل ذکر آگے چل کر آجائیگا اور بظاہر یہ قیاس میں آتا ہے کہ وہ لوگ اپنے جھنڈوں اور نشانوں پر خلفاء کا نام یا انکے القاب لکھتے تھے اور یہی نام ولقب جس طرح نقدیات پر منقوش ہوتا تھا اسی انداز سے اُن کے فوجی نشانات اور اسلحہ پر بھی۔





(اسم السلطان)

ابن خلقان نے عزیز باللہ فاطمی کی سوانحعمری میں لکھا ہے کہ اسکی مملکت بھی وسیع تھی حمص، حماۃ، شیزر، اور حلب وغیرہ مقامات اس کے مفتوحات میں داخل ہو گئے تھے، اور مقلد بن مسیب فرمانروائے موصل نے اپنے دارالحکومت میں عزیز باللہ کا خطبہ پڑھا، اسکا نام سکوں اور دیگر نشانات حکومت پر کندہ کرایا۔ بجکم کے بغداد پر قبضہ کر لینے کے بیان میں ابوالفدا لکھتا ہے کہ وہ ابن رائق کی خدمت میں

حاضر ہوا اور اس کی نسبت سے اپنے فوجی نشان پر "رائقی" لکھوایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فوجی نشان اور دوسری علامتوں پر ناموں کا طراز بنوانا جو اوائل اسلام میں صرف خلفاء کے ساتھ مخصوص تھا۔ بعد ازاں اس کا تمام امیروں اور طاقتور لوگوں میں رواج پڑ گیا۔

تخت سلطنت منبر، سریر۔ اور کرسی کو بھی مورخین نے حکومت کی نشانیوں میں شمار کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آلات حرب یعنے جھنڈیاں اور فوجی نشانات اور فوجی باجے بھی جن کا بیان فوج کے باب میں آئے گا شاراتِ خلافت میں سے شمار ہوتے تھے۔

ولائت اعمال

اسلام سے قبل ولائت کی کیا حالت تھی؟

ولائت صوبوں کی گورنری کو کہتے ہیں سلطان یا بادشاہ ملکوں کے انتظام کیلئے کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کرتا ہے ایسے قائم مقام کو اہل عرب کی اصطلاح میں عامل اور اس عہدہ کو "عمل" بولتے ہیں۔ یہ امر حکومت کا قدیم طرز ہے جن دنوں اہل اسلام نے ملک شام کو فتح کیا ہے وہ رومی حکومت کا ایک صوبہ تھا جس کا نام اہل روم نے ولائت شرقی رکھا تھا۔ اس صوبہ کی تقسیم گیارہ قلیموں پر ہو گئی تھی جنمیں سے ہر ایک اقلیم کے ماتحت متعدد شہر تھے۔ اور نیز ہر ایک کا ایک ایک صدر مقام بھی تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر ہم ایک جدول میں اُن اقلیموں کے نام ان کے ماتحت شہروں کی تعداد اور اُنکے صدر مقامات کے نام درج کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں

نمبر	اقلیم کا نام	ماتحت شہروں کی تعداد	صدر مقام
۱	سوریا اول	۹	انطاکیہ
۲	؍؍ دوم	۷	حماۃ
۳	؍؍ سوم	۱۳	منبج
۴	فینیقیہ اول۔ یا بحریہ	۱۲	صور
۵	؍؍ دوم۔ یا لبنانیہ	۱۳	دمشق

نمبر	اقلیم کا نام	ماتحت شہروں کی تعداد	صدر مقام
۶	عربیہ - حوران	۱۴	بصریٰ
۷	الجزیرہ یا بین النہرین	۱۳	دیار بکر
۸	اسروانا	۱۲	اورفا
۹	فلسطین اولیٰ		قیساریہ
۱۰	″ ثانیہ	۶	بیسان
۱۱	″ ثالثہ		بطرا حجریہ

ان میں سے ہر ایک اقلیم کا ایک حاکم یا عامل ہوتا تھا جو غالباً بطریق کے فرقہ سے ہوتا ہوگا۔ اہل روم کے یہاں بطریرک لوگوں کے علاوہ ایک اور معزز فرقہ تھا جسنے شہر رومۃ الکبریٰ کے ساتھ ساتھ نشو و نما پائی تھی اور رومن ایمپائر کے دور میں اس کا اقتدار و اثر بہت کچھ بڑھا ہوا تھا اس فرقہ کے لوگ بطریق کے لقب سے پکارے جاتے تھے جبوقت رومانی حکومت کے حصّے بخرے ہوگئے یہ شرفا کا گروہ بھی بادشاہ گردی کے چپیر میں آگیا اور اس کا جاہ وجلال چھن گیا حکومت کے تمام اہم کاروبار جو ان ہی بطریقوں کے ہاتھ میں رہا کرتے تھے ان کے قابو سے نکل گئے اور آیندہ کیلئے یہ لوگ ان سے محروم ہوگئے لیکن جس زمانہ میں رومن امپائر کی فتوحات کا سلسلہ مشرقی ممالک میں شروع ہوا۔ اور گورنمنٹ روما کو ان جدید مفتوح ملکوں میں گورنروں کے مقرر کرنیکی ضرورت محسوس ہوئی۔ گروہ بطارقہ کا اختر بخت بھی چمکا اور چونکہ اس گروہ کے لوگ دبنگ منتظم اور لائق ہونے کیوجہ سے حکومت کے شایاں تھے لہذا ان سے بڑھ کر اور کسی گھرانے کے لوگ اس کام کیلئے موزوں نہ پائے گئے انکو جدید ممالک مقبوضہ میں بڑے بڑے عہدے ملنے لگے انہیں نو مقبوضہ مقامات میں ممالک مصر و شام بھی معہ اپنے قرب و جوار کے داخل تھے ملک شام کی ہر ایک اقلیم کا ایک افسر اعلےٰ ہوتا تھا جو صدر مقام میں مقیم اور فوج سامان جنگ اور قلعہ پر متصرف رہتا تھا ان سب اقلیموں پر ایک اور اعلےٰ حاکم ہوتا تھا جیسے آجکل ملک ہندوستان میں ہز ایکسلنسی وائسرائے بہادر ہیں اسے ماتحت صوبوں کے گورنروں کی برطرفی دبحالی فوجی نقل و حرکت کا اختیار تھا۔ اور وصول خراج تقسیم تنخواہ وغیرہ ملکی کاروبار کا پورا پورا حق بھی اسی کو حاصل ہوتا تھا اس اعلےٰ حاکم کا قیام انطاکیہ میں رہتا تھا اور وہیں سے وہ تمام ماتحت حکام کے نام و ہدایات شائع کیا کرتا تھا۔ ملک مصر کی انتظامی حالت بھی اسی انداز پر تھی اور وہاں کا

افسر بالا دست اسکندریہ میں قیام رکھتا تھا۔

ملک عراق اور ممالک فارس کے نظم و نسق کا بھی یہی ڈھنگ تھا اور اکثر حالتوں میں ان ملکوں کے حکام بہ نسبت حکام مصر و شام کے زیادہ تر پابند قیود و ضوابط ہوتے تھے کیونکہ ان کے تخت سے انکی ولایت قریب تھی اور انہیں براہ راست دربار شاہنشاہی سے حکم و احکام ملتے رہتے تھے۔

اسلامی دور میں والیوں کے تقرر کی صورت

اسلام کے ظہور اور مسلمانوں کے فتوحات کی طرف متوجہ ہونے کے زمانہ میں اُن کا قاعدہ یہ تھا کہ جو سردار فوج کسی مقام کے فتح کرنے کیلئے بھیجا جاتا روانگی سے پہلے ہی اس کو اس مقام کا والی بھی مقرر کر دیا جاتا تھا یا مشروط کر دیا جاتا کہ اس مقام کو فتح کریگا تو وہاں کا حاکم بنا دیا جائیگا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں بھی یہی طرز عمل اختیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ رسول کریم نے ۸ھ ہجری میں ابو زید انصاریؓ اور عمرو بن العاصؓ کو ایک تحریر دعوت اسلام سے متعلق حوالہ فرما کر سفر پر چلتے وقت اُنہیں حسب ذیل ہدایات فرمائی تھی۔

"اگر لوگ حق کی شہادت دیں اور خدا و رسول کی اطاعت منظور کریں تو عمرو بن العاصؓ امیر رہیں۔ اور ابو زید ان کو نماز پڑھانے و سنن و قرآن کی تعلیم دینے کی خدمت انجام دیں" چنانچہ اسی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا تھا

حضرت ابوبکرؓ کے عہد حکومت میں جب ملک شام کے فتح کرنے کیلئے اسلامی فوجیں روانہ ہونے لگیں تو صدیق اکبرؓ کا بھی یہی دستور تھا کہ کسی شہر یا ملک کے فتح کرنے کے جس شخص کے ہاتھ میں فوجی افسری کا نشان عطا فرماتے تھے اسے پہلے ہی سے وہاں کا حاکم بھی مقرر فرما دیا کرتے تھے چنانچہ آپنے سب سے پہلی فوج جو ملک شام کو روانہ کی اسکی روانگی کے وقت اسی طریق پر عمل کیا تھا اس لشکر کے تین حصے تھے اور ہر ایک حصہ پر ایک جداگانہ شخص کو افسر بنایا تھا جن کو ایک ایک ملک کے فتح کرنے کی ہدایت کیگئی تھی ایک نشان عمرو بن العاصؓ کو دے کر انہیں حکم دیا تھا کہ "ایلہ" کے راستے سے فلسطین پر حملہ آور ہوں دوسرا نشان یزید بن ابی سفیان کو سپرد فرما کر ہدایت کی تھی کہ "تبوک" کے راہ سے دمشق پر چڑھائی کریں اور تیسرا نشان شرجیل بن حسنہؓ کے حوالہ کر کے ان کو بات کا ایما فرمایا تھا کہ وہ بھی "تبوک" ہی کی راہ سے اردن پر دھاوا کریں۔ ان تینوں جرنیلوں میں سے ہر ایک کو اسی ملک کا والی و حاکم بھی بنا دیا گیا تھا جسکے فتح کرنے پر وہ مامور ہوئے تھے۔ اور یہ حکم دیا تھا کہ اگر ایک دوسرے سے جدا ہونے کے قبل کوئی جنگ کرنی پڑے تو اس وقت وہ شخص سب پر امیر ہوگا جس کے ملک میں تم موجود ہو گے۔

عمر بن الخطاب نے مسند آرائے خلافت ہو کر ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو ملک شام کا حاکم مطلق اور بالا دست افسر مقرر کر دیا

اور حالت جنگ و امن دونوں میں ان امیروں کی نسبت ان کے احکام کی پابندی کرنیکا فرمان صادر کیا
عمرؓ کا یہ کام اس حالت سے بالکل مشابہ تھا جو اسلامی فتوحات سے قبل ملک شام میں پائی جاتی تھی یعنی یہ کہ
ہر اقلیم پر ایک جداگانہ عامل ہونیکے علاوہ تمام اقلیموں کے حکام پر ایک اور بالادست حاکم ہوتا تھا جیسا
کہ پہلے بیان ہوچکا ہے فرق صرف اس قدر رکھا گیا کہ رومی حاکم بالادست انطاکیہ میں مقیم رہتا تھا اور
مسلمانوں نے دمشق کو ملک شام کا دارالسلطنت قرار دیا۔ اسلیئے کہ یہ شہر ساحل بحر سے دور اور ممالک عرب
سے نزدیک ہونے کے علاوہ حضرت عمرؓ کی اس خواہش کے بھی مطابق تھا کہ مسلمان ایسے مقام پر قیام کریں
جس کے وجہ سے انکے اور دیگر مسلمانوں کے مابین دریا حائل ہو۔ اسباب کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اسلامی حکومت کے پہلے دور میں ولائت اعمال (گورنری) بہ نسبت ملک پر قابض و متصرف بنجانیکے
محض فوجی مداخلت سے زیادہ ملتی تھی۔ عاملوں یا والیوں سے وہ فوجی افسر مراد ہوا کرتے تھے۔ جو مفتوحہ ملکوں
کے قرب وجوار میں قیام رکھتے تھے اور جن کو رابطہ یا حامیہ کے لقب سے ملقب کرسکتے تھے۔ اسلامی فوجیں
بہت سی جمعیتوں پر منقسم تھیں جو ایسے مقامات پر فوجی چھاونیوں میں مقیم رہتی تھیں کہ وہ بہ نسبت جلی مقامات
اور دریائی راستوں کے صحرا اور لق و دق بیابانوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اس طرز عمل کے اسباب ہم نے
پہلے ہی خوب مفصل بیان کردیئے ہیں۔ لہذا ان کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ شامی افواج کے
چار دستے تھے۔ یہ دستے دمشق۔ اردن۔ حمص۔ اور فلسطین میں مقیم رہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان اقلیموں کا نام
جند رکھا گیا تھا۔ ملک عراق کی فوجی جمعیتوں کا قیام کوفہ۔ اور بصرہ میں رہتا تھا۔ اور مصری سپاہ
فسطاط اور اسکندریہ کے قرب وجوار میں۔ یہ فوجی جمعیتیں بستیوں اور شہروں میں نہیں رہتی تھیں اور نہ اہل ملک سے ملنے جلنے
پاتی تھیں۔ عمر بن الخطابؓ نے انکو کاشتکاری میں مصروف ہونے سے بھی نہایت سختی کیساتھ روکا تھا اور
محض اپنی چھاونیوں میں مقیم رہتے اور بہار کا موسم آتے ہی اپنے گھوڑوں کو سائیسوں اور غلاموں کے ہمراہ
دیہات میں چرانے چگانے کو بھیجدیتے۔ مزید نگرانی کے لیئے احتیاطاً کچھ سوار اور افسر بھی لوگوں کے ہمراہ
جایا کرتے تھے۔ ان کو گھوڑوں کی پرداخت کا خیال تمام باتوں سے مقدم تھا۔ ان کی تیاری اور نگرانی کا
کام بہت گرمی سے کیا کرتے۔ ایکبار امیر عمرو بن العاصؓ نے ملک مصر میں اپنی فوج کے افسروں سے
یوں کہا۔ کہ مجھکو اس بات کا علم نہونے پائے کہ تم نے کسی شخص کے گھوڑے کو دبلا اور اس شخص کو موٹا تازہ دیکھ
کر مجھسے اطلاع نہیں کی ہے۔ میں گھوڑوں کا معائنہ بھی اسی طرح پر کرونگا جسطرح فوجی جوانوں کا معائنہ کرتا رہتا ہوں

جس شخص کے گھوڑے کو لاغر دیکھونگا اس کی تنخواہ گھٹا دونگا، اور اس کا انعام کم کر دونگا،

عمرو بن العاص کا دستور تھا کہ موسم بہار شروع ہوتے ہی فوجی دستوں کو انکے حسب دلخواہ مقاموں پر بہار کے دن بسر کرنے اور ورزش کرنے اور دودھ پینے کیلئے بھیجنے کا فرمان صادر کر دیا کرتے تھے اہل عرب اپنے اپنے قبیلوں اور فوجی نشانوں کے ماتحت ہو کر ملک مصر کے دیہات میں پھیل جاتے اور منوف، سمنود، اہناس، اور طحا، وغیرہ ضلعے انکے رہنے کیلئے اکثر مخصوص ہوا کرتے تھے اور ان مقامات پر بکثرت عربی قبائل بہار کا موسم گزارتے تھے چونکہ اسلامی فوج کے جوان (اہل عرب) عام ملکی رعایا سے ملنے جلنے نہیں پاتے تھے لہذا املاک مصر کی بستیاں رومیوں اور قبطیوں سے آباد تھیں اور انہیں پہلی صدی ہجری تک اسلام کی اشاعت مطلقاً نہیں ہوئی تھی ہجرت کی ایک صدی گزر جانے کے اسلامی حکومت کا ڈھنگ بدل چلا، اور اسی وجہ سے ملک مصر کے دیہات میں مذہب اسلام کا پھیلنا شروع ہو گیا۔ اگرچہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں دین اسلام کی اشاعت قریباً دوگنی ہو گئی تھی، تاہم غیر مذہب ملکی رعایا کے مقابلہ میں اہل اسلام کی تعداد بہت کم تھی، تیسری صدی کے آغاز میں پانسہ پلٹا اور اہل اسلام کی تعداد غیر مذاہب رعایا سے بڑھ گئی، ہمارے کلام کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ تیسری صدی ہجری تک ابھی پہلے تک مصر کے دیہات میں مسلمانوں نے مسجدیں نہیں بنائی تھیں، اور نیز اس سے قبل جب کبھی قبطی لوگ عہد شکنی کر بیٹھتے تھے تو مسلمانوں کو سخت دقت کا سامنا ہوتا، اور انہیں بدقت تمام زیر کر سکتے تھے، یہ حالت ایک مدت تک قائم رہی سنہ ۲۱۶ھ میں خلیفہ مامون الرشید عباسی نے ملک مصر پر حملہ کر کے پھر تسلط کر لیا، سو وقت سے مصر کے دیہات میں اسلام کی اشاعت بہت تیزی کیساتھ ہونے لگی، اندلس کی حالت کو بھی اسی طرح پر قیاس کرنا چاہیئے مسلمانوں نے اس ملک کو سنہ ۹۲ھ میں فتح کر کے وہاں کے اصلی باشندوں کو انکی حالت پر چھوڑ دیا، ملکی انتظام حکومت صنعت و حرفت مراسم مذہبی و عبارت، غرضیکہ ان کے تمام رسم و رواج کو قائم رکھا اور کل کاروبار انہیں کے ہاتھوں تفویض کر کے خود فاتح ہونیکی حیثیت سے محض عام افسری اور فوجی طاقت پر متصرف رہنے پر ہی بس کیا۔

دوائل اسلام میں عاملوں کی جو حالت تھی وہ ہم مفصل بیان کر چکے ہیں، لیکن جو مقامات مرکز خلافت کے نزدیک واقع تھے، ان کی کیفیت مذکورہ بالا حالت سے جداگانہ تھی، مثلاً بنو امیہ کے عہد میں شام کا ملک اور بنو عباس کے دور میں عراق کا ملک مقبوضہ ممالک کی حیثیت رکھتے تھے،

خلفائے راشدین کے مبارک زمانہ میں جو لوگ افسر فوج ہوتے وہی عامل بھی ہوا کرتے تھے اور وہ

ہی اس ملک کے فاتح بھی ہوتے تھے' ان کے فرائض اکثر حالتوں میں حسب ذیل ہوا کرتے تھے۔

ممالک مفتوحہ کی نگرانی' وانتظام' اقامت' نماز' وصولی خراج۔

ہم نے تواریخ کے بعض اور موقعوں پر یہ بات بھی دیکھی ہے کہ مصر شام اور عراق کے ممالک مفتوحہ میں کاروبار سلطنت اسلامی فتوحات کے بعد بھی مدت تک اسی نہج پر جاری رہے جس پر پہلے سے چلے آتے تھے' چنانچہ عہد بنو امیہ کے وسط تک یہی کیفیت رہتی چلی آئی یوں تو خلفائے راشدین کے آخری زمانہ سے ولائت اعمال نے مقامی حکومتوں کی صورت اختیار کر لی تھی مگر عبد الملک بن مروان نے اپنے عہد میں ملکی دفاتر کو عربی زبان میں منتقل کرنے اور اسکے کاروبار کو مسلمان عمال کے ہاتھ میں دیدینے سے اسلامی تسلط اور حکمرانی کو مکمل کر دیا' اسکے بعد ملکی عہدوں کی قسمیں مقرر ہوئیں اور وقت و موقعے کے لحاظ سے رفتہ رفتہ انکے بھی مختلف درجے قائم ہونے گئے' ان سب عہدوں و منصبوں کی اصل صرف دو طرح کے عہدے یا حکومتیں تھیں' (۱) امارت عامہ (۲) امارت خاصہ اور امارت عامہ کی بھی دو صورتیں تہیں' (۱) امارت استکفا (۲) امارت استیلا'

امارت استکفا

امارت استکفا یا امارت تفویض وہ عہدہ تہا جسے خلیفہ وقت کسی اپنے کنبہ والے کو سپرد فرما کر اسے کسی اقلیم کے باشندوں کے جان و مال کا حاکم مطلق مقرر کر دیتا تہا' ایسے حاکم کے اختیارات اس ملک میں بطور خود مختار حکمران کے نافذ رہتے اور وہاں ضروری امور ذیل کا عام نگراں رہا کرتا تہا (۱) فوجی نظم و ترتیب' ان کا نواحی بلاد میں اور سرحدوں پر مناسب طریقہ سے رکہنا اور اگر خلیفہ نے خود نہ کی ہوں تو انکی تنخواہیں مقرر کرنا' (۲) کاروبار حکومت کی نگرانی' ماتحت حاکموں اور قاضیوں کا تقرر (۳) وصولی خراج' فراہمی صدقات (زکوٰۃ) اور ان دونوں صیغوں کے عامل مقرر کرنا نیز مستحق لوگوں پر انکا تقسیم کرانا (۴) دین کی حمایت کرنا اور خلافت کی عزت و عظمت قائم رکہنا (۵) شرعی سزائیں جاری کرنا۔ (۶) نماز کی اقامت (۷) حاجیوں کی روانگی کا اہتمام اور ان کے سفر میں سہولت و حفاظت کا بندوبست کرنا ان امور کے علاوہ اگر اس کا ماتحت صوبہ غیر مذہب والے غنیم کے حملوں سے پامال رہتا ہو تو اسے ایک آٹھویں بات یعنے اس غنیم سے جہاد کرنیکا بھی پابند ہونا پڑتا تہا' جہاد میں جسقدر لوٹ کا مال ہاتھ لگتا' اسے اہل خمس کیلئے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد فوجوں میں تقسیم کرنا ہوتا تہا' جسکا مفصل بیان فوج اور مال کے باب میں دیکھنا چاہیئے اکثر اسلامی ولائیتوں پر اسیصورت سے حکمرانی ہوتی تھی' اور خصوصاً جبکہ وہ مقامات اور اقلیمیں مرکز خلافت سے دور ہوتیں جسکی مثال بنو امیہ کے عہد حکومت میں ملک عراق اور بنو عباس کے زمانہ میں ملک شام تھی۔ اور

ان دونوں حکومتوں کے عہد میں خراسان کا صوبہ بنو امیہ کے عہد میں ملک عراق کے زیادہ تر مشہور عمال استکفا نوبت بہ نوبت حسب ذیل رہے۔ زیاد بن ابیہ۔ عبید اللہ بن زیاد۔ بشر بن مروان۔ حجاج بن یوسف۔ یزید بن مہلب۔ مسلمہ بن عبد الملک عمر بن ہبیرہ۔ خالد بن عبد اللہ قسری۔ یوسف بن عمر ثقفی۔ عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز۔ یزید ابن عمر بن ہبیرہ امارت عراق کا نام بایں وجہ کہ وہ کوفہ اور بصرہ دونوں ولایتوں پر مشتمل تھی۔ امارت عراقین بھی مشہور تھا۔ ان امیروں میں سے ہر ایک اپنے اپنے ملک پر خودسر اور مستقل حکمران کی طرح متصرف ہوتا تھا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ وہ ماتحت ملکوں پر عامل مقرر کرتا خراج وصول کرکے اپنی ماتحت فوجوں کی تنخواہیں بانٹتا ملکی ضرورتوں میں صرف کرتا۔ تعمیر کے مصارف کرتا۔ پل بنواتا۔ نہریں کھدواتا۔ اور ایسے ہی دیگر مفید کاموں میں خرچ کیا کرتا تھا۔ اور سال تمام پر بچی کھچی رقم ملک شام کے بیت المال میں ارسال کر دیتا۔ ملک مصر میں بھی یہی حالت تھی۔ وہاں کا عامل عمال استکفا کے گروہ میں سے ہوتا تھا۔ ملک مصر کے عامل کی ایسی حالت امیر عمرو بن العاص کے عہد سے قائم ہوئی تھی۔ اور انکے بعد بھی برقرار رہی۔ بسا اوقات ملک مصر کا عامل دوسرے ملکوں کے عاملوں کی نسبت مستقل حکمرانی کی حیثیت میں بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ خصوصاً امیر عمرو بن العاصؓ کو بذات خاص اسوقت بہت کچھ اختیارات اور مطلق العنانی حاصل تھی جبکہ وہ دوسری مرتبہ امیر معاویہؓ کے حکم سے وہاں کے حاکم مقرر ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے امیر مذکور کو بمقابلہ امام علی ابن ابی طالب بڑی بھاری امداد دے کر ان کو کامیابی سے ہم آغوش کیا تھا۔ نیز امیر معاویہؓ نے زیاد بن ابیہ کو گورنر خراسان اور مغیرہ بن شعبہ کو گورنر کوفہ بناتے وقت ان دونوں کو بھی بہت سی مراعات دی تھیں اسلئے کہ ملک عرب کے یہ تینوں چیدہ مدبر اور پالیٹشین ان کے زبردست حواریوں میں داخل تھے۔ اور امیر موصوف انہیں دنیاوی مال وجاہ کی طمع میں رکھ کر اپنا طرفدار بنائے رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔

بنو عباس کا دور شروع ہوا تو انہوں نے بھی ویسا ہی برتاؤ اختیار کیا۔ لیکن یہ لوگ ملک عراق کی خودمختار حکومت عاملوں کو نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ وہ مرکز خلافت سے قریب تھا۔ البتہ دور دراز ملکوں میں ان کو بھی خودسر حکام کے تقرر سے چارہ نہ تھا۔ مثلاً ملک شام۔ مصر۔ خراسان۔ اور ملک عراق کا مشرقی حصہ ترکستان اور ماوراء النہر کی حدود تک ان سب صوبوں میں وہ بھی بااختیار عامل بھیجتے رہے۔ برامکہ کو عباسیہ حکومت میں بہت کچھ رسوخ اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے انہیں میں سے ایک شخص جعفر بن یحییٰ کو انبار سے لیکر افریقہ تک تمام مغربی صوبوں کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اور اسکے دوسرے بھائی فضل بن

یحییٰ کو سرحد ان سے ممالک کستان کی حدود تک کل مشرقی صوبجات کا عامل بنا دیا تھا یہ تقرر سنہ ۱۷۶ھ میں کیا گیا۔ جعفر نے مصر میں قیام کرنیکے بعد ممالک شام اور افریقیہ وغیرہ میں بطور خود عامل مقرر کیے۔ فضل نے اپنے پائے تخت خراسان میں جاکر وہاں چند روز قیام کیا اور وہاں کے ضروری معاملات ٹھیک کرکے انتظامات ملکی و مالی کو درست کرتا رہا، اس کے بعد اپنے قائمقام ماتحت حاکموں کا تقرر کرکے خود عراق کو پلٹ آیا اور آستان خلافت پر حاضر رہنے لگا۔ عباسی حکومت کے دور میں اکثر ایسی صورتیں پیش آیا کرتی تھیں کہ خلیفہ وقت اپنے کسی مقرب کو کہیں کا والی مقرر کرتا اور وہ شخص ان ممالک میں اپنا نائب بھیجکر خود دربار خلافت میں حاضر باش رہتا یہی امارۃ استکفا منجملہ ان اسباب کے ایک نہایت قوی سبب تھی جنہوں نے آخر کار دولت عباسیہ کے پرخچے اڑا دیئے اور بہت سی مستقل حکومتیں قائم ہو کر طوائف الملوکی کی صورت پیدا ہو گئی، اسکی وجہ یہ تھی کہ والی (گورنر) اپنی ولائت میں در اصل خود مختار اور مطلق العنان حاکم کی حیثیت سے رہتا تھا چند محض نمائشی اور خفیف باتوں کے سوا اُسپر خلیفہ کا کوئی دباؤ نہیں پڑتا تھا۔ مثلاً سالتمام پر سچے کچھ خراج کا دربار خلافت میں بھیجدینا یا خطبہ و سکہ میں خلیفہ کا نام رکھنا یا ایسے ہی چند اور امور جو اس کے بڑھتے ہوئے ارادوں کو کسی طرح روک نہیں سکتے تھے، اور جنکی وجہ سے وہ برائے نام خلیفہ کا ماتحت کہلا سکتا تھا جب کوئی والی مدبر اور چالباز ہوتا اور دیکھتا کہ خلیفہ وقت کی حکومت میں کچھ کمزوری پیدا ہو چلی ہے، تو فوراً اپنے ملک کے عمائد کو جمع کرکے اپنی دوستی و طرفداری پر مستعد بنا لیتا، اور خود مستقل حکمران بن بیٹھتا۔ اس کا یہ استقلال یا بہمہ وجوہ مکمل ہو جاتا اور یا کسی قدر مال پر جسے وہ سال بسال نذرانہ کے طور پر خلیفہ بغداد کو دیتا رہے، مشروط ہو جاتا اور کبھی بعض اور بھی مناسب موقع شرطیں طے ہو جاتی تھیں، چنانچہ اسی طرح افریقہ میں بنو غالب کے خراسان میں ابن طاہر اور مصر میں ابن طولون مستقل حکمران بن گئے۔ لیکن یہ تمام صوبے یا ملک حکومت عباسیہ کے ماتحت ہی شمار ہوتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے "امارت استکفا" کے ان حکومتوں کو امارت استیلا کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

امارت استیلا اس امارت سے وہ عمارت مراد تھی جبکا والی خلیفہ کے حکم سے مقرر ہونیکے بعد خود حاکم بن بیٹھے یا بزور شمشیر کسی ملک پر متصرف ہو جائے اور خلیفہ وقت اسکے استیصال سے مجبور ہو کر اسکو وہاں کا حاکم تسلیم کر لے۔ ایسے امیر کو برائے نام خلیفہ کا ماتحت رہنا پڑتا تھا اور خلیفہ اُسے اُسکے ملک میں مطلق العنان حکمران بنا دیتا تھا بجائے اسکے کہ وہ خلیفہ کے سامنے سر نیاز جھکائے خود خلیفہ اسکی مرضی دیکھتے رہنے کی فکر میں

پڑ جاتا تھا اور اگر اس ملک میں دینی احکام یا مذہبی امور کا نفاذ کرنا مدنظر ہوتا تو خلیفہ کو استیلا سے اجازت لینی ضروری ہوتی تھی۔ بایں ہمہ اس امارت کی بھی چند شرطیں تھیں جو اس امر کے مقابل ہیں کہ خلیفہ وقت نے اس شخص کو خودمختار حکمران تسلیم کر لیا ہے اس امیر پر فرض ہوتیں تھیں۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں:-

(۱) دینی معاملات اور خلافت نبوی کے انتظامات میں منصب امامت کی حفاظت (۲) دینی اطاعت کا اظہار کرنا (۳) باہمی الفت اور ایکدوسرے کی مدد کرنے پر دل سے آمادہ رہنا اور زبان سے اس کے مقر بنے رہنا۔ تاکہ اغیار کے مقابل میں مسلمانوں کی مجموعی قوت قائم رہے۔ (۴) دینی ولایت کے احکام اور اس کے عہد و پیمان جاری ہیں (۵) شرعی مال (زکوٰۃ وغیرہ) پوری طرح وصول کیا جائے یعنی ادا کرنیوالے سے کم وبیش نہ لیا جائے۔ (۶) شرعی سزائیں ٹھیک ٹھیک قائم رہیں اور جو ان کے مستوجب ہوں ان پر قائم رہیں۔ (۷) امیر حفاظت دین کا خیال ضرور رکھے۔

امیر استیلا کو وزیروں اور دیگر عہدہ داروں کو مقرر کرنیکا حق حاصل ہوتا تھا۔ ان ہی حکومتوں نے دولت عباسیہ کے ٹکڑے اڑا دیئے اور عظیم الشان اسلامی خلافت کا خاتمہ کر کے طوائف الملوکی قائم کر دی مثلاً۔ طاہریہ۔ حمدانیہ۔ بنی بویہ۔ غزنویہ۔ طولونیہ۔ اور اخشیدیہ وغیرہ گورنمنٹیں ایک ہی وقت میں مستقل حکمرانوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ صرف خلیفہ کا خطبہ اور سکہ ان کے ملک میں رائج تھا۔ اور وہ ایک مقررہ رقم سالانہ بطور پیشکش کے خلیفہ کو نذر کر دیتی تھیں۔ خلیفہ کو انپر صرف اتنا اختیار تھا کہ وہ ان حکومتوں کے والیوں کو ان کے ممالک میں قائم رکھے اور ان کی حکومت کو تسلیم کرتا رہے۔ ایسی حکومتیں موروثی طور پر ان والیوں کے خاندان میں نسلاً بعد نسل چلی جاتی تھیں۔ جسکی زندہ مثال ان دنوں ملک مصر کی خدیوی حکومت دولت علیہ عثمانیہ کے مقابل میں پیش کیجا سکتی ہے۔

امارت خاصہ اس قسم کی امارت تھی کہ اس کا حکمران اپنی حدود اثر کے اندر فوجی نظم و ترتیب ملکی کاروبار۔ خلافت کی حمایت اور اس کی عظمت و قتدار کی حفاظت کرتا رہتا تھا۔ معاملات اور مقدمات فیصل کرنے اور خراج وصول کرنے اور تحصیل زکوٰۃ کا اختیار اسے نہیں ملتا تھا اور بسا اوقات نماز کی امامت بھی اسکے ذمہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یہ منصب قاضی کو حاصل ہوتا تھا۔ ایسی امارت میں قاضیوں اور خراج و زکوٰۃ وصول کرنیوالوں کا عملہ خود خلیفہ وقت مقرر کیا کرتا جو کہ بعد از وصولیابی تمام آمدنی کو محاسب سنٹرل بیت المال (صدر خزانہ) میں بھیجتے رہتے اور انہیں محاصلات میں سے اس ملک کی فوجوں کی اور عہدہ داروں کی تنخواہوں اور دیگر ضروری

مصارف پر خرچ کرتے تھے۔ ایسی خاص عمارتیں بنو عباس کے عہد خلافت میں بہت کم تھیں

عاملوں کی تنخواہیں خلیفہ عمر بن الخطاب رضؓ نے دفتروں کی درستی اور فوج والوں کی تنخواہیں مقرر کرنے سے فراغت پائی تو آپ کو عاملوں کے وظائف متعین کرنیکی جانب توجہ ہوئی۔ سب سے پہلے عامل تقرر جو خلیفہ ممدوح کے زمانہ میں ہوا عمار بن یاسر کا۔ کوفہ کی طرف وہاں کا افسر فوج اور امام نماز بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ عمار رضؓ کا وظیفہ دونوں خدمتوں کی انجام دہی کے لحاظ سے (۶۰۰) درم ماہوار مقرر ہوا۔ علاوہ اسکے انکے ماتحت محرروں اور موذنوں وغیرہ وغیرہ کی جدا جدا تنخواہیں مقرر ہوئیں۔ عثمان بن حنیف رضؓ زمین کی پیمائش کے افسر بنائے گئے عبداللہ بن مسعود رضؓ کوفہ کے قاضی اور شریح رحؓ بصرہ کی قضا پر متعین ہوئے عثمان بن حنیف کا وظیفہ پانچ درم نقد یومیہ اور پانچہزار درم سالانہ قرار پایا۔ عبداللہ بن مسعود رضؓ کو سو درم ماہوار اور چوتھے دن ایک بکری ملتی تھی۔ اور قاضی شریح رضؓ کو سو درم ماہوار نقد کے علاوہ ہر ماہ میں دس جراب بوری غلہ بھی ملتا تھا۔ اس بیان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خلیفہ عمر بن الخطاب رضؓ نے عمار کو اور لوگوں کے مقابل میں افضل قرار دیکر انکی تنخواہ بھی زائد مقرر کی اسلئے کہ وہ نماز پڑھانے اور فوجکی سپہ سالاری کی اہم خدمتوں کو انجام دینے پر متعین ہوئے تھے اور اس زمانہ میں امارت دگورنری سے اسی خدمت کا انجام دینا مراد ہوتا تھا۔

عمر رضؓ نے امیر معاویہ بن ابی سفیان کو والی شام مقرر کرتے وقت انکا وظیفہ ہزار درم سالانہ مقرر کیا تھا خلیفہ موصوف عاملوں کا محاسبہ کرنے اور انکے حالات کی جانچ کرنیمیں بہت سختی اور بیدار مغزی سے کام لیا کرتے تھے جب آپ دیکھتے کہ ممالک اسلامیہ کے عاملوں نے کسی طرح بہت سا نفع کمایا اور دولت کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے تو فوراً اُن کے مال کا حصہ بانٹ لیتے اور آدھا مال اُن سے لیکر بیت المال میں داخل کر دیتے۔

بنو اُمیہ کے عہد میں عاملوں کے حقوق اور اختیارات زیادہ وسیع ہونے لگے معاویہ رضؓ نے عاملوں کو اپنا طرفدار بنائے رکھنے کے خیال سے انکو بہت سی رعائتیں ابتداءً دیں تھیں جو مابعد کے زمانہ میں بھی قائم رہتی چلی گئیں امیر مذکور نے زیاد بن ابیہ کو بصرہ۔ خراسان اور سجستان کا گورنر مقرر کرکے اسے انکا حاکم مطلق بنادیا اور سیاہ وسفید کا اختیار کامل دیدیا تھا۔ تنخواہ کی بھی کچھ تعیین تھی بلکہ محاصل ملکی میں سے ضروری مصارف ادا کرنیکے بعد جسقدر اسکا دل چاہتا خود لے لیتا اور جو چاہتا امیر معاویہ کو بھیجدیتا۔ امیر عمرو بن العاص کے والئے مصر بنائے جانمیں بھی ایسی ہی رعائتیں ملحوظ رہی تھیں بنو عباس نے بھی اپنے عہد حکومت میں اسی طرز کی پیروی کی چنانچہ مامون الرشید عباسی نے فضل بن سہل کو مشرقی ممالک کا والی مقرر کرکے اسکا وظیفہ

تیس لاکھ درہم سالانہ مقرر کیا تھا اور اس کے علاوہ کام کی اقسام اور منصبوں کی وسعت و اہمیت کے لحاظ سے بھی عمال کے وظیفے مختلف ہوا کرتے تھے۔

وزارت

اور امیر الامراء اور سلطان

بادشاہی عہدوں میں وزارت کا عہدہ سب سے بڑا ہوا اور معزز ہے اور یہ عہدہ اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ اس کی اصل فارس سے ہے۔ عباسی حکومت کے ایام میں مسلمانوں نے انہیں سے اخذ کر کے اپنے یہاں بھی اس منصب کو قائم کیا۔ لیکن اگر وزیر کے لفظ سے وہ شخص مراد لیا جائے جو خلیفہ کی مدد کرتا ہے یا حکومت میں اس کا دست و بازو بنتا ہے تو اس حالت میں عہد اسلام تک متواتر پایا جائے گا کیونکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام اور خاص معاملات میں اپنے اصحاب سے صلاح و شورہ لیتے اور ان سے ہر امر کے متعلق بحث فرمایا کرتے تھے اور ابو بکرؓ بھی چند اور خصوصیتوں کے ساتھ مخصوص پائے جاتے ہیں۔ عرب کے وہ باشندے جو اسلام کے قبل روم اور فارس والوں سے ملتے جلتے رہے تھے۔ ابو بکرؓ کو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا وزیر کہتے تھے۔ ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں عمرؓ کی اور عمرؓ کے زمانہ خلافت میں عثمانؓ اور علیؓ کی حالت بھی اسی طرز پر رہی مگر اسلام کے بے تکلف اور سادگی پسند دور میں مسلمانوں کے یہاں وزیر کا لفظ مشہور نہیں ہوا تھا۔

اگرچہ جس زمانہ میں بنی اُمیہ نے خلافت کو ملکداری بنا دیا اور بقائے مملکت کے لئے مدبرانہ چالیں چلنا اور لوگوں کی تالیف قلوب کرنا نہیں ضروری معلوم ہوا تو یہ حاجت پیش آئی کہ قبیلوں اور جتھوں کی تالیف قلوب کرنے اور اُن کے حلقوں میں اپنا اثر پھیلا کر اُن سے اپنی طرفداری کے لئے گروہ بنانے میں چند معاملہ فہم اور مدبر لوگ اُن کے مشیر ہوں۔ لہٰذا انہوں نے کئی شخصوں کو اسی غرض سے اپنی خدمتیں لیا جن کا تقرر وزارت کے معنوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ مگر یہ امر ظاہر ہے کہ وہ لوگ (بنو اُمیہ) اس عہدہ کو وزارت کے نام سے موسوم نہیں کرتے تھے خلاصہ یہ ہے کہ بنو اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ بھی ہو گیا اور وزارت صرف ایسے ہی معاملات پر غور کرنے پر مشتمل رہی، جن کا بیان اوپر کیا گیا ہے۔

خلافت کا بنی عباس کے ہاتھ میں پہنچنا تھا کہ ملک کی عظمت و شان کا ستارہ چمک اٹھا، اس کے

مراتب اور مناصب بھی شاندار ہوئے، وزیر کا درجہ بھی بڑھا، اور ملکی انتظامات کی عنان اس کے قابو میں دیدی گئی، تمام بندوبست بحیثیت نائب خلیفہ ہونے کے وزراء کے ہاتھوں انجام پانے لگے پھر اسپر اتنا اور بھی اضافہ ہوا کہ حسابات کا دفتر اور خلافت کے خطوط، رازداری کا سررشتہ بھی وزیر ہی کے اختیارات میں شامل ہوگیا جس کیوجہ سے وزارت قلم اور شمشیر دونوں پر شامل ہوگئی۔

بنو عباس کا سب سے پہلا وزیر ابو سلمہ حفص بن سلیمان ہمدانی ابو العباس سفاح کا وزیر تھا اور اسلام میں یہی پہلا شخص ہے جو وزیر کے نام سے موسوم ہوا۔ ابن خلکان کا قول ہے "ابو سلمہ سے پہلے اس خاص لقب کے ساتھ کوئی شخص مشہور نہیں ہوا تھا۔ نہ بنو امیہ کی حکومت میں نہ کسی اور عہد سلطنت میں۔ وہ ابو سلمہ وزیر آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پکارا جاتا تھا جس طرح کہ ابو مسلم خراسانی امیر آل محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لقب سے موسوم تھا، اور یہ دونوں شخص فارسی نسل کے تھے"۔ سب سے پہلے جن حکمرانوں نے سلطنت کے کاروبار کو وزیروں کے اعتبار پر چھوڑا اور انہیں پورا بھروسہ کیا ہے وہ بنو عباس ہی تھے، اور ان کے تمام وزیر فارس کے باشندے تھے۔ بنو عباس کے سب سے زیادہ مشہور وزیر برامکہ کے خاندان سے تھے، اور حکومت میں ان کی دست درازی اور خودسری کا معاملہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ آخر کار ہارون الرشید نے مجبور ہو کر ان کو بالکل تباہ و برباد کر ڈالا جن کا قصہ مشہور ہے۔

بنو عباس کے عہد میں وزارت نے کئی قالب بدلے اور کئی مرتبہ اس کی حالت میں عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے چوتھی صدی ہجری کے اندر وزیر کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لفظ اضافہ ہوا۔ اور سب سے پہلے جس کو یہ لقب دیا گیا وہ ابو القاسم اسماعیل ابن ابی الحسن عباد بن العباس تھا جو ابتدائً "مؤید دولہ بن بویہ کا وزیر اور "صاحب" کے ساتھ مشہور تھا، اس کے بعد جس شخص کو وزارت کا عہدہ حاصل ہوتا وہ صاحب ہی کہلاتا تھا۔

بنی عباس کے گھرانے میں خلفاء کا دائرہ اختیارات تنگ ہونے کے ساتھ ہی وزارت کا اثر بھی کم ہوتا گیا یہاں تک کہ جس زمانہ میں عاملوں نے اپنی اپنی ولایتوں میں خودسر ہو کر خلافت عباسیہ میں بہت سی آزاد خودمختار حکومتیں قائم کرلیں ان دنوں وزارت بھی خلافت کی طرح نام ہی کو باقی رہگئی تھی، لہذا خلفاء نے اسے توڑ کر امیر الامراء کے لقب سے بدلیا۔

امیر الامرا	ایک لقب تھا جو خلفائے بنو عباس نے بعض ایسی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے والیوں کو عطا کیا تھا

جو اسی کے ٹکڑے سے ہو کر خود مختار بن گئی تھیں، یہ صورت چوتھی صدی ہجری میں واقع ہوئی تھی اور بعد بھی قائم رہی
جیسے بنو حمدان اور بنو بویہ کی گورنمنٹیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ امیر الامراء مستقل بادشاہ یا اُس کے مشابہ
ہوا کرتا تھا۔ سب سے پہلے یہ لقب ابن رائق کو دیا گیا، جو بنی حمدان میں سے تھا اور ولایت بصرہ اور واسط کا
حاکم تھا۔ ۳۲۴ھ میں خلیفہ راضی باللہ عباسی نے اُسے امیر الامراء بنا کر انتظام ملک کی باگ اس کے ہاتھ
میں دیدی، اور حکم دیدیا کہ منبر پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ اسے خلعت اور نشان (ماہی مراتب)
بھی عطا کیا گیا۔ اسی ابن رائق کو شاہ بغداد یا سلطان بغداد بھی کہتے تھے۔ ۴۴۹ھ تک یہ لقب بنی
بویہ میں قائم رہا۔ اس کے بعد ترکی قوم کے سلجوقی بادشاہوں میں منتقل ہو گیا جن کا پہلا حکمران طغرل
بک تھا۔ طغرل کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان دنیا کے نامور عظیم الشان بادشاہوں میں گذرا ہے۔
یہ لقب ۵۴۲ھ تک سلجوقی گھرانے میں قائم رہ کر بغداد سے ان کی حکومت کے ناپید ہو جانے پر جاتا رہا۔
بنو بویہ نے اقتدار اور اثر کے زمانہ امیر الامراء بھی اپنی جانب سے مقرر کرتے تھے۔ انہوں نے خلفاء کے
ہاتھ میں سوا ایک نائب کے تقرر کے جس کو رئیس الرؤسا کہتے تھے اور کوئی اختیار باقی نہ چھوڑا تھا مگر سلجوقی
خاندان کے عہد میں خلفاء کو پھر دوبارہ امیر الامراء کا منصب عطا کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

سلطنت عباسیہ کے منصب وزارت کی تاریخ کو نظر غائر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصب
اس حکومت کی شکست و کمزوری کے اسباب میں ایک قوی سبب تھا۔ اسلئے کہ خلفاء نے کاروبار حکومت
کی کنجیاں وزیروں کے ہاتھوں میں دے کر اپنے تئیں بیکار بنا لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی صدیاں اسی حالت
میں بسر کرنے کے بعد حکمرانی کا ملکہ ان کی طبیعت سے زائل ہو گیا اور وہ حکومت بسر کرنے کے بارہ میں عاجز ہو گئے

دوسری اسلامی گورنمنٹوں میں بھی وزارت کا منصب کسی نہ کسی حیثیت سے پایا ضرور جاتا تھا چنانچہ
ملک مصر کی فاطمی حکومت کا پہلا وزیر یعقوب بن کلس عزیز باللہ کا وزیر تھا۔ جس کا تقرر ۳۶۳ھ میں ہوا تھا
اندلس میں جو اموی حکومت تھی، اسمیں وزارت کی وہی شان تھی جو ملک شام کی اموی حکومت میں قائم رہ چکی
تھی یعنی منصب وزارت ایک ایسی جماعت میں مشترک رہتا تھا جن کو خلیفہ وقت اپنی امداد اور مشورت
کیلئے مقرر فرما کر انہیں اپنی ہمنشینی کے ساتھ مخصوص کرتا تھا اور انہی مشیروں میں سے کسی ایک سربرآوردہ
شخص کو منصب نائب السلطنت کیلئے چن لیتا اور اُسے حاجب کے نام سے موسوم کرتا۔ اسی عہدہ دار کو عباسی حکومت نے
وزیر کے نام سے موسوم کیا تھا اور آخر میں اندلس کی حکومت نے بھی حاجب کا لقب ترک کر کے وزیر کے لقب سے بدل دیا

خلفائے اندلس کے ہاں یہ رتبہ وراثت کے طور پر چند خاص گھرانوں کیلئے مخصوص تھا جیسا کہ بنی عباس کے ہاں (بغداد میں) برامکہ کا خاندان وزارت کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔

اسلامی حکومتوں میں وزارت کی دو قسمیں تھیں (۱) وزارت تفویض (۲) وزارت تنفیذ مثل گورنری کے

وزارت تفویض۔ ایسی وزارت ہوتی تھی، کہ خلیفہ کسی شخص کو وزیر مقرر کر کے تمام کاروبار کی نگرانی اور انجام دہی اسکی رائے اور سمجھ پہ چھوڑ دیتا تھا۔ یہ وزیر تین باتوں کے سوا اور تمام اقسام کے معاملات انجام دیتا تھا جنہیں خلیفہ انجام دیا کرتا، جو تین باتیں اس کے اختیار سے باہر تھیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ولیعہدی۔ اس معاملہ میں جس شخص کو خلیفہ مناسب سمجھتا ولیعہد بنا دیتا تھا، وزیر کو اسمیں مداخلت کا کوئی حق نہ تھا

(۲) جس شخص کو وزیر نے کوئی عہدہ دیا ہو یا کہیں کا حاکم بنایا ہو خلیفہ اسے معزول کر سکتا تھا لیکن وزیر خلیفہ کے مقرر کردہ شخص کو برطرف کرنے کا مجاز نہ تھا۔

(۳) خلیفہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ قوم سے امامت کی معافی طلب کر لے مگر وزیر کو نہیں۔

عباسی حکومت کے دور میں خاندان برامکہ، یحیٰی بن اکیثم اور ابن الفرات وغیرہ وزراء تفویض رہے اور بنو فاطمہ کے ہاں سپہ سالار افواج کو یہ منصب حاصل رہا۔ بنو عباس کے ہاں وزیروں کو تمام معاملات میں مختار بنانے کی انتہا ہو گئی تھی، وہ بسا اوقات خاتم خلافت بھی وزیروں ہی کو دیدیا کرتے تھے، تاکہ وہ فرمانوں اور تحریروں پر مہر لگانے کیلئے بھی دست نگر نہ رہیں، رشید کے اس قصہ میں جس میں اُسنے ایکدن جعفر سے خلافت کی انگوٹھی لیکر فضل کو سپرد کی ہے اس امر کی پختہ دلیل موجود ہے کہ وزیروں کا اثر کس قدر بڑھا ہوا تھا۔

اسکے علاوہ جعفر بن یحیٰی برمکی کا واقعہ جو اُسے عبدالملک بن صالح کے ساتھ پیش آیا ہمارے اس دعوے کی کافی دلیل ہے، اور وہ یہ ہے: جعفر مجلس نشاط میں بیٹھا ہوا تھا، کہ عبدالملک بن صالح (رشید کا چچیرا بھائی) اس کے پاس آیا، جب دونوں نشہ میں چور ہوئے، تو جعفر نے عبدالملک کیطرف متوجہ ہو کر کہا، "کیا آپ کی کوئی ایسی غرض ہے جو میرے اختیار میں ہو؟ اگر ہے تو فرمائیے تاکہ میں آپ کی اس تشریف آوری کے شکریہ میں اس کی تعمیل کی کوشش کروں"۔ عبدالملک نے کہا "ہاں ہے"، "امیرالمومنین مجھ سے کسقدر رنجیدہ ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھپر مہربان ہو جائیں"۔

جعفر: "چلئے امیرالمومنین آپ سے خوش ہو گئے۔ اور کچھ؟"

عبدالملک: "اور مجھ پر دس ہزار دینار قرض ہیں"

جعفر۔ "وہ میرے خاص مال میں سے آپ کے لئے حاضر ہیں، اور امیرالمومنین کے مال میں سے بھی آپ کو اسقدر ملیں گے کچھ اور؟"

عبدالملک۔ "میں چاہتا ہوں کہ امیرالمومنین مجھے اپنا سمدھی بنا کر میرے فرزند ابراہیم کو اپنی دامادی میں قبول فرمائیں۔"

جعفر۔ "اچھا امیرالمومنین نے اپنی بیٹی غالیہ کو اس کے ساتھ منسوب کر دیا۔ کچھ اور؟"

عبدالملک۔ "ہاں اور میں اسکا بھی خواہشمند ہوں کہ میرے لخت جگر ابراہیم کے سر پر نشان حکومت کا سایہ ہو اور اس کو ماہی مراتب کے ساتھ کسی ملک کی گورنری ملے۔"

جعفر۔ "بہتر ہے، امیرالمومنین نے اُسے ملک مصر کا والی مقرر فرمادیا۔"

اتنی گفتگو کے بعد عبدالملک بن صالح خوش خورم اپنے گھر چلا گیا، اور جعفر نے بلا اسکے کہ خلیفہ سے اجازت لے ان تمام باتوں کی تکمیل کر دی، دوسرے دن صبح کو جبوقت جعفر خلیفہ ہارون الرشید کے حضور میں حاضر ہوا، خلیفہ نے اُس سے پوچھا۔ "جعفر! کل کی رات تمنے کیونکر بسر کی؟" جعفر نے ادب کے ساتھ پچھلی رات کا واقعہ عرض کرنا شروع کیا، چنانچہ جبوقت جعفر نے عبدالملک بن صالح کا اپنے پاس آنا بیان کیا ہے، خلیفہ ہارون الرشید جو تکیہ کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ سنبھل بیٹھا اور بولا "جعفر تجھے خدا کی قسم ہے سچ کہنا اُسنے تجھسے کیا مانگا؟"

جعفر۔ "امیرالمومنین اُنہوں نے مجھسے آپ کی رضامندی کی خواہش کی تھی۔"

رشید۔ "پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

جعفر۔ "میں نے عرض کی کہ امیرالمومنین تمسے خوش ہو گئے۔"

رشید۔ "بے شک میں اس سے راضی ہو گیا۔ پھر کیا چاہا؟"

جعفر۔ "انہوں نے بیان کیا کہ میں دس ہزار دینار کا مقروض ہوں۔"

رشید۔ "پھر تو نے کیا کہا؟"

جعفر۔ "میں نے عرض کی کہ امیرالمومنین نے آپ کی جانب سے یہ قرض بھی ادا کر دیا۔"

رشید۔ "بہتر ہے میں نے ادا کیا۔ پھر کیا ہوا؟"

جعفر۔ "اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ امیرالمومنین اُنکے بیٹے ابراہیم کو اپنی فرزندی میں قبول فرمادیں۔"

رشید "اور تو نے کیا جواب دیا؟"

جعفر "میں نے عرض کی کہ امیر المومنین نے اپنی لڑکی عالیہ آپ کے صاحبزادہ سے منسوب کر دی۔"

رشید "اچھا میں نے اسے بھی منظور کیا۔ پھر آگے؟"

جعفر "اور حضور انہوں نے آرزو کی کہ اُن کے فرزند کے سر پر ماہی مراتب کا سایہ ہو میں نے کہہ دیا کہ امیر المومنین نے ان کو ملک مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔"

رشید "میں نے یہ بھی بخوشی منظور کیا۔"

اس کے بعد فوراً ہی خلیفہ نے ان تمام باتوں کا سرانجام فرما دیا۔

اکثر حالتوں میں خلفاء اپنے وزیروں کو عہدۂ وزارت کے ساتھ ہی ایک اور بڑا منصب بھی حوالہ فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ فضل بن سہل نے وزارت کے ساتھ تلوار کی ریاست یعنے سپہ سالاری بھی پائی تھی اسی لئے اس کا نام ذوالریاستین رکھا گیا۔ (یعنے دو افسری والا)

وزارت تنفیذ اس وزارت میں محض خلیفہ کے احکام اور قوانین کا جاری کرنا منظور رہتا تھا گویا وزیر خلیفہ اور رعایا کے مابین ایک واسطہ ہوتا تھا۔ اور فوجوں کی روانگی امیروں کا تقرر خلیفہ کے حکم سے کیا کرتا ملک کی ضروری خبریں جو پیشگاہ خلافت میں عرض کرنے کے قابل ہوتیں سمع ہمایوں تک پہنچاتا اور تازہ واقعات و معاملات خلیفہ کے گوش گزار کرکے انکے متعلق مناسب احکام حاصل کرتا غرضیکہ یہ وزیر وزیر تفویض کے بالکل خلاف ہوتا تھا جیسے وزیر تفویض کو عزل و نصب اور بندوبست ملکی اختیارات بلا کسی چارہ و پایاں کے حاصل ہوتے تھے ویسے ہی وزیر تنفیذ اختیارات سے معرا ہوتا تھا اور محض ایک ایلچی کی حیثیت سے خلیفہ کے احکام رعایا تک پہنچا دینے کا کام کرتا رہتا تھا خلیفہ کو اختیار رہتا تھا کہ وہ ایک ہی زمانہ میں دو وزیر تنفیذ مقرر فرمائے ایک سول انتظامات کیلئے اور دوسرا ملٹری کاروبار کیواسطے۔ مگر وزیر تفویض ایک سے زائد نہیں رکھ سکتا تھا۔

وزیر کی تنخواہ وزیر کا وظیفہ زمانہ اور شخصوں کے اختلافات کے ساتھ مختلف ہوتا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ وزیروں کا وظیفہ صرف ان کی ذاتی تنخواہ ہو پر منحصر نہیں رہتا تھا اسلئے خلفاء ان کے بھائیوں بیٹوں اور ملازموں کے وظیفے علیحدہ مقرر کر لیتے تھے ہم اس مقام پر صرف حکومت بنو فاطمہ کے ایک وزیر کی حالت دکھاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائیگا کہ ایک وزیر کو مدا اس کے گھرانے والوں اور ماتحت ملازموں کے کیا ملا کرتا تھا۔

وزیر .... کا ماہوار وظیفہ		۵۰۰۰ دینار تھا
وزیر کے ہر ایک بھائی اور بیٹے	// // //	۲۰۰ - ۳۰۰ //
ہر ایک اسکے خاص ملازم اور ماتحت	// // //	۱۰۰ - ۵۰۰ //

یہ تمام ان جاگیروں کے علاوہ تھا جو وزیر اور اس کے کنبہ والوں کو ملتی تھیں نیز ان تحفوں اور خلعتوں کی قیمت بھی اس کے علاوہ ہوتی جو تہواروں یا خوشی کے اور تقریبوں پر انکو ملا کرتے تھے چنانچہ بعض اوقات وزیر کا وظیفہ مع اپنے ماتحتوں کے وظائف اور جاگیروں کی آمدنی کے مل ملا کر قریب ۱۰۰۰۰۰ دینار سالانہ کے ہو جاتا تھا۔

سلطان ابتداءً یہ منصب عباسی حکومت کے وزیروں کا لقب ہوا کرتا تھا جو بلحاظ تضخیم (تعظیم) اُن کو خلفاء کے حکم سے ملا کرتا تھا جسکی صورت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ جعفر بن یحییٰ سلطان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مورخین عرب کی کتابیں پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب سلطان کا خاص لفظ بغداد یا ملک شام کے والی کی شان میں استعمال کیا کرتے تھے اور ممکن ہے کہ یہ والی جنکو سلطان کہا جاتا تھا پولیس کمشنر ہوتا رہا ہو یا وہ عہدہ دار جو اندلس کے محافظ کے مشابہ ہوا کرتا ہو بعض حالتوں میں سلطان کے لفظ سے خاص خلیفہ کی ذات بھی مراد لیتے ہیں لیکن یہ سب استعمالات مجاز یا تشبیہہ و استعارہ کی قسم سے ہیں غرضیکہ سلطنت کا ایک رسمی رتبہ ہونا صرف محمود غزنوی بن سبکتگین کے عہد سے شروع ہوا۔ اور اسلام میں وہ پہلا سلطان تھا چوتھی صدی ہجری کے آخر میں امیر الامراء کے لقب کو بدل کر اسے سلطان کا لقب دیا گیا یا یوں کہیئے کہ جس طرح اس سے قبل وزیر کا لفظ کم درجہ کا قرار پا گیا تھا اسیطرح رفتہ رفتہ امیر الامراء کا لقب بھی بے حیثیت ہو گیا۔ لہذا اُسے "سلطان" کے لقب سے بدل لیا اسکے بعد پھر یہی لفظ ترکی کردی۔ اور چرکس وغیرہ بادشاہوں اور حکمرانوں کا (جو سلجوقی۔ ایوبی۔ ممالیک اور عثمانی خاندانوں سے تھے اور ہیں) لقب قرار پا گیا۔ وزارت میں وراثت کا قاعدہ مشروط نہ تھا لیکن جب وہ عہدہ سلطنت سے بدل گیا۔ تو میراث بھی اس کے ساتھ مشروط ہو گئی۔ اسی بنا پر سلطان اپنی موت سے پہلے کسی کو اپنا ولیعہد بنا لیا کرتا تھا۔

ابن خلکان نے مشہور اسلامی طبیب رازی کے حالات میں ذکر کیا ہے کہ سامانی بادشاہ اپنے حکمران کو "سلطان السلاطین" کے نام سے موسوم کرتے تھے، سامانی خاندان کی حکومت غزنوی دور سے قبل تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب پہلے ہی سے مشہور تھا۔ اور اگر اس بات کو صحیح مانا جائے تو غزنویوں کا لقب سامانی گھرانے کی وراثت قرار پائیگا۔ لیکن ہمنے اس لقب کے بارہ میں بعض محققین کا ایسا قول دیکھا ہے جو ہمارے پہلے قول کو ترجیح دیتا ہے اور نہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ سامانی حکمرانوں میں مذہب اسلام قبول کرنیسے پہلے یہ لقب پایا جاتا ہو اس لحاظ سے محمود غزنوی ہی اسلام کا پہلا سلطان قرار پائیگا واللہ اعلم۔

اگرچہ ملکی حکمرانی کی طاقت خود سلاطین کے قبضۂ قدرت میں ہوتی تھی۔ لیکن بلحاظ عقیدۂ مذہبی کے انکو اپنا تقرر سلطان کے عہدہ پر خلفا کے ہاتھوں کرانا پڑتا تھا چنانچہ خلفا رکسی کو سلطان کا منصب عطا فرماتے وقت بہت شان و شوکت کا دربار مرتب کرتے۔ سلطان کو اپنے ہاتھوں سات پارچوں کا خلعت پہناتے طوق اور تاج اور کنگن سے آراستہ کرکے اپنے ہاتھوں سے اسکا نشان افسری درست کرتے اور اسکے گلے میں تلوار حمائل کرتے پھر اسکے نام کا خطبہ پڑھواتے اس کی مثالوں میں سے ایک مثال وہ دربار ہے جو خلیفہ مستظہر باللہ عباسی نے محمد بن ملکشاہ کو متولی سلطنت بناتے وقت بغداد میں منعقد کیا تھا اور اسموقعہ پر ملکشاہ کا بھائی "سنجر" بھی موجود تھا۔ خلیفہ نے "قبہ تاج" کے اندر ان دونوں بھائیوں کو اپنے تخت کے پایہ پر بٹھایا۔ اسوقت خلیفہ کے بازو پر چادر نبوی تھی سر پر عمامہ اور عصائے خلافت سامنے رکھا تھا خلیفہ نے محمد کو خلعت عطا فرمایا۔ اپنے ہاتھوں سے اسکے گلے میں طوق سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن پہنائے اس کیواسطے نشان اپنے دست خاص سے مرتب کیا۔ تلوار اس کے گلے میں حمائل کی اور اسے پانچ گھوڑے بھی ساز و سامان سے آراستہ عطا فرمائے اسکے بعد جامع بغداد میں محمد بن ملکشاہ کی سلطنت کا خطبہ پڑھا گیا۔ سلطان کو اسی دربار میں جسمیں انہیں یہ منصب عطا ہوتا تھا اس قسم کے لقب بھی دیئے جاتے تھے، جنکی عبارتوں سے انکی وجہ سے خلافت کی تائید ظاہر ہوا کرتی تھی مثلاً ناصر الدولہ، سیف الدولہ اور عضد الدولہ وغیرہ وغیرہ۔

فوج اور اُس کے متعلقات

فوج کی تاریخ

فوج کی اصل و بنیاد۔ دور تمدن کی ابتدا میں انسانوں کی جرگہ بندیاں ہوا کرتی تھیں اور انکی فوجیں وہی خاندان کے لوگ جس وقت لڑائی کی ضرورت پیش آتی ہر ایک قبیلہ کے لوگ بلا کسی نظام و ترتیب کے

جمع ہو جاتے تھے اور جنگ کے بعد ہر شخص کو مال غنیمت میں سے نسبتاً اسی قدر حصہ حاصل ہوتا تھا جس کو وہ اپنی جوانمردی اور قوت بازو سے حاصل کر سکتا مگر جس زمانہ میں لوگوں نے حضریت (شہری زندگی) اختیار کی اور کاروبار کو باہم تقسیم کر لیا اور حکومتیں قائم ہوئیں تو سب سے پہلے جو پیشے اختیار کیے۔ وہ کہانت اور فوجی ملازمت تھی سب سے پہلے جس حکومت نے فوج کو بھرتی کیا وہ مصر کی فرعونی حکومت تھی اسنے بیسویں صدی قبل میلاد کے قریب زنگیوں اور حبشیوں سے ایک فوج بھرتی کی اور اُن کی مدد سے بحر احمر کے ساحلوں پر بسنے والی قوموں کو زیر کیا اس کے بعد اشور، بابل، اور فینیقیہ اور یونان کی قدیم حکومتوں نے اسی کا تتبع کیا۔ اُن سے رومانیوں نے اور ان سے مسلمانوں نے اخذ کیا۔

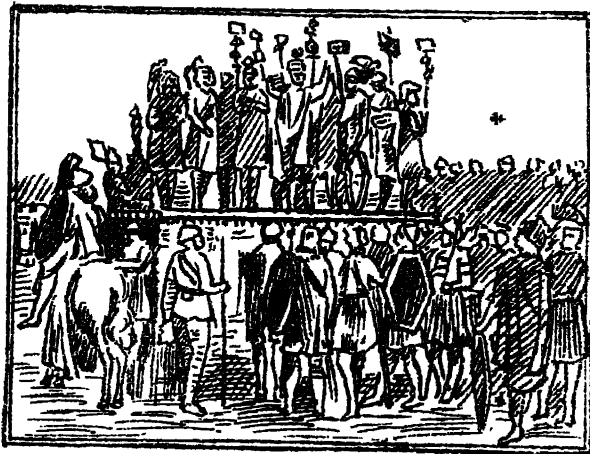
فراعنہ مصر کے یہاں فوجی نظام اس شکل سے قائم ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں پے در پے گنجان اور سیدھی صفیں استادہ ہوتی تھی چنانچہ اُن کے دفینوں کی شکستہ عمارتوں کے کھنڈروں پر ان صفوف کی بہت سی تصویریں پائی جاتی ہیں فراعنہ مصر سے اہل یونان نے اس نظام کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ لیا انہوں نے پلٹنیں تیار کیں جنہیں وہ اپنی زبان میں لفظ (Phalanx) سے تعبیر کرتے تھے اور انکے نظم و ترتیب کی صورت یہ تھی کہ فوجی سپاہی پے در پے صفوں میں سیدھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ایک پلٹن ... ۲۵ آدمیوں سے مرتب ہوتی تھی جس کے سپاہی ایکدوسرے کے پہلو بہ پہلو چند قدموں کے فاصلوں سے استادہ ہوتے اور صفیں ایکدوسرے کے پیچھے برابر چلی جاتی تھیں فیلبس، والئے مقدونیہ نے پلٹن کے جوانوں کی تعداد مذکورہ بالا شمار سے دگنی کر دی اور فیلبس کے بعد اس کے بیٹے اسکندر نے چوگنی۔ اسکندر نے سپاہیوں کو اسقدر پاس پاس کھڑا کرنا شروع کیا کہ انکے کندھے باہم قریباً ملے رہتے تھے اور ان کی ڈھالیں ایکدوسرے سے ملجاتی تھیں نیز اسی اسکندر نے اپنے سپاہیوں کے لئے نیزے بنوائے تھے جنمیں سے بعض نیزے ۲۴ فیٹ لمبے ہوتے تھے اگلی صف کے نیزے چھوٹے ہوا کرتے اور اسکی مابعد کی صفوں میں درجہ بدرجہ بڑے ہوتے چلے جاتے یہانتک کہ پانچویں صف کے نیزے تقریباً تین قدم آگے کو نکلے رہتے۔ فلپس نے سواروں کی بھی ایک جماعت مرتب کی تھی اس کے بیٹے نے اس جماعت کے ہتھیاروں میں اضافہ کیا منجملہ انہیں جدید اسلحہ کے ایک ہتھیار منجنیق بھی تھا۔ چنانچہ چوتھی صدی قبل ولادت مسیح میں سکندر نے اسی نظام کے ذریعہ سے تمام دنیا پر غلبہ حاصل کیا تھا۔

رومی فوج رومانی حکومت قائم ہوئی تو اس نے یونانی صف بندی کے نظام کو اپنی فوج میں رواج دیا۔

سوبانی لشکر آغاز حکومت میں ایک ایسے گروہ سے مرکب ہوتا تھا جسکے آدمیونکی تعداد ۶۰۰۰ ہوا کرتی تھی اور اس تعداد کو تین حصوں کے آدمیوں سے ترتیب دیتے تھے (۱) نوجوان لوگ جنکی صف لڑائی میں سب سے آگے ہوتی تھی (۲) ادھیڑ لوگ جو دوسری صف میں رہتے تھے (۳) تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگ سب سے پیچھے تیسری صف میں ہوتے۔ انمیں سے ہر ایک کے آگے ایک جماعت سواروں کی موجود رہتی جو تلواریں حمائل کئے جھنڈیاں وغیرہ لئے اس خدمت پر مامور رہا کرتے تھے کہ پیادہ فوج کو بچانے کے کام آئیں اور دشمنوں کو اپنی جنگ میں الجھائے رہیں

اسکے کچھ دنوں بعد رومانیوں نے فوج کی اس فرقہ بندی کو بلا ترتیب صف کے متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا ہر ایک ٹکڑی کی تین قسمیں اور ہر قسم کے دو حصے اور ہر حصہ میں سو سپاہی ہوتے تھے۔ یہ نظام اگلے نظام مذکورہ سے سراسر خلاف تھا۔ کیونکہ اسمیں سپاہیوں کی صرف ایک ہی صف یا ایک ہی پلٹن نہوتی تھی بلکہ متعدد ٹکڑیاں ہوتی تہیں اور ہر ایک ٹکڑی بجائے خود ایک فوج ہوا کرتی تھی چنانچہ آگے چلکر اسکی پوری تفصیل بیان کیجائیگی اسلامی فتوحات شروع ہونے تک رومانی فوج کا نظام اسی صورت سے قائم رہا۔ پھر اسمیں کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔

جس وقت اسلام کا ظہور ہوا ہے رومی افواج کی تعداد ۲۰۰۰۰۰ تھی جسکے ہر دس ہزار سپاہیوں کا ایک جنرل ہوا کرتا تھا جو لفظ غالب بطریق ہوتا ہے۔ اس بطریق کے ماتحت دو کپتان ہوتے تھے جنکو "طومرخان" کہتے تھے انمیں سے ہر ایک ۵۰۰۰ سپاہیوں پر کمان کرتا تھا اور ہر ایک "طومرخان" کے ماتحت پانچ "طرنجاریہ" ہوتے تھے جنمیں سے ہر ایک ہزار آدمیوں کا افسر ہوتا۔ پھر ہر ایک طرنجاریہ کی ماتحت پانچ "قومس" ہوتے جنمیں ہر ایک قومس ۲۰۰ سپاہیوں کا افسر بنایا جاتا۔ قومس کے نیچے "قمطرخ" اور اسکے بھی ماتحت "داخرخ" ہوتا جس کے ماتحت



رومی سپہ سالار، انکی فوجیں اور انکے اوزار و ہتھیار

دس سپاہی ہوتے اس نظام میں ان دنوں کے فوجی نظام کے ساتھ پوری مشابہت نظر آتی ہے۔

اہل فارس کے ہاں لشکر کے چار طبقے ہوتے تھے پہلا طبقہ بڑے بڑے سرداروں کا جنمیں سے ہر ایک کو میران کہا جاتا تھا اس کے ماتحت چار اور افسر ہوتے جنمیں سے ہر ایک کو اسپہبد کہتے اور ہر اسپہبد کے نیچے چار مرزبان پھر ہر مرزبان کے نیچے چار سالار اور ہر سالار کے نیچے دس سوار اور پانچ پیدل ہوا کرتے جنہیں پیادہ کہتے تھے۔

عربی فوج اسلام سے قبل اہل عرب بالکل بدوی (جنگلی) تھے اُن کے ہاں کوئی فوجی نظام نہ تھا بلکہ قبیلے قبیلے جدا تھے ان کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی قبیلہ جنگ کے لئے تیار ہوتا تو اپنے ہاں کے مرد لیا کو چھانٹ کر انہیں سے فوج مرتب کر لیتا جنہیں سوار اور پیدل دونوں قسم کے لوگ ہوتے تھے اور اُن کے پاس زمانہ جاہلیت کے مشہور اسلحہ مثلاً کمان، نیزہ، اور تلوار موجود ہوتے ہاں اُن عربی سلطنتوں میں جنہوں نے اسلام سے قبل تمدن کا عروج دکھایا فوجی نظام کا وجود پایا جاتا تھا جیسے شاہان تبع۔ اور حکمرانان حمیر اور منذری گھرانے کے فرمانروا جنکا دارالملک "حیرہ" ایک مشہور شہر تھا مورخین نے مناذرہ کے یہاں دو فوجی جماعتوں کا ہونا بیان کیا ہے جنمیں سے ایک کو "دوسر" اور دوسری کو "شہباء" کے نام سے مشہور کرتے تھے باقی رہے حجاز کے عرب وہ اسلام سے پہلے اُسی بدوی فطرت پر قائم تھے جسکا اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

اسلام کا ظہور ہوا تو اہل اسلام باقی تمام اہل عرب سے علیحدہ ہو گئے اور دین کی اجتماعی قوت نے اُنہیں یکدست بنا کر دشمنوں کیساتھ جنگ کرنے کیلئے متفق اور متحد کر دیا اسوجہ سے وہ چھوٹے بڑے سب کے سب سپاہی تھے مسلمانوں کے پہلے سپاہی مہاجرین تھے۔ مگر وہ مدینہ میں آئے تو انصار سے ملکر سب ایک ہی لوگ بن گئے جن کے کمان افسر خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے اور انکا باہمی رابطہ معاہدہ دوستی اور اسلامی بھائی چارہ کی قوت تھی ان دنوں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

اس کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابی بکرؓ کے زمانوں میں غزوات اور فتوحات کیوجہ سے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی کیونکہ اب روز بروز عربی قبائل کے چھوٹے بڑے لوگ نجد، یمامہ، یمن اور حجاز سے اُنمیں ملتے جاتے تھے، اور اسلامی اجتماع ان کو یکجا کرتا جاتا تھا جسمیں کا وہ تھوڑے سے بہت ہو گئے اور اُنہوں نے ہمدوش ہو کر شام، عراق اور مصر کے ملکوں پر حملے کر کے ان سب کو فتح کر لیا نئے نئے شہر آباد کئے اور مختلف حصوں میں منقسم ہو کر علیحدہ علیحدہ مقامات میں رہنے لگے چنانچہ کچھ مصر میں۔ کچھ شام میں اور بعض عراق میں مقیم ہوئے اور باقیوں نے خاص خاص چھاؤنیوں میں ڈیرے ڈالدیئے ہر ایک چھاؤنی کی فوج قبائل

اور گھرانوں کے اعتبار سے منقسم ہوا کرتی تھی۔ مثلاً (عساکر) بصرہ کے پانچ حصے تھے جن کو "اخماس" کہتے تھے ہر ایک حصہ (خمس) میں ایک قبیلہ حسب ذیل قبائل میں سے رہتا تھا۔

ازد، تمیم، بکر، عبد القیس اور اہل عالیہ (قریش۔ کنانہ۔ ازد۔ بجیلہ۔ خثعم تمام گھرانا قیس عیلان کا اور مزینہ) یہ سب مسلمان عربوں کے قبیلے تھے اور اہل عالیہ اور کوفہ کے رہنے والوں کو اہل مدینہ کے نام سے موسوم کرتے تھے، ہر ایک خمس پر انہیں قبائل کے امراء میں سے ایک شخص امیر ہوا کرتا تھا۔ اسی انداز پر مسلمانوں کی تمام فوجی طاقتوں کو قیاس کرنا چاہیئے خواہ وہ کوفہ میں رہتے ہوں یا فسطاط وغیرہ شہروں میں جنکو مسلمانوں ہی لئے آباد کیا تھا، یا ان کے علاوہ عراق، شام اور مصر کے دوسرے نامی شہروں میں قیام رکھتے ہوں گویا کہ مسلمانوں کی فوجیں ہر ایک ملک میں تھیں، اور ان کی تقسیم اسی ڈھنگ سے ہوتی تھی۔

باوجود اس کے کہ تمام جنگجو سپاہی تھے انہیں سے کوئی شخص سوائے شمشیر زنی کے دوسرا کوئی پیشہ یا کام نہیں کرتا تھا، عمر بن الخطابؓ نے انہیں کھیتی باڑی کے دھندوں میں پڑنے سے بھی منع فرما دیا گویا کہ خلیفہ ممدوح نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں نے ممالک کو فتح کرنے اور سرسبز زمینوں پر قابض ہونے کے بعد آرام طلبی اور جنگ سے دست کشی کرنی چاہی تھی، لہذا اپنے تمام ملکوں میں منادی کرا دی کہ امیر افواج (جنرل) اپنی رعیت (سپاہ) سے کہدیں کہ انکا وظیفہ کر دیا گیا ہے اور ان کے بال بچوں کیلئے بھی وظائف مقرر ہو چکے ہیں اسلیئے کہ وہ لوگ کھیتی کرنے کی جانب مائل نہوں، شاید حضرت عمرؓ نے اس قسم کے حکم میں یہ مصلحت بھی رکھی ہو کہ جنگجو مسلمان کسی ملک میں وطن نہ بنالیں تاکہ انہیں اپنے ان بھائیوں کی کمک کیلئے جو کہیں در مصروف جنگ ہوں یا کسی علاقہ کی حفاظت کی غرض سے جاتے وقت جس کا کہ اکثر اتفاق پڑتا رہتا تھا نقل و حرکت شاق نہ گذرے۔

مسلمانوں کی عام جماعتوں کے علاوہ فوج کی ایک علیحدہ جماعت کا انتظم کرنا حضرت عمرؓ کے عہد میں دفاتر کھلنے کے وقت سے شروع ہو کر بنی امیہ کے عہد میں مکمل ہوا جس کا بیان آگے آئیگا، تواریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگی خدمت کا لزوم اور باقاعدہ فوجی ملازمت کا دستور بنی امیہ کے وسط میں شروع ہوا اس سے پہلے لوگ دینی جہاد کے طور پر لڑائیوں میں شریک ہو کر مال غنیمت اور اپنے ہاتھوں سے قتل کیئے ہوئے دشمن کے سامان سے فائدہ اٹھاتے تھے، حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کے بعد اہل اسلام بیرونی دشمنوں کو چھوڑ کر آپس میں کٹنے مرنے اور خانہ جنگیاں کرنے لگے، ایک مدت تک انکا یہی طریقہ رہا اور انکا

ہر ایک گروہ اپنے خیال اور اعتقاد کو محفوظ رکھنے کیلئے اس لحاظ سے کہ وہ حق پر ہے اور حق کو باطل کے صدمہ سے بچا رہا ہے اپنے مخالف اعتقاد والے فرقہ کیساتھ مصروف جنگ رہا مگر جس وقت کاروبار حکومت بنی امیہ کے قابو میں آگیا اور مسلمانوں کی حکومت متحد ہو گئی اور اموی عنصر کے غالب آجانے سے گروہ بندیوں کا زور گھٹ چلا۔ اسوقت لوگوں کے خیالات کسی ایسے معاملہ کی جانب مائل ہونے سے رک گئے جو انہیں جنگ پر آمادہ کرے اور لڑتے رہنے کا شوق دلائے۔ اس وجہ سے لوگوں نے خانہ نشینی اور آرام طلبی اختیار کرنی شروع کی اس حالت کو دیکھ کر خلفائے مجبور ہوئے کہ فوجی ملازمت کا سلسلہ شروع کریں سب سے پہلے جس شخص نے فوجی ملازمت کی بنیاد ڈالی وہ شاید حجاج بن یوسف ثقفی تھا اور اُسنے عبد الملک بن مروان کے عہد میں یہ سلسلہ قائم کیا اس زمانہ میں اموی حکومت اپنی ترقی کے بلند ترین زینہ پر پہنچ چکی تھی مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تھی اور وہ لوگ دنیا میں ہر قسم کے کاروبار خصوصاً کھیتی باڑی کی طرف مائل ہو چلے تھے نیز جنگی مشغلوں کے باقی نہ رہنے سے وہ ایک طرح مطلق العنان بھی ہو چکے تھے۔ اگرچہ اکثر اہل اسلام نے امیر معاویہ ہی کے زمانہ میں جنگ اور فوجی خدمت سے الگ رہ کر گوشہ نشینی اختیار کرنے یا دیگر مشاغل کیطرف متوجہ ہونیکا قصد کیا تھا لیکن امیر ممدوح نے انکو اپنی حکمت عملی سے قابو کر لیا اور اس ارادہ سے باز رکھا اور بے دریغ انعامات و عطیات سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا جس وقت معاویہ کے بعد ان کا بیٹا یزید اور اس کے بعد معاویہ دوم پھر اُسکے بعد مروان بن حکم حکمران ہوئے تو چونکہ ان لوگوں میں سے ایک بھی اس ڈھنگ کا آدمی نہ تھا کہ لوگوں کے دل اپنی جانب مائل رکھتا اور مسلمانوں کو اپنی اطاعت سے باہر نہ ہونے دیتا اس لئے فوجی لوگوں کو بیٹھ رہنے اور آرام طلبی کی عادت پیدا ہو گئی چنانچہ جب عبد الملک خلافت کا والی مقرر ہوا اسوقت بھی فوج کی یہ حالت تھی نہ تو سپاہی اسکے ساتھ کوچ کرتے اور نہ اُسکے مقام کیساتھ مقام کرتے تھے، عبد الملک نے اس حالت کی شکایت اپنے "صاحب شرطہ" (پولیس کمشنر) روح بن زنباع" سے کی، وہ خلیفہ سے کہنے لگا۔ کہ امیر المومنین میری ماتحتی میں ایک شخص ہے اگر آپ اسے اپنی فوج کا افسر بنا دیں تو وہ سب کو سیدھا کر دیگا۔ اور آپ کے ساتھ ہی ساتھ کوچ و مقام کرائیگا۔ اس شخص کا نام حجاج بن یوسف ہے" عبد الملک نے اس کی بات مان لی اور حجاج کو فوج کا افسر بنا دیا حجاج نہائیت تند مزاج اور ظالم شخص تھا۔ اس لئے کسی سپاہی کو اسکے حکم سے سرتابی کرنیکا یارا نہ تھا اُسوقت سے فوج برابر خلیفہ کے ساتھ ہی ساتھ کوچ و مقام کرتی جاتی تھی مگر روح بن زنباع کے ماتحت پھر بھی اس قاعدہ کی پابندی یا حجاج کے حکم کی ذرہ بھی پرواہ نہ کرتے تھے ایکدن حجاج نے انکو کچھ

دیکھا کہ اور سب تو کوچ کر گئے ہیں لیکن وہ ابھی کھانا کھا رہے ہیں حجاج نے یہ حالت دیکھ کر اُن سے دریافت کیا۔ تم لوگ امیرالمومنین کیساتھ کوچ کرنے سے کیوں رک گئے؟ روح بن زنباغ کے ملازموں نے بجائے اسکے کہ کوئی عذر یا اپنی خطا کا اقرار کرتے، حجاج کو مخاطب کرکے یہ بات کہی "اے بھتیجے تو بھی گھوڑے سے اتر کے ہمارے ساتھ کھانا کھالے" حجاج نے ان کی یہ گستاخی دیکھ کر کہا۔ افسوس اب تو مجھے جو کچھ ان کی پاسداری تھی وہ بھی جاتی رہی، یہ کہہ کر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو کوڑوں سے پیٹ کر تمام فوج میں پھراؤ اور تشہیر کرو تاکہ اوروں کو عبرت حاصل ہو اور یہ بھی حکم دیا کہ روح بن زنباغ کے خیموں کو آگ لگا کر جلا دو حجاج کے ماتحتوں نے اس حکم کی فوراً تعمیل کر دی روح بن زنباغ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ روتا پیٹتا عبدالملک بن مروان کی خدمت میں پہنچا۔ عبدالملک نے دریافت کیا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے روتے کیوں آگئے؟ ابن زنباغ نے عرض کی، امیرالمومنین! حجاج بن یوسف جو کل میری ماتحتی میں ایک ادنٰی خادم کی حیثیت رکھتا تھا آج اس نے میرے غلاموں کو کوڑے لگوائے اور میرے خیمے جلوائے ہیں" عبدالملک نے جھلا کر حکم دیا۔ اُسے ابھی میرے روبرو حاضر کرو! حجاج خلیفہ کے حضور میں پیش ہوا۔ تو خلیفہ نے بگڑ کر اس سے پوچھا "تو نے کیوں اس قسم کی نامناسب حرکت کی اس کی وجہ کیا تھی؟"

حجاج "امیرالمومنین! میں نے کیا کیا؟"

عبدالملک "اور نہیں تو کس نے کیا؟"

حجاج "واللہ اے امیرالمومنین یہ کام آپ نے کیا۔ میرا کوڑا آپ کا کوڑا اور میرا ہاتھ آپ کا ہاتھ ہے امیرالمومنین کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ وہ بن زنباغ کو ایک غلام کے بدلے دو غلام اور ایک خیمے کے بدلے دو خیمے عطا فرما دیں اور مجھے جو مرتبہ امیرالمومنین نے عطا فرمایا ہے روح بن زنباغ کے خیال سے اسکو بھی نہ گھٹائیں" خلیفہ نے یہ حاضر جوابی اور معقول گفتگو سن کر روح بن زنباغ کو اسکے ضائع شدہ سامان کا معاوضہ دلوا دیا اور حجاج کے منصب میں ترقی کر دی یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفہ کو حجاج بن یوسف کی لیاقت اور کارگذاری کا علم حاصل ہوا۔

یہ بیان پڑھنے کے بعد شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ مماسی زمانہ سے لازمی فوجی خدمات کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس کے بعد پھر تو یہ ایک قابل عمل طریقہ بن گیا اور اسلامی فوج کے دو گروہ ہوگئے (۱) تنخواہ دار (۲) خوشی خاطر سے فوجی خدمت انجام دینے والے (والنٹیر) یہ دونوں جماعتیں اہل عرب ہی کی ہوتی تھیں جو اپنے نسب کے لحاظ سے یا تو قحطانی کہلاتے یا عدنانی۔ اور وہ لوگ یمن کے باشندے تھے یا عدنان سے

منسوب اور یہ لوگ "مضری" کہلانے سے تھے، فوج کے ان دونوں گروہوں میں آزاد شدہ غلاموں اور ایسے لوگوں کی جو غلامی کی حالت میں ہوتے ایک کافی تعداد ہوا کرتی تھی؛

عہد اسلام میں اہل عجم کی فوجیں | بنو عباس کا زمانہ آیا اور ان کو اپنی حکومت کے پرزور بنانے کیلئے غیر ملکی لوگوں سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو خالص عربی فوجوں میں غیر اقوام کی بھی متعدد جتھیں داخل ہو گئیں عجمیوں میں سے اول اول جن کا قدم لشکر اسلام میں آیا وہ اہل خراسان تھے، کیونکہ اسی قسم کے لوگوں نے ابی مسلم خراسانی کی ماتحتی میں بنو عباس کی دعوت پھیلانے میں امداد دے کر ان کو عنان خلافت پر قابض کر دیا تھا چنانچہ خلیفہ منصور کے زمانہ میں فوجی سپاہی تین گروہ پر منقسم تھے (۱) یمن کے عرب (۲) مضری گروہ کے عرب (۳) خراسانی اہل عجم پھر ان کے علاوہ ایک اور چوتھے فرقہ کا بھی اضافہ کیا گیا جو محافظ خاص کا دستہ تھا خلفاء نے اس فوج کو اپنی جان کی حفاظت کیلئے مرتب کیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں حکمرانوں کے واسطے طرح طرح کے جال بچھائے جاتے تھے، ملک میں عام طور پر خفیہ منصوبے اور سازشیں کی جاتی تھیں اور خلفاء پر حملے ہوتے رہتے تھے لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس طریقہ سے خلفاء نے اپنی حکومت کا تحفظ کرنا چاہا تھا وہی آخر کار حکومت کو اُن کے ہاتھوں سے نکال دینے کا سبب بن گیا۔

سنہ ۲۱۸ھ میں جبکہ خلافت کا دور معتصم باللہ تک پہنچا ہے اس زمانہ میں غیر ملکی لوگوں کا عنصر حکومت پر غالب آچکا تھا اور خلفا اپنی جان سے بہت خائف رہا کرتے تھے، معتصم بھی اسی لئے اپنی فوج کی جانب سے ڈر کر مجبور ہو گیا کہ مصر کے (شرقیہ و دو تھیلہ) باشندگان اہل حوف سے ایک فوج اپنی حفاظت کیلئے تیار کرے چنانچہ اس نے انہیں اپنے باڈیگارڈ میں رکھ کر اُنکا نام "مغاربہ" رکھا اور ممکن ہے کہ ان لوگوں میں کچھ ملک مصر کے رہنے والے بھی رہے ہوں، نیز معتصم باللہ نے اشروسنہ۔ سمرقند اور فرغانہ کے رہنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد بغداد کے بازاروں سے وقتاً فوقتاً خرید کر جمع کی تھی، اور ان غلاموں کی بھی ایک خاص فوج مرتب کی تھی انکا نام پہلے "فراغنہ" رکھا تھا پھر "ترکون" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ سپاہی عباسی حکومت کیلئے اور تمام فوجی لوگوں سے بڑھ کر خطرناک نکلے، یعنی آخر کار ان کے ہاتھوں امراء سلطنت پر بڑے بڑے ستم ٹوٹنے لگے اور نیز یہ لوگ اصل عربی فوج کی تحقیر اور تمام اہل بغداد کی ایذا رسانی کے بھی مرتکب ہوئے یہاں تک کہ اکثر بغداد کی سڑکوں پر سوار ہو کر نکلتے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دیتے جسکی وجہ سے مرد عورتیں اور بچے ان کی چپیٹ میں آکر بچارے زخمی ہو جاتے یا مر جاتے لوگوں نے دق ہوکر معتصم باللہ سے فریاد کی معتصم باللہ کو اس آفت

انسداد کی اس کے سوا اور کوئی ترکیب نہ سوجھی کہ اپنی فوج کو بغداد سے باہر نکال دے لہذا اُس نے ۲۲۱ھ میں قلعہ "سامرہ" بنوایا اور معہ اپنی فوج کے اس میں قیام کیا۔

معتصم باللہ کی خلافت اہل عرب کے لئے اپنے خلفاء سے بیزار ہونے اور اُنکی شکایت کرنیکا مقدمہ بھی تھی فوج کے لفظ سے ان دنوں ترک وغیرہ عجمی قوموں کے سپاہی مراد ہوتے اور "حربیہ" (جنگی سپاہ) سے عربی النسل مردان نبرد جن کی پیادہ جمعیت تھی ان دو فرقوں کے علاوہ ایک فرقہ "متطوعہ" کا اور بھی تھا۔ یہ لوگ اپنی مرضی سے جنگ میں شریک ہوتے اور غالباً مملکت اسلامی کی حدود سے باہر ملکوں میں جہاد کرتے رہتے تھے افواج خلافت میں کچھ اور گروہ بھی ہوتے تھے جو حسب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نُشّاب (تیر انداز) (۲) نفط (ایک مشتعل ہو جانے والا تیل جس سے دشمن کے قلعوں وغیرہ کو تیل لگاتے تھے) پھینکنے والے (۳) منجنیق چلانے والے جو اس زمانہ کے توپچیوں کے قائم مقام ہوتے تھے (۴) عیار گوپھن کے ذریعہ سے پتھروں اور ڈھیلوں کی مار کرنیوالے نیز فوج کیلئے طبیبوں اور جراحوں کا بھی عملہ رہتا تھا جو امن اور جنگ ہر حالت میں موجود رہتا۔ جسطرح آجکل کی متمدن اقوام میں فوجی ہسپتال ضرور ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ترکی فوج سے کئی ایک اور گروہ تیار ہوتے گئے جنہوں نے حکومت میں اپنا اپنا اثر اور اقتدار بڑھانیکی فکریں اور چپقلیں شروع کیں۔ ان فرقوں میں سے ایک "شاکریہ" نامی گروہ تھا جو مہتدی باللہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوا تھا اور مستعین باللہ کے دور میں پروان چڑھا۔ اسی اثناء میں خلفاء کے بلاط میں ایک قسم کا خاص محافظ دستہ مقرر ہو گیا جنکا نام "غلمان حجریہ" رکھا گیا بنی فاطمہ کے عہد میں بھی ان لوگوں کا ایک فرقہ تھا۔ عرب پیدل فوج کا ایک بڑا حصہ لے کر اس سے جدا ایک گروہ تیار ہوا۔ جو "مردان نبرد" کے نام سے مشہور ہوا اس کے بعد ایک اور فرقہ پیدا ہوا جو مقتدر باللہ عباسی کے ایک عامل ابن الساج کی نسبت سے "فرقہ ساجیہ" کہلاتا تھا اسوقت پر ہم عباسی حکومت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اور بھی کئی گروہوں کے نام ملتے ہیں مثلاً بلالیہ اور سعدیہ وغیرہ وغیرہ یہ تمام گروہ اپنی اپنی جگہ اس بات کی پوری کوشش کرتے رہتے تھے کہ سلطنت میں انہیں کا اثر غالب رہے۔ اسیوجہ سے اکثر اوقات خود اُن کے مابین یا انکے اور خلفاء کی محافظ فوج کے مابین فساد اور دنگے ہو جایا کرتے جنکا انجام یہ ہوا کہ حکمرانی کا سلسلہ اہل عرب کے ہاتھوں سے نکل گیا اور قریش اور اہل عرب کا معاملہ بالکل ٹھپ ہو گیا۔ جسکا بیان آگے چل کر آجائیگا اور حکومت کے کاروبار ترکوں وغیرہ عجمی النسل اقوام میں قابو میں چلے گئے جن کی کئی مشہور حکومتیں قائم ہوئیں اور مدت تک بڑی شان و شکوہ کے ساتھ حکمران رہیں۔

فوجی دفتر

فوجی دفتر کی بنیاد مدینہ میں اوّل اوّل عمر بن الخطاب رضؓ کے ہاتھوں پڑی۔ اس دفتر میں مسلمان مردوں کے نام لکھے گئے اور اُن کے وظیفوں کی شرح قرار پائی۔ ابتداءً یہ دفتر فوجی دفتر نہیں کہلاتا تھا۔ بلکہ صرف "دیوان" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا اُسمیں تمام مہاجرین۔ انصار اور اُن کے تابعین کے نام بشرح تنخواہ درج کئے گئے تھے اور وظیفہ کی تنخواہ کا کم و بیش ہونا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قرابت اور اسلام قبول کرنے میں سبقت کے لحاظ سے ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک مسلمان اپنی تنخواہ خود پاتا تھا اور اس کے بیوی بچوں کا وظیفہ علیحدہ مقرر ہوتا تھا اسباب کو ملحوظ رکھ کر یہ کہنا کچھ بیجا نہو گا کہ وہ دفتر مسلمانوں کا تھا کیونکہ ان دنوں جملہ اہل اسلام فوجی سپاہی تھے جس زمانہ تک سابق الاسلام لوگ موجود رہے وظائف کی کمی بیشی میں انکا اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتہ داروں کا لحاظ کیا جاتا رہا۔ مگر اُن کے رفتہ رفتہ نابود ہو جانے پر جبکہ اسلامی فوج مسلمانوں کی ایک خود بخود قائم رہنے والی جماعت رہگئی اسوقت اس کی ترتیب شجاعت اور جنگ میں استقلال و پامردی ظاہر کرنے پر منحصر ہوگئی اور جوہر ذاتی کی بنا پر عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔

عام لوگوں میں سے فوج کیلئے سپاہیوں کی بھرتی کرنے کا ایک خاص طریقہ تھا اور جنگی خدمت کے خواہشمند کیواسطے چند شرطیں مقرر تھیں جنمیں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو شخص فوج میں بھرتی ہونا چاہتا وہ طلب ہونے پر "افسر دیوان فوج" کے پاس پیش ہوتا جو یہ دیکھتا تھا کہ آیا امیدوار فوج میں رکھنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر وہ آزاد، بالغ، مسلمان، تندرست صحیح الحواس اور دلیر نہوتا تو فوجی خدمت انجام دینے کے ناقابل سمجھا جاتا اور جو وہ تمام شرطوں میں پورا اترتا تو اس کا نام معہ نسب اور حلیے کے دفتر میں لکھ لیا جاتا۔ نام لکھتے وقت اُس شخص کے تمام امتیازی اوصاف و علامات کو بڑی احتیاط سے قلمبند کرتے تاکہ اگر ایک نام کے کئی آدمی ہوں تو گڑبڑ نہ پڑے۔

دفتر میں سپاہیوں کی ترتیب کے وقت ہمیشہ اُنہیں قواعد کا لحاظ ہوتا تھا جن کو عمر بن الخطاب رضؓ نے سابقہ اور نسب کے اعتبار سے قرار دیا تھا، اولاً فوج کی ترتیب جنسوں اور قبیلوں سے شروع ہوتی جبوقت ہر ایک قبیلہ اور جنس دوسری سے متمیز ہو جاتی، تو وہ دو حال سے خالی نہ ہوتی یعنے عربی یا عجمی پس اگر سپاہی عربی النسل

ہوتی تھی تو انکے قبیلوں کی ترتیب باعتبار نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مندوں کے ہوتی ہے۔ ترتیب کی ابتدا خاندان نبوی کی اصل سے کیجاتی اس کے بعد اُس کی شاخوں کی نوبت آتی مثلاً اہل عرب کی دو قسمیں ہیں عدنانی اور قحطانی۔ عدنانی عرب قحطانیوں پر مقدم کئے جاتے تھے کیونکہ نبوت انہی کے گھرانے میں تھی۔ عدنان مجموعہ ہے ربیعہ اور مضر کا۔ ان میں سے مضر کو فوقیت ہے اس لئے کہ نبوت ان میں تھی۔ مضر کی شاخیں ہیں قریش اور قریش کے علاوہ دوسرے کنبے۔ انمیں قریش کو فضیلت دی جاتی تھی کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اُسی خاندان سے تھے۔ قریش کے گھرانے ہیں بنو ہاشم اور بنو اُمیہ وغیرہ ہیں۔ مگر تقدم بنو ہاشم کو تھا اس وجہ سے کہ نبوت انکے گھرانے میں تھی گویا کہ بنو ہاشم اس ترتیب کے قطب اور مرکز تھے اور ان کے بعد وہ لوگ تھے جو ان کے ساتھ نسبی قرابت میں درجہ بدرجہ زیادہ نزدیک ہوتے تھے اور اگر فوجی سپاہی عجمی ہوتے اور کسی نسب پر مجتمع نہ ہو سکتے تھے تو ان کو جنس پر مجتمع کیا جاتا جیسے ترکی ہندی یا ملک اور سکونت پر مثلاً خراسانی فراغنہ اور مغربی پھر اگر ان عجمی لوگوں کو کسی قسم کا سابقہ حاصل ہوتا تو دیوان میں اس کے مطابق ترتیب پاتے تھے ورنہ قرب حاکم کے اعتبار سے اور اگر اس معاملہ میں بھی برابر ہوتے تو اسباب کا خیال کیا جاتا کہ کس فرقہ نے پہلے اس حاکم کی اطاعت اختیار کی ہے۔ فوجی دفتر کی کئی شاخیں تھیں کوئی مراسلت (پیغام رسانی) کیلئے کوئی عطا (تقسیم تنخواہ اور انعامات) کی غرض سے اور کوئی شاخ فوجی اور جنگی مصارف یا دیگر مختلف ضروریات وقت کے لئے

فوج کی تنخواہیں

فوجی عطیات سے ان کے وظیفے یا تنخواہیں مراد ہیں جو سال کے اندر مقررہ اوقات میں ان کو ملتی تھیں۔ عطیات نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں غیر محدود تھے اُن دنوں میں جس قدر مال غنیمت آتا اس کا ایک خمس نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے علیحدہ نکالنے کے بعد باقی چار حصے تمام صحابہ میں بلا کسی امتیاز و تفریق کے بانٹ دئیے جاتے۔ ابوبکرؓ نے بھی اسی دستور کی پابندی رکھی۔ حضرت عمرؓ کا دور شروع ہوا تو انہوں نے دفتر ترتیب دیا اور لوگوں کے وظائف میں باعتبار نسب اور سابقہ کے تمیز کی۔ اس لحاظ سے ان کی ترتیب طبقوں کے اعتبار سے رکھی اور ہر ایک کا راتب بلحاظ قرابت نبوی یا سابق الاسلام ہونے کی حیثیت سے مقرر کیا یا اس کے علاوہ اور حیثیتوں سے جیسا کہ فہرست ذیل سے واضح ہوگا۔ یہاں پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس جدول میں وظائف

کی جو مقدار درج کیجاتی ہے۔ یہ صدر اسلام میں سالانہ وظائف ہوتے تھے:

ہر ایک ایسے مہاجر اور انصاری کیلئے جسنے بدر کبریٰ کے جنگ میں شمولیت کا شرف حاصل کیا ہو	۵۰۰۰ درم
ہر ایک ایسے مہاجر اور انصاری کیواسطے جو اس میں شریک نہ ہو سکا	۴۰۰۰
ازواج نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۱۲۰۰۰
عباس رضی بن عبد المطلب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا	۱۲۰۰۰
حسن اور حسین رضی	۵۰۰۰
عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی (خلیفہ کے بیٹے)	۳۰۰۰
مہاجرین اور انصار کی ہر ایک لڑکی کو	۲۰۰۰
ہر ایک اہل مکہ کو	۸۰۰
ہر ایک مسلمان کیلئے جو مختلف طبقوں میں سے ہوں۔	۳۰۰ - ۵۰۰
مہاجرین اور انصار کی عورتیں	۲۰۰ - ۶۰۰

بعض روایتوں کے خفیف اختلاف کیساتھ عمرؓ کے زمانہ میں فوج کی تنخواہیں یا مسلمانوں کے وظیفے حسب مندرجہ بالا ہی تھے۔ اگر ان وظیفوں کی مقدار پر غور اور پھر ان کا آجکل کے وظائف سے مقابلہ کریں تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ اگر ہم درم کو ایک فرانک کے مساوی سمجھیں جو قیمت میں قریباً اتنا ہی ہوتا ہے تو اسلام کے بڑے سے بڑے لوگوں کا وظیفہ بھی پانچہزار فرانک سے زیادہ نہیں قرار پاتا جو قریباً دو سو گنی سالانہ ہوتا ہے اور اگر ہم مسلمانوں کو سپاہی مان لیں تو مہاجرین اور انصار اُن کے افسر ہوئے جن میں خود عمرؓ بھی تھے، اور جن کو ہمنے عام مسلمان لکھا ہے وہ نفر خیال کئے جاسکیں گے خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں اور انکے وظیفے اُن لوگوں (مہاجرین وانصار) سے کہیں کمتر تھے، کیونکہ وہ تین سو درم سے پانچسو درم تک قبلیہ جہاد اور فضیلت اسلامی کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے تھے تو گویا عمر بن الخطاب رضی کے عہد میں اسلامی فوج کے افسروں کی تنخواہیں چارہزار سے پانچہزار درم سالانہ تک اور سپاہیوں کی تین سو درم سے پانچسو درم سالانہ تک ہوتی تھیں، یہ تنخواہیں ان نقد وظائف کے جو اُن کی بیوی بچوں کو ملا کرتے تھے اور اس غلہ گندم کے علاوہ تھیں جو ہر ایک شخص کو دو جریب ماہوار کے حساب سے ملا کرتا تھا۔ ایک جریب ۳۶۰۰ گز مربع ہوتی ہے اور اس سے یہ مراد تھی کہ اس رقبہ میں جتنا غلہ پیدا ہو وہ سب اُن کو ملتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اوائل اسلام میں چھوٹے چھوٹے فوجی

سپاہیوں کی تنخواہیں بھی اس زمانہ کے سپاہیوں کی تنخواہوں سے زیادہ ہوتی تھیں مگر اُن کے افسروں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں فوجی وظائف کی مقدار اسیقدر رہتی چلی گئی مگر جبکہ بنو اُمیہ نے حکومت کی طمع کی اور معاویہؓ کو اہل عرب سے کمک لینے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے جن باتوں کی عربی قبائل سے کمک لی اُن میں ایک بڑی چیز مال بھی اور اس سے انہوں نے فوج کے وظائف بڑھا دیئے ان کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی تھے جنپر وہ سالانہ ساٹھ ملین درم صرف کرتے تھے اور یہ تعداد اُس خرچ کے مقابلہ میں جو عمرؓ اپنی فوج پر کیا کرتے تھے، دُگنی سے بھی زیادہ تھی۔

جن قبائل نے معاویہ کی دستگیری کی اور اُن کیطرف سے جنگ کرکے اُن کی دعوت کو مدد پہنچائی اُنمیں قبائل یمن کا قدم سب سے آگے تھا اور انہوں نے محض بطمع مال و زر ایسا کیا۔ کیونکہ صرف جہاد کی غرض سے لڑنیکا شوق اور ولولہ خلفائے راشدین ہی کے زمانہ تک تھا اور نبوت کی دہشت زائل ہوجانیسے اب وہ لوگوں کے دلوں میں کچھہ باقی نہ رہا تھا۔ معاویہؓ نے یمن کے لوگوں کا ایک مستقل دستہ اپنی فوج میں بھرتی کیا جنکی تعداد دو ہزار سوار تھی۔ ان کے وظیفے دوگنے مقرر کیئے اور ان کو تمام فوج سے الگ اور سب سے ممتاز بنا دیا تھا اُن کے امیروں سے اپنے اہم معاملات میں رائے لیتے اور اپنا مقرب بنائے رکھتے جس سے اہل یمن کا اس قدر زور ہوگیا اور اُنکی عظمت و اقتدار کو اتنی ترقی حاصل ہوئی کہ آخرکار وہ بنو اُمیہ کی حکومت کو اپنا زیر بار احسان سمجھنے اور جابجا اس کے چرچے کرنے لگے کہ اگر ہم چاہیں تو بنو مضر کو جنمیں بنو اُمیہ بھی داخل تھے ملک شام سے بالکل نکال باہر کریں۔ اسوجہ سے معاویہ ان لوگوں کو اپنا مقرب منظور نظر بنا کر نادم ہوئے اور اس قدر امتیاز دے کر بڑے پچھتائے اور اُن کا غرور توڑنے کیلئے ایک اور فرقہ کو جسکا لقب قیسیہ تھا اپنا مقرب بنالیا اور ان کو بھی ویسے ہی عطیات دینے لگے جیسے یمینہ کو ملتے تھے اسکے بعد سے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بحری جنگوں میں یمینہ فرقے کو اور خشکی میں "قیسیہ" گروہ کو مصروف بیکار رکھتے۔ یمنی لوگوں کو یہ امر شاق گذرا۔ کیونکہ "قیسیہ" فرقے کے لوگ مضر کے خاندان سے تھے اور انہوں نے معاویہؓ پر اپنی خفگی اسباب میں ظاہر کی جس کے سبب سے معاویہؓ نے دونوں کو اکھٹا کردیا اور اُنکے واسطے دونوں قسموں کی لڑائیوں میں شرکت کا دروازہ کہولدیا۔

معاویہؓ صرف فوج کے رضامند رکھنے ہی میں مال خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ساتھ مخالفت اور عداوت

رکھنے والوں کی شورشیں کم کرنے اور اپنے موافق لوگوں کی جماعتیں تیار کرتے رہنے پر بھی دل کھول کر روپیہ لگاتے تھے چنانچہ اکثر اوقات وہ اپنے عاملوں کو ایسے لوگوں کے عطیات میں اضافہ کی ہدایتیں کرتے رہتے جن کو سمجھتے کہ وہ علیؓ سے کوئی غرض رکھتے ہیں اور انکے عمال ان اغراض کو سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے نفاذ احکام نہیں کرتے تھے اس قسم کی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اہل کوفہ کو علیؓ کے ساتھ بہت الفت تھی لہذا معاویہ نے وہاں کے عامل نعمان بن بشیر کو اس بات کا حکم بھیجا کہ کوفہ کے باشندوں کے عطیات میں دس دینار کا اضافہ کردے نعمان نے گو اس حکم کے ماننے سے انکار کیا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہوا

یزید مروان اور عبدالملک کے زمانہ میں بھی عطیات کی یہی حالت برابر قائم رہی عبدالملک کو چونکہ ایک اور سخت دقت یہ بھی درپیش تھی کہ اس کے عہد میں خلافت کے بہت سے دعوے دار پیدا ہو گئے تھے اس وجہ سے وہ اپنے دعویداروں کی دلجوئی کرتے رہنے کی غرض سے اور بھی زیادہ انعام و اکرام دیتا رہتا تھا حجاج نے عبدالملک کے حکم سے "رتبیل" کی جانب جو فوج روانہ کی تھی اس کی تعداد چالیس ہزار تھی اس لشکر کی روانگی کے مصارف دو ملین درم تک پہنچ گئے تھے، یہ اخراجات ان کے عطیات اور ان رقموں کے علاوہ تھے جو اس فوج کے افسروں کو بطور انعام دیگئی تھیں ولید بن یزید نے متولی خلافت ہو کر اپنے خلیفہ ہونیکے دن فوج کے عطیات میں دس درم کا اور بھی اضافہ کر دیا ممکن ہے کہ اسنے اپنی کمزوری حکومت اور عیش پرستی کی خرابی کو دبا کر فوج کے رضامند کرنیکی نیت سے ایسا کیا ہو دولت بنو امیہ کے آخر زمانہ میں فوج کے وظیفے گھٹ گئے یہانتک کہ آخری خلیفہ کے عہد میں صرف پانچسو درم سالانہ فی سپاہی باقی رہگئے تھے؛

بنو عباس کو خلافت حاصل ہوئی تو سفاح نے سپاہی کی تنخواہ اسی درم ماہوار (۹۶۰ درم سالانہ) کر دی گویا اسنے فوج کا مشاہرہ الٹ کر پھر وہی مقرر کر دیا جو بنی امیہ کے ابتدائی دور خلافت میں رہ چکا تھا سوار کو اس سے دوگنا وظیفہ ملتا تھا تاکہ نصف تنخواہ وہ اپنے گھوڑے کے مصارف میں اٹھائے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت عباسیہ کی ترقی کیساتھ فوج کے وظائف میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس وہ روز بروز کم ہوتے گئے چنانچہ عہد مامون الرشید میں پیدل کی ماہوار تنخواہ صرف بیس درم اور سوار کی چالیس درم رہگئی سنہ ۲۰۱ھ میں عیسی بن محمد بن ابی خالد کا لشکر چالیس ہزار سپاہیوں کا تھا اور اسنے سوار کی تنخواہ چالیس درم ماہوار کر رکھی تہی اور پیدل کی بیس درم اسبات پر اتنا اور بھی اضافہ کر دینا چاہیئے کہ اس زمانہ میں بہ نسبت ابتدائے اسلام کے سونے کی قیمت چڑھ گئی تھی اور جو دینار عمرؓ کے عہد میں

دس درم کے مساوی ہوتا تھا وہ مامون کے زمانہ میں ۱۵ درم کے مساوی ہو گیا تھا

بیان بالا سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فوج کی تنخواہیں بنو امیہ کے عہد خلافت میں خلفائے راشدین کے زمانہ کی نسبت سے بڑھ گئی پھر بنو عباس کی حکومت میں کم ہو گئیں اس کا سبب تھا کہ بنی امیہ نے عربی قبیلوں کو اپنی خدمت کی رغبت دلانے اور اپنی حکومت کو تائید پہنچانے کی خواہش سے فوج کے عطیات بڑھا دیئے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے لیکن بنو عباس کے دور میں اہل عرب اسلامی ملکوں میں ہر چہار طرف منتشر ہو گئے اور اہل عجم سے مل جل گئے تھے۔ عباسی خلفا نے اہل عجم کی تعداد اپنی فوجوں میں بہت بڑھا دی تھی جسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں لوگوں نے ان کی قیام حکومت میں بڑی مدد دی تھی ان وجوہ سے عباسی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ان دو گروہوں میں سے جس سے چاہے فوجی خدمت لے۔ اہل عجم تھوڑی تنخواہوں اس کو قبول کر لیتے تھے اور باوجود اسکے پھر بھی وہ تنخواہیں اُن وظائف سے کہیں زیادہ تھیں جو روم والے اپنے سپاہیوں کو دیا کرتے تھے ابن خرداذبہ ناقل ہے کہ رومیوں کی ہاں سپاہیوں کی تنخواہ ۱۸ سے ۱۲ دینار سالانہ تک ہوا کرتی تھی اور اسکے ساتھ ہی وہ لوگ تیسرے چوتھے برس صرف ایکبار اپنے وظیفے حاصل کر سکتے تھے بخلاف اس کے عربی فوج کی تنخواہیں سالانہ ماہوار یا سہ ماہی یا ششماہی جیسا دستور ہوتا ٹھیک وقت پر ملا کرتی تھیں لیکن عباسی حکومت کے آخری دور میں یہ بات نہ رہی تھی بلکہ تنخواہوں کے ملنے میں دیر ہوتی اور کبھی کبھی کئی مہینے چڑھ جاتے اور اس کی وجہ سے جو شخص فوج کو راضی کرنے کی قدرت پاتا وہی خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تھا جیسا کہ فساد اور کمزوری کے ایام میں تمام حکومتوں کا انتظام بگڑ جایا کرتا ہے

سلجوقی خاندان کی حکومت تک فوج کی تنخواہیں برابر نقد ملا کرتی تھیں لیکن جس وقت اس خاندان کی حکومت کو عروج ہوا تو بجائے نقد تنخواہ کے سپاہیوں کو جاگیریں ملنے لگیں فوج والوں کو جاگیریں دینے کا طریقہ سب سے پہلے نظام الملک طوسی نے نکالا یہ نامور شخص جس نے ۴۸۵ھ میں وفات پائی ہے آل سلجوق کا وزیر اور بڑا افضل شخص تھا جس نے سلجوقی حکومت میں بحالت وزارت بہت سی مفید اصلاحیں کیں یہی سب سے پہلا مسلمان تھا جس نے بغداد میں مدرسوں کی بنیاد رکھی چنانچہ شہر کا مشہور مدرسہ نظامیہ اسی کے نام سے مشہور ہے یہ نامی گرامی شخص الپ ارسلان کا وزیر تھا اور پھر اس کے نامور بیٹے ملک شاہ کا بھی وزیر رہا اسکی قابلیت اور مدبرانہ پالیسی کا اسقدر گہرا اثر پڑا تھا کہ حکومت کے تمام کاروبار اسی کے قابو میں ہو گئے تھے سلطان کو صرف تخت نشینی اور سیر و شکار سے سروکار رہ گیا تھا۔ نظام الملک نے بیس برس تک اسی شان و شکوہ کیساتھ وزارت کے

نام سے حکمرانی کی وہ ایک دانشمند اور نیک دل خیرخواہ ملک و ملت تھا اُسنے خیال کیا کہ سلجوقی حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے ایسا نہو اسپر زوال آکر بہت جلد یہ ملک تو ہاتھ سے نکل جائے لہذا اُسنے یہ ضروری سمجھا کہ جاگیروں کے طریق سے حفظ مملکت کا سلسلہ قائم کرے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا کہ ملک کو مختلف چھوٹی بڑی جاگیروں میں تقسیم کرکے اہل فوج کے حوالہ کر دیا نظام الملک کا یہ خیال واقعی مناسب تھا کہ زمینوں کو جاگیرداروں کے سپرد کرنا ان کی سرسبزی اور زرخیزی کی ضمانت ہے کیونکہ وہ جاگیردار اپنے نفع کی خاطر اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور ملک کو اسطرح سرسبزی و خوشحالی نصیب ہو گی بخلاف اسکے اگر صرف ایک دفتر (شاہی دفتر) ملک کے تمام معاملات اور کاروبار کا نگران رہا تو خرابیاں پھیلتی جائینگی اور سلطنت میں خلل واقع ہو گا اس خیال کی بنا پر نظام الملک نے جاگیروں کا انتظام جاری کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مملکت آباد ہو گئی اور ملکی پیداوار نہایت افراط سے ہونے لگی چنانچہ گذشتہ صدی کے آغاز تک جسقدر حکمران اور سلاطین نظام الملک کے بعد گذرے ہیں سبھوں نے اس بارہ میں اسی کی پیروی کی اور اپنے ملکوں میں بھی جاگیروں کا انتظام رکھا اس کا مفصل حال جاگیروں کے بیان میں آگے چل کر بیان کیا جاوے گا۔

فوج کی تعداد

ہم نے یہ پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ صدر اسلام میں تمام مسلمان فوجی خدمت کے انجام دینے والے تھے اسلئے اس زمانہ میں جس قدر اُنکی تعداد تھی بالکل وہی تعداد اسلامی فوج کی تھی پہلے ہجری سال میں اسلامی فوج کی تعداد چند سو سے زائد نہ تھی جو مدینہ منورہ میں رہتی تھی بعد ازاں دیگر قبائل عرب کے داخل اسلام ہونے سے اُن کی تعداد بڑھنے لگی ایک صحیح حدیث بخاری میں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "جن لوگوں نے کلمہ اسلام اپنی زبان سے ادا کیا ہے اُنکی تعداد لکھی جائے" تو ہمنے ڈیڑھ ہزار نام قلمبند کر کے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کئے۔

غزوہ تبوک میں جو سب سے آخری غزوہ تھا اور ہجرت سے نویں برس واقع ہوا مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جن کے ساتھ دس ہزار گھوڑے تھے۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آخری وقت میں اسلامی فوج کی اتنی تعداد تھی اسکے بعد ابی بکر اور عمر کے عہد میں انکی تعداد زیادہ ہوتے ہوتے ڈیڑھ

لاکھ سے بڑھ گئی تھی اور خلفائے راشدین کے آخری عہد میں اس تعداد کو دو چند ہو جانا نصیب ہوا تھا۔
بنو امیہ کے ابتدائی دور میں بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے لوگوں میں سے فقط مردوں ہی
کی تعداد ۱۴۰۰۰۰ ہو گئی تھی جنمیں ۸۰ ہزار بصرہ میں اور ۶۰ ہزار کوفہ میں تھے ان آدمیوں کے ساتھ جو
متعلقین تھے ان کی تعداد ۳۰۰۰۰۰ تھی جس میں عورتیں اور بچے سب شامل تھے ملک مصر میں اہل عیال کے
علاوہ چالیس ہزار مرد تھے اور ملک شام کی فوج بھی اتنی ہی تھی اس کے علاوہ فارس وغیرہ کے ملکوں
میں جو سپاہ تھی اس کا شمار علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

عہد اسلام میں خلفاء کو مسلمانوں کی مردم شماری کرنے کی جانب بہت توجہ رہتی تھی ان کا یہ طریقہ
نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اقتدا کرنے کے خیال سے تھا انہوں نے عربی قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ پر ایک
شخص کو مقرر کر رکھا تھا جو ہر روز صبح کو اٹھ کر تمام ایسی جگہوں میں گھومتا پھرتا جہاں لوگ جمع ہو کر باہم باتیں
چیتیں کیا کرتے اور سبھوں سے دریافت کرتا جاتا کیا آج رات کو تمہارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟
اور کیا آج تمہارے ہاں کوئی مہمان آیا ہے؟ لوگ بتا دیتے کہ ہاں فلاں شخص کے لڑکی یا لڑکا پیدا
ہوا ہے جن کے نام وہ لکھ لیتا اور یہ بھی بتا دیتے کہ آج ہمارے قبیلے میں فلاں شخص اپنے بال بچوں سمیت
آکر ٹھیرا ہے اس نووارد کا اور اس کے گھر والوں کے نام بھی لکھ لئے جاتے جس وقت وہ شخص اس پوچھ
گچھ سے فراغت پاتا تو دفتر میں آکر ان سب نوزائیدہ بچوں اور آنیوالوں کے نام درج رجسٹر کر لیتا تھا

اس کے علاوہ ہر ولائت میں کچھ عرصہ بعد علیحدہ علیحدہ بھی مردم شماری ہوا کرتی تھی مثال کے
طور پر ایک ملک مصر کو لیجئے وہاں سب سے پہلے جو رجسٹر مردم شماری کے تیار ہوئے وہ عمرو بن العاص نے
کرائے تھے پھر عبدالعزیز بن مروان نے اس کام کی تجدید کی اور نئی مردم شماری کے بعد رجسٹر از سر نو ترتیب دلائے
عبدالعزیز بن مروان نے یہ کام اپنی امارت مصر کے زمانہ میں سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ تک کے عرصہ میں انجام دیا تھا اسکے بعد
سنہ ۹۰ھ سے سنہ ۹۶ھ تک قرہ بن شریک نے اور سنہ ۱۰۱ھ میں بشر بن صفوان نے اسے تازہ کیا سب سے آخری مردم شماری
جسکے ذریعہ سے تمام ملکوں اور شہروں کے عربی النسل لوگوں کی تعداد جانچی گئی سنہ ۱۰۵ھ سے سنہ ۱۲۷ھ تک
ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ہوئی تھی مگر افسوس کہ ان مردم شماریوں کی تعداد ہم کو نہیں ملی
کیونکہ وہ بھی بنو امیہ کے آثار کے اندر ضائع ہو گئیں بنو عباس والئے خلافت ہوئے تو انہوں نے اہل
عرب کی جانب توجہ کرنی لاحاصل سمجھی بلکہ ان کی بجائے اپنی تمام توجہ فارسیوں اور ترکوں وغیرہ عجمی قوموں کے

Continue from page 177.

فوجی دفتر

فوجی دفتر کی بنیاد مدینہ میں اوّل اوّل عمر بن الخطاب رضؓ کے ہاتھوں پڑی۔ اس دفتر میں مسلمان مولیٰ کے نام لکھے گئے اور اُن کے وظیفوں کی شرح قرار پائی۔ ابتداءً یہ دفتر فوجی دفتر نہیں کہلاتا تھا۔ بلکہ صرف "دیوان" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا اُسمیں تمام مہاجرین، انصار اور اُن کے تابعین کے نام بشرح تنخواہ درج کئے گئے تھے اور وظیفہ کی تنخواہ کا کم و بیش ہونا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قرابت اور اسلام قبول کرنے میں سبقت کے لحاظ سے ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک مسلمان اپنی تنخواہ خود پاتا تھا اور اس کے بیوی بچوں کا وظیفہ علیحدہ مقرر ہوتا تھا اسبات کو ملحوظ رکھکر یہ کہنا کچھ بیجا نہوگا کہ وہ دفتر مسلمانوں کا تھا کیونکہ اندنوں جملہ اہل اسلام فوجی سپاہی تھے جبتک زمانہ تک سابق الاسلام لوگ موجود رہے وظائف کی کمی بیشی میں انکا اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتہ داروں کا لحاظ کیا جاتا رہا۔ مگر اُن کے رفتہ رفتہ نابود ہو جانے پر جبکہ اسلامی فوج مسلمانوں کی ایک خودبخود قائم رہنے والی جماعت رہگئی اسوقت اس کی ترتیب شجاعت اور جنگ میں استقلال و پامردی ظاہر کرنے پر منحصر ہوگئی اور جوہر ذاتی کی بناپر عہدے اور مرتبے ملنے لگے۔

عام لوگوں میں سے فوج کیلئے سپاہیوں کی بھرتی کرنے کا ایک خاص طریقہ تھا اور جنگی خدمت کے خواہشمند کیواسطے چند شرطیں مقرر تھیں جنمیں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو شخص فوج میں بھرتی ہونا چاہتا وہ طلب ہونے پر "افسر دیوان فوج" کے پاس پیش ہوتا جو یہ دیکھتا تھا کہ آیا امیدوار فوج میں رکھنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر وہ آزاد، بالغ، مسلمان، تندرست، صحیح الحواس اور دلیر نہوتا تو فوجی خدمت انجام دینے کے ناقابل سمجھا جاتا اور جو وہ تمام شرطوں میں پورا اترتا تو اس کا نام معہ نسب اور حلیہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا۔ نام لکھتے وقت اُس شخص کے تمام امتیازی اوصاف و علامات کو بڑی احتیاط سے قلمبند کرتے تاکہ اگر ایک نام کے کئی آدمی ہوں تو گڑبڑ نہ پڑے۔

دفتر میں سپاہیوں کی ترتیب کے وقت ہمیشہ اُنہیں قواعد کا لحاظ ہوتا تھا جن کو عمر بن الخطاب نے سابقہ اور نسب کے اعتبار سے قرار دیا تھا، اولاً فوج کی ترتیب جنسوں اور قبیلوں سے شروع ہوتی جبوقت ہر ایک قبیلہ اور جنس دوسری سے متمیز ہو جاتی، تو وہ دو حال سے خالی نہ ہوتی یعنے عربی یا عجمی پس اگر سپاہی عربی النسل

ہوتے تو اُنکے قبیلوں کی ترتیب باعتبار نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مندوں کے ہوتی، ترتیب کی ابتدا خاندانِ نبوی کی اصل سے کیجاتی اس کے بعد اُس کی شاخوں کی نوبت آتی، مثلاً اہل عرب کی دو قسمیں ہیں عدنانی اور قحطانی عدنانی عرب قحطانیوں پر مقدم کئے جاتے تھے کیونکہ نبوت انہی کے گھرانے میں تھی، عدنان مجموعہ ہے ربیعہ اور مضر کا ان میں سے مضر کو فوقیت ہے اس لئے کہ نبوت اُن میں تھی، مضر کی شاخیں ہیں قریش اور قریش کے علاوہ دوسرے گئے ہیں، اُنمیں قریش کو فضیلت دی جاتی تھی کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اُسی خاندان سے تھے قریش کے گھرانے ہیں بنو ہاشم اور بنو اُمیہ وغیرہ ہیں۔ مگر تقدم بنو ہاشم کو تھا اسوجہ سے کہ نبوت انکے گھرانے میں تھی گویا کہ بنو ہاشم اس ترتیب کے قطب اور مرکز تھے، اور ان کے بعد وہ لوگ تھے جو ان کے ساتھ نسبی قرابت میں درجہ بدرجہ زیادہ نزدیک ہوتے، اور اگر فوجی سپاہی عجمی ہوتے اور کسی نسب پر مجتمع نہ ہو سکتے تھے تو ان کو جنس پر مجتمع کیا جاتا جیسے ترکی ہندی یا ملک اور سکونت پر مثلاً خراسانی فراعنہ اور مغربی پھر اگر ان عجمی لوگوں کو کسی قسم کا سابقہ حاصل ہوتا تو دیوان میں اس کے مطابق ترتیب پاتے تھے، ورنہ قرب حاکم کے اعتبار سے اور اگر اس معاملہ میں بھی برابر ہوتے تو سبقت کا خیال کیا جاتا کہ کس فرقہ نے پہلے اس حاکم کی اطاعت اختیار کی ہے۔ فوجی دفتر کی کئی شاخیں تھیں کوئی مراسلت (پیغام رسانی) کیلئے کوئی عطا (تقسیم تنخواہ اور انعامات) کی غرض سے اور کوئی شاخ فوجی اور جنگی مصارف یا دیگر مختلف ضروریات وقت کے لئے

فوج کی تنخواہیں

فوجی عطیات سے ان کے وظیفے یا تنخواہیں مراد ہیں جو سال کے اندر مقررہ اوقات میں ان کو ملتی تھیں عطیات نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں غیر محدود تھے اُن دنوں میں جس قدر مالِ غنیمت آتا اس کا ایک خمس ⅕ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے علیحدہ نکالنے کے بعد باقی چار حصے تمام صحابہ میں بلا کسی امتیاز و تفریق کے بانٹ دیئے جاتے ابو بکر رضؓ نے بھی اسی دستور کی پابندی رکھی حضرت عمر رضؓ کا دور شروع ہوا تو انہوں نے دفتر ترتیب دیا اور لوگوں کے وظائف میں باعتبار نسب اور سابقہ کے تمیز کی، اس لحاظ سے ان کی ترتیب طبقوں کے اعتبار سے رکھی اور ہر ایک کا راتب بلحاظ قرابت نبوی یا سابق الاسلام ہونے کی حیثیت سے مقرر کیا یا اس کے علاوہ اور حیثیتوں سے جیسا کہ فہرست ذیل سے واضح ہوگا۔ یہاں پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس جدول میں وظائف

کی جو مقدار درج کیجاتی ہے، یہ صدر اسلام میں سالانہ وظائف ہوتے تھے۔

ہر ایک ایسے مہاجر اور انصاری کیلئے جنہوں نے بدر کبریٰ کے جنگ میں شمولیت کا شرف حاصل کیا ہو ... ۵۰۰۰ درم

ہر ایک ایسے مہاجر اور انصاری کیواسطے جو اس میں شریک نہ ہوسکا —— ۴۰۰۰

ازواج نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) —— ۱۲۰۰۰

عباس رض بن عبد المطلب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا —— ۱۲۰۰۰

حسن رض اور حسین رض —— ۵۰۰۰

عبداللہ بن عمر بن الخطاب رض (خلیفہ کے بیٹے) —— ۳۰۰۰

مہاجرین اور انصار کی ہر ایک لڑکی کو —— ۴۰۰۰

ہر ایک اہل مکہ کو —— ۸۰۰

ہر ایک مسلمان کیلئے جو مختلف طبقوں میں سے ہوں —— ۳۰۰ - ۵۰۰

مہاجرین اور انصار کی عورتیں —— ۲۰۰ - ۶۰۰

بعض روایتوں کے خفیف اختلاف کیساتھ عمر رض کے زمانہ میں فوج کی تنخواہیں یا مسلمانوں کے وظیفے حسب مندرجہ بالا ہی تھے۔ اگر ان وظیفوں کی مقدار پر غور اور پھر ان کا آجکل کے وظائف سے مقابلہ کریں تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ اگر ہم درہم کو ایک فرانک کے مساوی سمجھیں جو قیمت میں قریباً اتنا ہی ہوتا ہے تو اسلام کے بڑے سے بڑے لوگوں کا وظیفہ بھی پانچہزار فرانک سے زیادہ نہیں قرار پاتا جو قریباً دوسو گنی سالانہ ہوتا ہے اور اگر ہم مسلمانوں کو سپاہی مان لیں تو مہاجرین اور انصار ان کے افسر ہوئے جن میں خود عمر رض بھی تھے، اور جن کو ہمنے عام مسلمان لکھا ہے وہ نفر خیال کئے جاسکیں گے خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں اور انکے وظیفے ان لوگوں (مہاجرین و انصار) سے کہیں کمتر تھے، کیونکہ وہ تین سو درہم سے پانچسو درہم تک قبلیہ جہاد اور فضیلت اسلامی کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے تھے، تو گویا عمر بن الخطاب رض کے عہد میں اسلامی فوج کے افسروں کی تنخواہیں چار ہزار سے پانچہزار درہم سالانہ تک اور سپاہیوں کی تین سو درہم سے پانچسو درہم سالانہ تک ہوتی تھیں، یہ تنخواہیں ان نقد وظائف کے علاوہ تھیں جو ان کی بیوی بچوں کو ملا کرتے تھے اور اس غلہ گندم کے علاوہ تھیں جو ہر ایک شخص کو دو جریب ماہوار کے حساب سے ملا کرتا تھا۔ ایک جریب ۳۶۰۰ گز مربع ہوتی تھی اور اس سے یہ مراد تھی کہ اس رقبہ میں جتنا غلہ پیدا ہو وہ سب ان کو ملتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اوائل اسلام میں چھوٹے چھوٹے فوجی

سپاہیوں کی تنخواہیں بھی اس زمانہ کے سپاہیوں کی تنخواہوں سے زیادہ ہوتی تھیں مگر ان کے افسروں
کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں فوجی وظائف کی مقدار اسیقدر رہتی چلی گئی مگر جبکہ بنوامیہ نے حکومت
کی طمع کی اور معاویہؓ کو اہل عرب سے کمک لینے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے جن باتوں کی عربی قبائل
سے کمک لی اُن میں ایک بڑی چیز مال بھی تھی اور اس سے انہوں نے فوج کے وظائف بڑھا دیئے
ان کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی تھے جنپر وہ سالانہ ساٹھ ملین درم صرف کرتے تھے اور یہ تعداد اس خرچ
کے مقابلہ میں جو عمرؓ اپنی فوج پر کیا کرتے تھے دُگنی سے بھی زیادہ تھی۔

جن قبائل نے معاویہ کی دستگیری کی اور اُن کیطرف سے جنگ کرکے اُن کی دعوت کو مدد پہنچائی
اُنمیں قبائل یمن کا قدم سب سے آگے تھا اور انہوں نے محض لطمع مال و زر ایسا کیا کیونکہ صرف جہاد کی غرض
سے لڑنیکا شوق اور ولولہ خلفائے راشدین ہی کے زمانہ تک تھا اور نبوت کی دہشت زائل ہوجانیسے اب وہ
لوگوں کے دلوں میں کچھہ باقی نہ رہا تھا۔ معاویہؓ نے یمن کے لوگوں کا ایک مستقل دستہ اپنی فوج میں
بھرتی کیا جنکی تعداد دو ہزار سوار تھی اُن کے وظیفے دوگنے مقرر کئے اور ان کو تمام فوج سے الگ اور سب سے
ممتاز بنا دیا تھا اُن کے امیروں سے اپنے اہم معاملات میں رائے لیتے اور اپنا مقرب بنائے رکھتے جس سے
اہل یمن کا اس قدر زور ہوگیا اور اُنکی عظمت واقتدار کو اتنی ترقی حاصل ہوئی کہ آخرکار وہ بنوامیہ کی
حکومت کو اپنا زیر بار احسان سمجھنے اور جا بجا اس کے چرچے کرنے لگے کہ اگر ہم چاہیں تو بنومضر کو جنمیں
بنوامیہ بھی داخل تھے ملک شام سے بالکل نکال باہر کریں۔ اسوجہ سے معاویہ ان لوگوں کو اپنا مقرب منظورِ نظر
بنا کر نادم ہوئے اور اس قدر امتیاز دے کر بڑے پچھتائے اور اُن کا غرور توڑنے کیلئے ایک اور فرقہ کو جسکا لقب
"قیسیہ" تھا اپنا مقرب بنالیا اور ان کو بھی ویسے ہی عطیات دینے لگے جیسے یمنیہ کو ملتے تھے اسکے بعد سے
انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بحری جنگوں میں یمنیہ فرقے کو اور خشکی میں "قیسیہ" گروہ کو مصروف پیکار
رکھتے۔ یمن والوں کو یہ امر شاق گذرا۔ کیونکہ "قیسیہ" فرقے کے لوگ مضر کے خاندان سے تھے اور انہوں نے
معاویہؓ پر اپنی خفگی اسباب میں ظاہر کی جن کے سبب سے معاویہؓ نے دونوں کو اکٹھا کر دیا اور انکے واسطے
دونوں قسموں کی لڑائیوں میں شرکت کا دروازہ کھولدیا۔

معاویہؓ صرف فوج کے رضامند رکھنے ہی میں مال خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ساتھ مخالفت اور عداوت

دکھنے والوں کی شورشیں کم کرنے اور اپنے موافق لوگوں کی جماعتیں تیار کرتے رہنے میں بھی دل کھول کر روپیہ لگاتے تھے چنانچہ اکثر اوقات وہ اپنے عاملوں کو ایسے لوگوں کے عطیات میں اضافہ کی ہدایتیں کرتے رہتے جن کو سمجھتے کہ وہ علیؓ سے کوئی غرض رکھتے ہیں اور انکے عمال ان اغراض کو سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے نفاذ احکام نہیں کرتے تھے اس قسم کی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اہل کوفہ کو علیؓ کے ساتھ بہت الفت تھی لہذا معاویہ نے وہاں کے عامل نعمان بن بشیر کو اس بات کا حکم بھیجا کہ کوفہ کے باشندوں کے عطیات میں دس دینار کا اضافہ کردے۔ نعمان نے گو اس حکم کے ماننے سے انکار کیا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہوا

یزید مروان اور عبدالملک کے زمانہ میں بھی عطیات کی یہی حالت برابر قائم رہی عبدالملک کو چونکہ ایک اور سخت دقت یہ بھی درپیش تھی کہ اس کے عہد میں خلافت کے بہت سے دعویدار پیدا ہو گئے تھے اسوجہ سے وہ اپنے دعویداروں کی دلجوئی کرتے رہنے کی غرض سے اور بھی زیادہ انعام واکرام دیتا رہتا تھا حجاج نے عبدالملک کے حکم سے "رتبیل" کی جانب جو فوج روانہ کی تھی اس کی تعداد چالیس ہزار تھی اس لشکر کی روانگی کے مصارف دو ملین درم تک پہنچ گئے تھے، یہ اخراجات ان کے عطیات اور ان رقموں کے علاوہ تھے جو اس فوج کے افسروں کو بطور انعام دیگئی تھیں ولید بن یزید نے متولی خلافت ہو کر اپنے خلیفہ ہونیکے دن فوج کے عطیات میں دس درم کا اور بھی اضافہ کر دیا ممکن ہے کہ اسنے اپنی کمزوری حکومت اور عیش پرستی کی خرابی کو دبا کر فوج کے رضامند کرنیکی نیت سے ایسا کیا ہو دولت بنو امیہ کے آخر زمانہ میں فوج کے وظیفے گھٹ گئے یہانتک کہ آخری خلیفہ کے عہد میں صرف پانچسو درم سالانہ فی سپاہی باقی رہگئے تھے۔

بنو عباس کو خلافت حاصل ہوئی تو سفاح نے سپاہی کی تنخواہ اسی درم ماہوار (۹۶۰ سالانہ) کر دی گویا اسنے فوج کا مشاہرہ الٹ کر پھر وہی مقرر کر دیا جو بنی امیہ کے ابتدائی دور خلافت میں رہچکا تھا سوار کو اس سے دوگنا وظیفہ ملتا تھا تاکہ نصف تنخواہ وہ اپنے گھوڑے کے مصارف میں اٹھائے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت عباسیہ کی ترقی کیساتھ فوج کے وظائف میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس وہ روز بروز کم ہوتے گئے چنانچہ عہد مامون الرشید میں پیدل کی ماہوار تنخواہ صرف بیس درم اور سوار کی چالیس درہم رہی ۲۰۱ھ میں عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کا لشکر چالیس ہزار سپاہیوں کا تھا اور اسنے سوار کی تنخواہ چالیس درم ماہوار کر رکھی تھی اور پیدل کی بیس درم اسبات پر اتنا اور بھی اضافہ کر دینا چاہیے کہ اس زمانہ میں بہ نسبت ابتدائے اسلام کے سونے کی قیمت بڑھ گئی تھی اور جو دینار عمرؓ کے عہد میں

دس درم کے مساوی ہوتا تھا وہ مامون کے زمانہ میں ۱۵ درم کے مساوی ہوگیا تھا۔

بیان بالا سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ فوج کی تنخواہیں بنو امیہ کے عہد خلافت میں خلفائے راشدین کے زمانہ کی نسبت سے بڑھ کر پھر بنو عباس کی حکومت میں کم ہوگئیں اس کا سبب یہ تھا کہ بنی امیہ نے عربی قبیلوں کو اپنی خدمت کی رغبت دلانے اور اپنی حکومت کو تائید پہنچانے کی خواہش سے فوج کے عطیات بڑھا دیئے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے لیکن بنو عباس کے دور میں اہل عرب اسلامی ملکوں میں ہر چہار طرف منتشر ہوگئے اور اہل عجم سے مل جل گئے تھے۔ عباسی خلفا نے اہل عجم کی تعداد اپنی فوجوں میں بہت بڑھا دی تھی جسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں لوگوں نے ان کی قیام حکومت میں پوری پوری مدد دی تھی ان وجوہ سے عباسی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا تھا کہ وہ ان دو گروہوں میں سے جس سے چاہے فوجی خدمت لے۔ اہل عجم تھوڑی تنخواہ کو قبول کرلیتے تھے اور باوجود اسکے پھر بھی وہ تنخواہیں اُن وظائف سے کہیں زیادہ تھیں جو روم والے اپنے سپاہیوں کو دیا کرتے تھے ابن خرداذبہ ناقل ہے کہ رومیوں کی ہاں سپاہیوں کی تنخواہ ۱۸ سے ۱۲ دینار سالانہ تک ہوا کرتی تھی اور اسکے ساتھ ہی وہ لوگ تیسرے چوتھے برس صرف ایکبار اپنے وظیفے حاصل کرسکتے تھے بخلاف اس کے عربی فوجوں کی تنخواہیں سالانہ ماہوار یا سہ ماہی یا ششماہی جیسا دستور ہوتا ٹھیک وقت پر ملا کرتی تھیں لیکن عباسی حکومت کے آخری دور میں یہ بات نہ رہی تھی یا تنخواہوں کے ملنے میں دیر ہوتی اور کبھی کبھی مہینے چڑھ جاتے اور اس کی وجہ سے جو شخص فوج کو راضی کرنے کی قدرت پاتا وہی خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ جیسا کہ انحطاط اور کمزوری کے ایام میں تمام حکومتوں کا انتظام بگڑ جایا کرتا ہے

سلجوقی خاندان کی حکومت تک فوج کی تنخواہیں برابر نقد ملا کرتی تھیں لیکن جس وقت اس خاندان کی حکومت کو عروج ہوا تو بجائے نقد تنخواہ کے سپاہیوں کو جاگیریں ملنے لگیں فوج والوں کو جاگیریں دینے کا طریقہ سب سے پہلے نظام الملک طوسی نے نکالا یہ نامور شخص جس نے ۴۸۵ھ میں وفات پائی ہے آل سلجوق کا وزیر اور بڑا فاضل شخص تھا جس نے سلجوقی حکومت میں بحالت وزارت بہت سی مفید صلاحیں کیں یہی سب سے پہلا مسلمان تھا جس نے بغداد میں مدرسوں کی بنیاد رکھی چنانچہ شہر کا مشہور مدرسہ نظامیہ اسی کے نام سے مشہور ہے یہ نامی گرامی شخص الپ ارسلان کا وزیر تھا اور پھر اس کے نامور بیٹے ملک شاہ کا بھی وزیر رہا اسکی قابلیت اور مدبرانہ پالیسی کا اسقدر گہرا اثر پڑا تھا کہ حکومت کے تمام کاروبار اسی کے قابو میں ہوگئے تھے سلطان کو صرف تخت نشینی اور سیر و شکار سے سروکار رہ گیا تھا۔ نظام الملک نے بیس برس تک اسی شان و شکوہ کیساتھ وزارت کے

نام سے حکمرانی کی وہ ایک دانشمند اور نیکدل خیر خواہ ملک و ملت تھا اُسنے خیال کیا کہ سلجوقی حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے ایسا نہو اسپر زوال آکر بہت جلد یہ ملک قابو سے نکل جائے لہذا اُسنے یہ ضروری سمجھا کہ جاگیروں کے طریق سے حفظ مملکت کا سلسلہ قائم کرے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا کہ ملک کو مختلف چھوٹی بڑی جاگیروں میں تقسیم کر کے اہل فوج کے حوالہ کر دیا نظام الملک کا یہ خیال واقعی مناسب تھا کہ زمینوں کو جاگیرداروں کے سپرد کرنا ان کی سرسبزی اور زرخیزی کی ضمانت ہے کیونکہ وہ جاگیردار اپنے نفع کی خاطر اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور ملک کو اسطرح سرسبزی و خوشحالی نصیب ہو گی بخلاف اسکے اگر صرف ایک دفتر (شاہی دفتر) ملک کے تمام معاملات اور کاروبار کا نگران رہا تو خرابیاں پھیلتی جائینگی اور سلطنت میں خلل واقع ہو گا اس خیال کی بنا پر نظام الملک نے جاگیروں کا انتظام جاری کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مملکت آباد ہو گئی اور ملکی پیداوار نہایت فراوانی سے ہونے لگی چنانچہ گذشتہ صدی کے آغاز تک جسقدر حکمران اور سلاطین نظام الملک کے بعد گزرے ہیں سبھوں نے اس بارہ میں اسی کی پیروی کی اور اپنے ملکوں میں بھی جاگیروں کا انتظام رکھا اس کا مفصل حال جاگیروں کے بیان میں آگے چل کر بیان کیا جاوے گا۔

فوج کی تعداد

ہم نے یہ پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ صدر اسلام میں تمام مسلمان فوجی خدمت کے انجام دینے والے تھے اسلئے اس زمانہ میں جسقدر اُنکی تعداد تھی بالکل وہی تعداد اسلامی فوج کی تھی پہلے ہجری سال میں اسلامی فوج کی تعداد چند دہائیوں سے زائد نہ تھی جو مدینہ منورہ میں رہتی تھی، بعد ازاں دیگر قبائل عرب کے داخل اسلام ہونے سے اُن کی تعداد بڑھنے لگی ایک صحیح حدیث بخاری میں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "جن لوگوں نے کلمہ اسلام اپنی زبان سے ادا کیا ہے اُنکی تعداد لکھی جائے" تو ہمنے ڈیڑھ ہزار نام قلمبند کر کے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کئے۔

غزوہ تبوک میں جو سب سے آخری غزوہ تھا اور ہجرت سے نویں برس واقع ہوا مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جن کے ساتھ دس ہزار گھوڑے تھے۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آخری وقت میں اسلامی فوج کی اتنی تعداد تھی اسکے بعد ابی بکر اور عمر کے عہد میں انکی تعداد زیادہ ہوتے ہوتے ڈیڑھ

لاکھ سے بڑھ گئی تھی اور خلفائے راشدین کے آخری عہد میں اس تعداد کو دو چند ہو جانا نصیب ہوا تھا۔

بنو امیہ کے ابتدائی دور میں بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے لوگوں میں سے فقط مردوں ہی کی تعداد ...۱۴۰ ہو گئی تھی جنمیں ۸۰ ہزار بصرہ میں اور ۶۰ ہزار کوفہ میں تھے ان آدمیوں کے ساتھ جو متعلقین تھے اُن کی تعداد ...۲۰۰ تھی جنمیں عورتیں اور بچے سب شامل تھے، ملک مصر میں اہل عیال کے علاوہ چالیس ہزار مرد تھے اور ملک شام کی فوج بھی اتنی ہی تھی اس کے علاوہ فارس وغیرہ کے ملکوں میں جو سپاہ تھی اس کا شمار علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

صدر اسلام میں خلفاء کو مسلمانوں کی مردم شماری کرنے کی جانب بہت توجہ رہتی تھی ان کا یہ طریقہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اقتدا کرنے کے خیال سے تھا اُنہوں نے عربی قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ پر ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا جو ہر روز صبح کو اُٹھ کر تمام ایسی جگہوں میں گھومتا پھرتا جہاں لوگ جمع ہو کر باہم باتیں چیتیں کیا کرتے اور سبھوں سے دریافت کرتا جاتا۔ کیا آج رات کو تمہارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ اور کیا آج تمہارے ہاں کوئی مہمان آیا ہے؟ لوگ بتا دیتے کہ ہاں فلاں فلاں شخص کے لڑکی یا لڑکا پیدا ہوا ہے جن کے نام وہ لکھ لیتا اور یہ بھی بتا دیتے کہ آج ہمارے قبیلے میں فلاں شخص اپنے بال بچوں سمیت آکر ٹھیرا ہے اس نو وارد کا اور اس کے گھر والوں کے نام بھی لکھ لئے جاتے جب وقت وہ شخص اس پوچھ گچھ سے فراغت پاتا تو دفتر میں آکر ان سب نو زائیدہ بچوں اور آنیوالوں کے نام درج رجسٹر کر لیتا تھا۔

اس کے علاوہ پھر ولائیت میں کچھ عرصہ بعد علیحدہ علیحدہ بھی مردم شماری ہوا کرتی تھی، مثال کے طور پر ایک ملک مصر کو لیجئے وہاں سب سے پہلے جو رجسٹر مردم شماری کے تیار ہوئے وہ عمرو بن العاص نے کرائے تھے پھر عبدالعزیز بن مروان نے اس کام کی تجدید کی اور نئی مردم شماری کے بعد رجسٹر از سر نو ترتیب دلائے عبدالعزیز بن مروان نے یہ کام اپنی امارت مصر کے زمانہ میں ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک کے عرصہ میں انجام دیا تھا اسکے بعد ۹۰ھ سے ۹۶ھ تک قرۃ بن شریک نے اور ۱۰۱ھ میں بشر بن صفوان نے اسے تازہ کیا سب سے آخری مردم شماری جسکے ذریعے سے تمام ملکوں اور شہروں کے عربی النسل لوگوں کی تعداد جانچی گئی ۱۰۵ھ سے ۱۲۷ھ تک ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ہوئی تھی مگر افسوس کہ ان مردم شماریوں کی روئداد ہم کو نہیں ملی کیونکہ وہ بھی بنو امیہ کے آثار کے اندر ضائع ہو گئیں بنو عباس والے خلافت ہوئے تو انہوں نے اہل عرب کی جانب توجہ کرنی لاحاصل سمجھی بلکہ ان کی بجائے اپنی تمام توجہ فارسیوں اور ترکوں وغیرہ عجمی قوموں کے

گروہ تیار کرلئے اور ان کو اپنے کام کا بناتے رہنے میں صرف کی جس کی کیفیت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں
خلاصہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں ۲۱۸ھ معتصم باللہ کی بیعت ہوگئی تو اس نے اپنے تمام عاملوں کے نام
جو ممالک محروسہ میں مقرر تھے یہ فرمان بھیجدیا کہ عربوں کے نام دفتروں کے اندر باقی رہے ہیں ان کو
نکالدیا جائے اور انکے وظیفے بند ہوجائیں اہل عرب کو یہ بات نہایت شاق گذری انہوں نے بہت
کچھ شور وغل بپا کیا۔ لڑے بغاوت کی۔ لیکن عبث۔ اسیوقت سے عربی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور حکومت
اسلامی کی سپاہ عجمی قوموں اور غلاموں سے مامور ہوگئی۔ یہی باعث تھا کہ جبوقت معتصم کا انتقال ہوا اور اسکے
بعد واثق باللہ کو خلافت پہنچی تو بنی خزاعہ کے مشہور شاعر دعبل نے جو اسوقت مقام صیمرہ میں تھا اور
وہاں اسکو معتصم کے مرنے اور واثق کے تخت نشین ہونے کی خبر لگی اُسنے فی البدیہہ دو بیتیں کہیں،

الحمد لله لا صبر ولا جلد
ولا عزاء اذا اهل البلاء رقدوا
خليفة مات لم يحزن له احد
وآخر قام لم يفرح به احد

(ترجمہ) خدا کا شکر ہے صبر و شکیب کا مرتفع نہیں
اور ماتم پرسی کی اسوقت کوئی حاجت نہیں ہوتی۔
جبکہ اہل بلا سو رہیں (مرجائیں) ایک خلیفہ مرگیا تو
کسی نے اسکا غم نہ کیا اور دوسرا قائم ہوا تو کسیکو اسکی خوشی نہ ہوئی۔

بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں میں فوج کی کیا تعداد رہی؟ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا پتہ نہیں چل
سکتا۔ مگر ہم اس تعداد پر غور کرکے جو خلفاء جنگ کیوقت میدان میں لاتے تھے یہ استدلال کرسکتے ہیں
کہ بیشک انکے یہاں کی فوج بہت زیادہ تھی، چنانچہ یزید بن مہلب نے صرف جرجان اور طبرستان پر حملہ کرنے کیلئے
۱۲۰۰۰۰ ایسی سپاہ روانہ کی تھی جن کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں اور غلاموں اور (لطوع والنفیر) خوشی
خواں لڑنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی رشید نے ہرقلہ پر ۱۳۵۰۰۰ تنخواہ دار فوج کیساتھ حملہ کیا تھا غلام
اور متطوعہ (فالو) اس سے علاوہ تھے۔ محمد بن طغج اخشیدی بانی حکومت کی فوج جبتک مصر میں تھا
سے ۳۳۴ھ تک .... ۴۰ سپاہی رہے اور آٹھ ہزار غلام تھے جنہیں سے باری باری ہر رات میں دو
ہزار اسکا پہرہ دینے پر مقرر رہتے ابن خلدون نے روایت کی ہے کہ معتصم باللہ عموریہ پر ۹۰۰۰۰۰ سپاہ
لے کر اترا تھا، اسمیں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہم جس وقت تمام ملک کے نزدیک اور دور
حصوں کی محافظت جنگی تعداد کا لحاظ کریں تو یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی کاروباری لوگ غلام اور
خادم بھی اسکے علاوہ شمار کرنی چاہیے کیونکہ خلفائے بنی عباس میں مامون الرشید کے ایسے صرف مخصوص لوگوں کا شمار

۳۳ ہزار تک پہنچا تھا جو محض عباسی خاندان کے لوگ تھے۔

فوجی رتبے اور انکی قسمیں

چونکہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی اس لیے ان کے ہاں فوجی رتبے اور عہدے بھی مقرر نہ تھے لیکن وہ قبیلہ کے اوپر ایک امیر مقرر کر دیا کرتے تھے اس امیر کو کسی غزوہ وغیرہ میں کوئی فوجی جماعت بھیجنے کی حاجت پڑتی تو وہ اس جماعت پر ایک شخص کو سردار مقرر کر کے روانہ کیا کرتا اس سردار کو "منکب" کہتے تھے اور ہر ایک منکب کے ماتحت پانچ "عریف" ہوتے ایک عریف بہت سے نفروں پر افسر ہوا کرتا تھا۔

ابتدائے اسلام میں عرب کے لوگ برابر اسی اصول پر قائم رہے جو انکے ہاں عہد جاہلیت سے رائج تھا۔ اسی لحاظ سے انہوں نے فوجی سپاہیوں کو بہت سے عریفوں پر تقسیم کر دیا تھا ہر عریف کے ماتحت دس سپاہی تھے اور فوج کی کمان افسری ایسے لوگوں کو دی تھی جو سابق الاسلام تھے۔ چنانچہ اسلامی فتوحات کے زمانہ میں انکے فوجی نظام کی یہی صورت تھی اسکے بعد عریف لوگوں کی تعداد سات کر دی گئی اور ہر عریف کے ماتحت تین چالیس سپاہی رہنے لگے کسی عریف کے ماتحت صرف بیس ہزار جوان بھی ہوتے تھے اسکی وجہ سابقہ وغیرہ کے سبب سے فوجی طبقوں کا لحاظ رکھنا تھی۔ ان عریف لوگوں پر جو افسر ہوتے انکو "امراء اسباع" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا انکے ذمہ یہ خدمت بھی تھی کہ فوج کی تنخواہیں صدر دفتر سے برامد کرا کے عریف لوگوں کو بانٹ دیتے اور عریف لوگ اپنے ماتحت سپاہیوں میں تقسیم کرتے تھے۔

بنی امیہ کے عہد میں فوجی رتبوں کے اندر بہت کم تغیر و تبدل واقع ہوا۔ مگر عباسی حکومت کے دور میں اس کی صورت بدل کر یوں ہو گئی ہر دس جوانوں پر ایک "عریف"۔ ہر پچاس پر ایک "خلیفہ"۔ اور ہر سو پر ایک "قائد" (جنرل) اسکے بعد ترتیب کی صورت پھر بدل گئی اور یہ شکل قائم ہوئی۔ دس جوانوں پر ایک عریف۔ دس عریفوں (یا سو جوانوں) پر ایک "نقیب"۔ اور ہر دس نقیبوں (یا ۱۰۰۰) جوانوں پر ایک قائد (جنرل) اور ہر دس قائدوں پر ایک امیر (کمانڈر انچیف) نیز دیگر مختلف حکومتوں کے حالات پر غور کی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام میں تغیر و تبدل کو جگہ ملتی رہی تھی۔

اگرچہ یہ امر ضروری ہے کہ ہر ایک رتبہ کے واسطے ایک علامت اس قسم کی مقرر ہو جسکی وجہ سے وہ عہدہ دار دوسرے عہدہ والے سے متمائز ہو سکے، جیسا کہ آجکل فوجی افسروں میں دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایکدوسرے سے متمائز اور عام فوجی سپاہیوں سے نمایاں ہوتے ہیں لیکن افسوس ہمیں اس امر کے متعلق کوئی صریح چیز اسلامی فوجوں

میں نہیں ملی البتہ جو کچھ ہم نے طراز کے بیان میں لکھدیا ہے اس سے کوئی سراغ چلجائے تو ممکن ہے
گھوڑوں کا داغ دیا جانا بھی اسی قبیل سے تھا تاکہ حکومت کے گھوڑے اور گھوڑوں سے ممتاز رہیں اس کام کے
لئے ہر ایک بادشاہت کا ایک خاص نشان تھا بنی امیہ کے عہد میں فوجی اور شاہی گھوڑوں کی علامت
"عدہ" کا لفظ تھا جسے گرم کر کے گھوڑوں پر داغ لگاتے تھے اہل عرب ایام جاہلیت میں اپنے اونٹوں
کے ساتھ بھی یہی کرتے تھے انکے ہاں ہر ایک قبیلے کا ایک جداگانہ "میسم" (ٹھپہ) تھا جس سے
اُس قبیلہ کے اونٹ دوسرے گھرانے کے اونٹوں سے پہچانے جاتے تھے یہ بات کچھ اسی زمانہ کے
ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ آجکل کی مہذب حکومتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔

فوجی معائنہ اسلام سے پہلے جتنی متمدن حکومتیں گذری ہیں ان میں بھی فوجی معائنہ یا ریویو کا دستور قدیم
سے چلا آیا ہے۔ چنانچہ سکندر اعظم خود بذات خاص فوج کا معائنہ کیا کرتا اور ان کی اور انکے ہتھیاروں
کی حالت دیکھ بھال رکھتا تھا اور گھوڑوں کا بھی جائزہ لیتا رہتا تھا۔ جس زمانہ میں اسلام کا ظہور ہوا ہے
اُن دنوں اہل فارس کا دستور تھا کہ سال کے اندر مقررہ وقتوں میں فوج کا معائنہ کیا کرتے تھے اس
معاملہ میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے اعلےٰ طبقہ کا سوار گھوڑے پر چڑھ کر اعلےٰ حکام اور بادشاہ کے
سامنے گذرتا تھا اس سوار کے ہمراہ پہلو بہ پہلو ایک غلام ہوتا تھا دہ زرہ۔ خود۔ دستانے۔ چار آئینہ
جوشن پہنے ہوتا۔ گھوڑے پر آہنی یا کھڑی ہوتی جس کو برگستوان کہتے تھے۔ ڈھال۔ نیزہ۔ تلوار
گرز۔ خنجر۔ رسی۔ توبرہ۔ آہنی چھریاں۔ باگ ڈوریں۔ تاگوں کی تھیلی۔ سوتالی قینچی۔ ہتھوڑی۔ کاز
لمبا سوا۔ چھوٹی سویاں۔ تاگے۔ زناد۔ طرطور۔ باراں کوٹ دو چلہ چڑھی ہوئی کمانیں معہ دو فاضل چلوں
کے جو ٹوٹنے پھوٹنے پر بوقت ضرورت کام آسکیں دو تیروں کے ترکش ایک خود سوار کے پاس
اور دوسرا اسکے غلام کے پاس غرض سوار اس تمام سامان سے لیس ہوتا تھا۔

تمدن اہل عرب کا آغاز ہوا اور انہوں نے فوجی حالت کو درست کیا تو اس معاملہ میں انہوں نے بھی
اہل فارس کی ہی پیروی کی لیکن اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ عرب والوں نے شہروں کے بسانے اور فوجوں
کے باقاعدہ مرتب کرنے سے پہلے بھی فوجی معائنہ کا دستور اختیار کر رکھا تھا کیونکہ خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم)
بنفس نفیس اپنے اصحاب کا جنگ کیوقت معائنہ فرماتے تھے چنانچہ کتب سیر میں آیا ہے کہ نبی
(صلی اللہ علیہ وسلم) نے بدر کبریٰ کے دن ۲ھ میں انکا معائنہ کیا تھا اور انکو کئی صفوں میں کھڑا کر کے صفوں کو

درست اور سیدھی بنانیکی کوشش کی تھی، جسوقت آپ صفوں کو درست فرما رہے تھے آپکے ہاتھ میں ایک سادہ تیر تھا آپ سواد نام ایک شخص کے پاس ہوکر گذرے جو صف کی سیدھ سے ہٹا ہوا کھڑا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تیر کو جو آپکے ہاتھوں میں تھا اس شخص کے پیٹ میں چبھو کر فرمایا "استو یا سواد بن غزیۃ" (اے غزیہ کے بیٹے سواد سیدھا اور برابر ہوجا) آخرکار آپ صفوف کی ترتیب اور درستی سے فارغ ہوکر اس خیمہ میں واپس تشریف لے آئے جو صحابہؓ نے آپکے لئے وہیں میدان جنگ میں نصب کر رکھا تھا۔

خلفائے راشدین بھی اسی طرز پر فوج کا جائزہ لیتے رہے اور اُنکے بعد بنو امیہ نے بھی اس وضع کو قائم رکھا حجاج بن یوسف فوج کا جائزہ لیتے وقت ایک ایک شخص سے دریافت کیا کرتا تھا کہ تو کون ہے اور تیرا قبیلہ کونسا ہے اور ہتھیاروں کی حالت بہت غور کیساتھ دیکھنے کے علاوہ سپاہی کی کیفیت پر بھی پوری طرح نظر کیا کرتا تھا۔

عباسی عہد حکومت میں فوج کا جائزہ اہل فارس کی وضع پر لیا جاتا تھا جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بنو عباس نے اس معاملہ میں فارسیوں کی شاگردی کی تھی اُنکے ہاں یہ دستور تھا کہ خلیفہ یا خلیفہ کا وزیر فوج کے معائنہ کے لئے ایک منظر عام میں جاکر بیٹھتا اکثر اوقات خود خلیفہ جلوس فرما ہوتا اور اسوقت وہ خود اور زرہ پہنے ہوا کرتا گویا کہ آمادہ پیکار ہے خلیفہ کے جلوس فرما چکنے کے بعد منادی "افسروں کو نام بنام پکارتا اور وہ سامنے سے ہوکر گزرتے جاتے پھر جب خلیفہ اُن کے گھوڑوں اور ہتھیاروں کا جائزہ لے کر سامان سے لیس پاتا تو انکے وظیفے اور انعام عطا کئے جانے کا حکم صادر کردیتا یہ وظیفے جائزہ کے دن کیلئے مقرر تھے کبھی کبھی بلکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اعلٰے افسر فوج اپنا انعام ماتحتوں میں سے کسی کو بخش دیتا تھا اس کارروائی کی مثال خلیفہ معتمد باللہ عباسی کے عہد ۲۷۱ھ میں (عمرو بن اللیث) کا طرز عمل ہے عمرو بن اللیث خلیفہ کے حضور میں نہایت تقرب اور رسوخ چڑھا ہوا تھا۔ قوانین سلطنت میں دخیل ہوکر فوجی صیغہ کا منتظم اور افسر مقرر ہوگیا تھا اُسنے یہ قاعدہ جاری کر رکھا تھا کہ ہر سہ ماہی میں ایکبار تمام فوجی افسروں اور سپاہیوں کو علی قدر مراتب انعامات تقسیم کیا کرتا اور اس تقسیم انعام کے موقعہ پر خود بھی حاضر ہوتا اسوقت عارض یعنی فوجی افسر معائنہ روپے اشرفیوں کے توڑے سامنے ڈھیر لگا کر بیٹھ جاتا اور منادی سب سے پیشتر عمرو بن لیث کا نام لیکر آواز دیتا عمرو بن لیث اپنے گھوڑے پر سوار اور ہتھیاروں سے آراستہ اور سجی بنا ہوا "عارض" کے مقابل جا کھڑا ہوتا اور عارض اسکے ساز و سامان کا جائزہ لیکر حکم دیتا کہ عمرو کو تین سو درہم عطا کئے جائیں درہموں کی تھیلی عمرو بن لیث کیطرف ڈالی جاتی

اور وہ اُسے اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیتا اور کہتا "خدا کا شکر ہے کہ اُسنے مجھے امیر المومنین کی ایسی خدمت کرنیکی توفیق عطا فرمائی جس کی وجہ سے میں انعام کا مستحق ہوا"۔ یہ کہکر تھیلی کو اپنے موزہ میں رکھ لیتا اور وہ تھیلی اس شخص کا حق ہوتی جو اس کا موزہ اتارتا تھا اسکے بعد منادی ایک ایک کرکے تمام نامی لوگوں کو بترتیب مدارج آوازیں دیتا وہ عارض کے سامنے آتے اور عارض اُنکے پورے ہتھیاروں کو دیکھتا گھوڑوں کا جائزہ لیتا اور پیادل و سوار دونوں کے تمام ہتھیار ایک ایک کرکے ملاحظہ کرتا اگر کوئی شخص کوئی چیز چھوڑ آیا ہوتا تو اس کا انعام ضبط ہوجاتا عمرو بن لیث نے ایکدن ایک سوار کا معائنہ کیا جس کا گھوڑا بے حد لاغر اور کمزور تھا "عمرو" نے اس سوار سے کہا "کیوں جی! تم ہمارا روپیہ لیجا کر اپنی جورو کو کھلاتے اور اسے موٹی تازی بناتے ہو اور اپنی سواری کو ایسا لاغر کردیا ہے جسپر چڑھ کر لڑتے اور جسکے ذریعہ سے انعام حاصل کرتے ہو۔ جاؤ تمہارے واسطے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے" سوار نے عمرو بن لیث کو جوابدیا قربان جاؤں"۔ اگر میں اپنی بیوی کا ملاحظہ کراتا تو اسمیں شک نہیں کہ اُسے دیکھکر آپ میرے گھوڑے کو خوب موٹا تازہ بتاتے عمرو یہ سن کر ہنس پڑا اور اس سپاہی کو انعام دلوا کر اس سے کہا "اچھا اب اپنا جانور بدلوا لے"

فوجی چھاؤنیاں

صدر اسلام میں جبکہ مسلمان خود ہی فوجی سپاہی بھی ہوتے تھے انکا دستور یہ تھا کہ کسی شہر کو فتح کرکے اس کے آس پاس کسی مقام کو اپنا مسکن قرار دے لیتے اور ایسی جگہ قیام کرنے سے پرہیز کرتے تھے جس کے اور "مدینہ" کے مابین راہ میں کوئی دریا یا نہر حائل ہوتا ہو اس طرز عمل کے اختیار کرنے میں اُن کو عمر بن الخطاب رضی کی مذکورہ بالا وصیت پر چلنا ملحوظ تھا اسی وجہ سے مصری سپاہ سکندریہ میں نہیں رہی جو مصر کا پایہ تخت تھا بلکہ بجائے اس کے اسنے "حصن بابل" کے نزدیک خیموں میں سکونت اختیار کی اور پھر وہ مقام فسطاط کے نام سے مشہور ہو کر ایک آباد شہر بن گیا عراق کی فوجیں کسرے کی دار السلطنت مدائن میں نہیں رہیں بلکہ نہر فرات کے اُن کناروں پر جو بادیہ شام سے متصل واقع تھے بصرہ کوفہ میں مقیم ہوئیں ان دونوں فوجوں کے علاوہ اور افواج نے بھی اسیطرح اُن تمام دیگر ملکوں میں سکونت رکھی جو صدر اسلام سے فتح ہوتے رہے یا فتح ہوئے تھے وہ لوگ مفتوحہ شہروں کے باہر اُنکے اطراف میں صرف ان مقامات کی حفاظت کرنیکے لحاظ سے قیام کرتے تھے جنکا ہم ولایت العمال کے بیان میں ذکر کر آئے ہیں لیکن یہ ضرور تھا کہ اس زمانہ میں اہل عرب لڑائی پر جاتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لیجاتے تھے اور جب کسی شہر کو فتح کرتے تھے تو سب کے سب وہیں مقیم ہوجاتے اسی لئے شدہ شدہ وہ فوجی چھاؤنیاں مرور زمانہ سے خاصے

آباد شہر بن گئیں۔

عرب والوں نے تمدن اختیار کیا تو جنگ پر جاتے وقت عورتوں کو ہمراہ لینے کا دستور ترک کر دیا اس قاعدہ پر برابر عامل رہے کہ فوجی چھاؤنیاں شہروں کے باہر رکھیں اکثر حالتوں میں یہی چھاؤنیاں بڑے بڑے شہر بن جاتی تھیں جو صدیوں تک بہت آباد اور پر رونق رہتے جیسا کہ فسطاط۔ بصرہ اور کوفہ میں واقعہ ہوا "فسطاط" کیا تھا؟ صرف امیر عمرو بن العاص کے خیمے کے گرد چھوٹے چھوٹے خیموں کا ایک پڑاؤ تھا جو بعد میں بڑا بارونق شہر ہو گیا اسکے آباد ہونے کے ایک صدی سے کچھ زیادہ بعد جس زمانہ میں عباسی خاندان والوں نے مطالبہ خلافت پر قیام کیا ہے مروان بن محمد بنو امیہ کا آخری خلیفہ وہاں آکر پناہ گزین ہوا عباسیوں نے صالح بن علی کی ماتحتی میں اس کا تعاقب کیا اور مصر میں آپہنچے انہوں نے فسطاط کے قرب وجوار میں اپنا کمپ قائم کیا اور اس مقام کا نام "عسکر" یعنے چھاؤنی رکھا۔ بعدہٗ لوگوں نے وہاں مقامات بنا لئے اور وہ جگہ جو پہلے ایک میدان تھی اب مثل فسطاط کے ایک شہر بنگئی جسکا نام "عسکر" مشہور ہوا اس کے ایک صدی سے کچھ زائد عرصہ کے بعد ۲۵۶ھ میں "احمد بن طولون" مصر کا فرمانروا ہوا اسنے افواج آلات حرب اور حاشیہ نشین لوگوں کا اضافہ کیا تو فسطاط میں انکی سمائی نہو سکی اسلئے ابن طولون نے "جبل مقطم" کے پاس ایک جدید کمپ قائم کیا جسمیں خود اپنے واسطے ایک قصر تعمیر کرایا اور میدان بنوایا نیز اسنے اپنے غلاموں اور خاص لوگوں کو حکم دیا کہ وہ لوگ بھی وہاں مکانات بنوائیں ان سب عمارتوں کی تعمیر کے بعد وہ مقام بھی ایک عظیم الشان شہر ہو گیا اور عمارتوں کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے فسطاط سے مل گیا اس نئے شہر کا نام "قطائع" رکھا گیا۔ فاطمی خلفاء کے نامور سپہ سالار جوہر نے بھی اسیطرح ایک جدید آبادی ڈالی جس زمانہ میں وہ ملک مصر کو فتح کرنے آیا اسنے اپنی فوجیں (مقطم) کے دامن میں قطائع سے باہر ٹھہرائیں جب ملک کی فتح سے فارغ ہو گیا تو اسی کمپ کے میدان میں مشہور شہر "قاہرہ" کی بنیاد ڈلوائی جو آجتک باقی ہے انہی واقعات سے ملتی جلتی روائتیں تمام اسلامی شہروں کے بارہ میں بیان کی جاتی ہیں خلیفہ منصور عباسی نے بغداد کو اپنی فوج کے اور اپنے واسطے ایک قلعہ کی صورت پر تعمیر کرایا تھا اور اسیطرح اسکے بیٹے مہدی نے بغداد سے باہر چھاؤنی ڈالی تھی اسی طرز پر تمام اسلامی چھاؤنیوں کو قیاس کرنا چاہیئے کیونکہ مسلمان حکمران یا امراان چھاؤنیوں کو شہر سے باہر بہت دور عام رعایا کے مکانات سے الگ بنوایا کرتے تھے یہی باعث تھا کہ جب حجاج بن یوسف ثقفی نے واقعہ "جماجم" کے بعد اپنی سپاہ کو اہل کوفہ کے گھروں میں لا اتارا تو

وہاں کے باشندے اس سے بہت ناخوش ہوئے اور اس کے اس فعل کو ظلم وستم میں شمار کرنے لگے حجاج کا یہ طریقہ خصوصاً اسلئے اور بھی ناپسند ہوا کہ اس کے بعد آنیوالے امیروں نے اکثر اسی طریق کو اپنا معمول بنایا اور بالخصوص عجم کے ملک میں تو اس طریقے نے پوری طرح رواج پالیا اور اسمیں عام رعایا کی حق تلفی ہوتی تھی۔

لوا ۔ یا ۔ رایت

فوجی نشانوں کی تاریخ لوا اور رایت ایک ہی شے ہے۔ اکثر اوقات لوا رایت سے چھوٹا ہوتا تھا یا یوں ہوتا کہ جو وقت رایت کسی جنگ کیلئے معقود ہوتا تو اسی کو لوا کہا کرتے تھے زمانہ حال کی اصطلاح میں اسکو علم بنود اور بیرقین کہتے ہیں رایت کی تاریخ بہت قدیم ہے زمانہ قدیم کے مصری فرمانروائوں اور انکے معاصرین نے اس کے استعمال کی بنیاد ڈالی یا انہیں لوگوں سے اخذ کیگئی اسلام سے قبل عرب جاہلیت میں بھی اس کا استعمال عام تہا ہر قبیلہ کا ایک نشان ہوتا تھا جس کے نیچے میدان جنگ میں وہ جمع ہوا کرتا۔ جنگ و پیکار کیوقت نشان کی بہت بڑی عظمت ہوتی ہے اسلئے کہ لوگ اپنے نشان ہی کے برقرار رہنے سے لڑتے رہتے ہیں جس وقت نشان گرا وہ بھی ہزیمت کہا کر بہاگ نکلتے ہیں جس موقعہ پر ہم نے زمانہ جاہلیت کی حکومت کا انداز بیان کیا ہے وہاں یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ اہل قریش کے منصبوں میں ایک منصب علم برداری کا بھی تہا اور وہ اس عہدہ کا نام اپنے اس زمانہ کے علم کے نام پر "عقاب" رکھتے تھے جو وقت اہل قریش کسی جنگ کیلئے نکلتے تو اس نشان کو بھی نکالتے اور مشورہ کرکے اگر کسی خاص شخص پر رائے قائم ہوتی تو وہ نشان اس کے حوالہ کردیتے ورنہ اس شخص کے سپرد کرتے جو اس خدمت کیلئے ہمیشہ سے نامزد چلا آتا تہا یہ علم بردار کسی موقعہ پر بنو امیہ کے گھرانے سے ہوتا تہا اور کبھی کبھی بنو عبدالدار سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب والوں نے اپنے نشان کا نام "عقاب" اہل روم سے اقتباس کرکے رکھا تہا۔ کیونکہ "عقاب" اور "کسر" رومانیوں کا نشان حکومت (مارکہ تھا) جس کو وہ لوگ اپنے علموں پر اور مکانات پر نقش کرتے تھے اہل عرب نے اُن سے اقتباس کرلیا۔

"سیرۃ حلبیہ" میں لکھا ہے کہ غزوہ بدر کبریٰ میں مسلمانوں کے پاس تین نشان تھے ایک سفید تھا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُسے مصعب بن عمیرؓ کے حوالہ فرمایا تہا اور باقی دو سیاہ تھے جنمیں سے ایک کو (حضرت)

علیؓ بن ابی طالب اٹھائے ہوئے تھے اور یہ نشان "عقاب" کہلاتا تھا۔ جو کہ (بی بی) عائشہؓ کے ایک "مرط" (صوف یا سیاہ ریشم کا کپڑا جس کو عورتیں اوڑھنی یا تہ بند کے کام میں لاتی تھیں) سے بنایا گیا تھا اور دوسرا سیاہ "علم" ایک انصاری شخص کے پاس تھا اسی واقع میں ابوسفیان سردار نے کا نشان لئے ہوئے تھے اس کا نام بھی عقاب ہی تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقاب ایک خاص قسم کے نشانوں کا نام تھا جو رومانیوں کے ہاں استعمال ہوا کرتے تھے وہ کسی ایک ہی نشان خاص کا نام نہ تھا مذہب اسلام کا ظہور ہوا اور اہل عرب شام فارس اور مصر کے اطراف میں پھیلے انکی متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور بہت سے قبیلے ہو گئے تو نشانوں کی قسمیں بھی ان کے ہاں بکثرت ہو گئیں ان کی شکلیں طرح طرح کے ہونے لگیں اور رنگ برنگ کے فوجی نشانات نظر آنے لگے اب انکے دامن بھی وسیع ہوتے اور وہ بہت لمبے لمبے بنائے جانے لگے تھے اور ان نشانوں کے نام بھی جدا جدا رکھے جاتے۔ "ابومسلم خراسانی" نے عباسی دعوت پر قائم ہوتے وقت جو نشان نکالا تھا وہ "ابراہیم" امام نے بنا کر اسے بھیجا تھا۔ اس نشان کا نام "ظل" تھا اور وہ ایک چودہ ہاتھ لمبی چھڑ پر بندھا ہوا تھا۔ نیز اسی ابومسلم نے ایک اور نشان بھی کھڑا کیا تھا جس کا نام "سحاب" تھا جس کی چھڑ تیرہ گز لمبی تھی یہ نشان بھی امام ابراہیم نے ابومسلم کو بھیجا تھا اتنے بڑے بڑے نشانوں کے استعمال سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں پر رعب چھا جائے اور وہ بلا جنگ و جدل اطاعت پر آمادہ ہو جائیں ۲۳۵ھ میں متوکل نے اپنے بیٹوں کیلئے ولیعہدی کی بیعت لی تو انہیں سے ہر ایک کے واسطے دو نشان بنائے ایک سیاہ ولیعہدی کا نشان اور دوسرا سفید گورنری کا نشان۔ خلیفہ مامون الرشید نے فضل بن سہل کو تمام مشرقی صوبوں کا گورنر مقرر کر کے اسے وہاں کی فوجی اور ملکی افسری عطا کی اور اس کا نام "ذی الریاستین" قرار دے کر اسکے واسطے ایک دو شاخہ نیزہ پر نشان حکومت بنایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شدہ شدہ مرور زمانہ سے فوجی نشانوں کی متعدد شکلیں پیدا ہو گئیں اور خلفاء و سلاطین نے نشانوں کی کثرت کے ساتھ تفاخر کرنا شروع کیا جس وقت خلیفہ عزیز باللہ فاطمی نے ملک شام پر فوجیں روانہ کی ہیں اور اسے فتح کرنے کی نیت سے نکلا ہے تو اسکے ہمراہ ۵۰۰ نشانات اور ۵۰۰ بوق تھے اکثر اوقات نشانوں پر ان سلاطین و امرا کے نام بھی نقش کئے جاتے تھے جو فوج کے سپہ سالار ہوتے جس طرح کہ ابن نجیم نے اپنے نشان پر ابن ابی الحق کی جانب نسبت رکھنے کیوجہ سے "ابن ابی الحق" کا لفظ کڑھوایا تھا۔

نشانوں کے رنگ | سولہ نشان "عقاب" کے جس کی بابت پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ سیاہ رنگ تھا اور ہم کو نہیں معلوم ہو سکا کہ جاہلیت کے زمانہ میں نشانوں کے رنگ کیسے کیسے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان بھی "عقاب" ہی کی مانند سیاہ تھا۔ "آثار الاول" کے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چند سفید نشانات بھی تھے اسلامی نشانات کی رنگتیں اختلاف حکومت کے ساتھ بدلتی رہیں بنی امیہ کا نشان گہرا سرخ ہوتا تھا علوی حکومت کے داعیوں کا سفید اور بنی عباس کا سیاہ اور عباسیوں کی تو ساری وردی ہی سیاہ ہوتی تھی جسے ان لوگوں نے اپنے شہیدوں کے رنج و الم میں جو بنی ہاشم کے گھرانے سے تھے پہننا شروع کیا تھا اور اس لئے بھی کہ بنی امیہ کو ان کی قتل کی خبر پہنچا ئیں اسی سیاہ پوشی کی وجہ سے ان کا نام "مسودہ" مشہور ہو گیا، ہاشمی لوگوں میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور بنی طالب ہر سمت سے اور ہر وقت میں عباسیوں کے مقابلہ کو تیار اور ان سے آمادۂ پیکار رہے تو انہوں نے عباسی لوگوں کی مخالفت کے خیال سے سفید نشانوں کا استعمال شروع کیا ان لوگوں کا نام "مبیضہ" مشہور ہوا اور ظاہر ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم کے جو دعاۃ اہل تشیع سے تھے ان کا خاص لباس سبز تھا کیونکہ جس وقت مامون الرشید نے امام علی بن موسیٰ" کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ تمام سیاہ رنگ کے لباسوں کو علیحدہ کر کے ان کی جگہ سبز کپڑے استعمال کریں یہاں تک کہ جب مامون الرشید اس نیت سے پھر گیا تو دوبارہ اس نے وہی سیاہ لباس اختیار کر لیا،

صنہاجہ وغیرہ مغربی ممالک کے بربری بادشاہوں نے اپنے لئے نشانات کا کوئی خاص رنگ نہ رکھا تھا بلکہ انہوں نے رنگ برنگ خالص حریر کے کپڑوں پر زری کا کام بنوا کر انہیں علموں میں لگا لیا۔ مشرقی ممالک کی ترکی حکومتیں صرف بادشاہ (سلطان) کے واسطے ایک علم رکھتی تھیں جس کے سرے پر بالوں کا بڑا بھاری گچھا لگایا جاتا اور اس کو "شالش" اور "جتر" کے نام سے موسوم کرتے تھے ان کے ہاں یہ خاص سلطان کا شعار ہوتا تھا اس کے بعد رایات کی تعداد زیادہ ہوتی رہی جن کو "سناجق" کہتے تھے اس کا واحد لفظ "سنجق" ہے جس کے معنے ان کی زبان ترکی میں علم کے ہیں،

عقد لوا | صدر اسلام میں خلفاء کا دستور تھا کہ کسی فوج کو میدان جنگ میں بھیجتے ہوئے اس کے واسطے نشانات اپنے ہاتھ سے مرتب کر دیا کرتے تھے، اور وہ نشانات امرائے فوج کے سپرد کر دیتے ہر ایک امیر کو اسکے قبیلہ کا نشان عطا ہوتا تھا، اور خلیفہ وقت نشان افسری سپرد کرتے وقت ان کیلئے

فتح وظفر کی دعا اور صبر و مردانگی کی وصیت کیا کرتا۔ عمر بن الخطابؓ کسی امیر کو افسری کا نشان حوالہ کرتے
وقت اُسے ترتیب دیتے ہوئے کہتے جاتے تھے "خدا کے نام اسکی امداد اور اعانت کے ساتھ (میں نے اسکو
مرتب کیا) خدا کی تائید ہمراہ لے کر روانہ ہو۔ اُسی کی قدرت سے فتح حاصل ہو سکتی ہے اور فتح وظفر کیلئے
امر حق اور صبر کا لزوم ضروری ہے جو شخص خدا کے ساتھ کفر کرتا ہے خدا کی راہ میں اس سے لڑنا حد سے
نہ بڑھنا کیونکہ خداوند پاک حد سے بڑھ جانیوالوں کو پسند نہیں کرتا دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو جانے پر نامردی
اور بزدلی نہ دکھانا قدرت پا کر مثلہ (ناک کان ہاتھ پیر کاٹنا) نہ کرنا فتحیابی کیوقت فضول خرچی نہ کرنا بڈھے
مرد اور کسی عورت اور کسی معصوم بچہ کی جان نہ لینا جب افواج غنیم سے تم ملجاؤ اور بازار جنگ گرم
ہو اسوقت خوب جی کھولکر قتل کرنا اور چھاپے مارتے وقت بھی ایسا ہی کرنا" اگرچہ دعا دینے اور وصیت
کرنے میں ہر ایک خلیفہ کا ایک جدا گانہ طرز تھا۔ لیکن اصل سب کی ایک ہی تھی اسلامی حکمران عاملوں کو
کسی شہر کا والی بناتے وقت اُنکے لئے بھی نشان افسری تیار کرتے تھے خصوصاً صدر اسلام میں جبکہ
عامل بھی وہی شخص ہوتا جو سپہ سالار فوج ہو۔ نیز نجوم کے قاعدہ سے ساعت دیکھ کر بھی نشان بنواتے
تھے اور اسکے لئے نیک قرآنات میں سے اپنے خیال کے مطابق کوئی ایک قرآن پسند کر لیا کرتے
تھے عباسی خلفاء کا دستور تھا کہ کسی سردار فوج یا صاحب ثغر (حاکم ممالک سرحدی) کو نشان حکومت
عطا کرتے تو وہ شخص خلیفہ کے محل سے یا اپنے مکان سے بہت سے علم برداروں کو جلوس میں لیکر
نکلتا تھا اسکے ساتھ طبل بجتے جاتے تھے اور بہت شان وشکوہ کے ساتھ شہر کے بازاروں میں ہو کر نکلتا تھا
یہاں تک کہ عامل اور خلیفہ کے سامان جلوس میں صرف نشانوں کی کمی بیشی کا فرق رہجاتا تھا۔ یا
نشانوں کی وہ خاص رنگتیں وجہ امتیاز ہوتی تھیں جو محض خلیفہ کے ساتھ مخصوص تھیں۔

مصر میں فاطمی حکومت کا ایک خاص مکان تھا جسے "خزانۃ البنود" کہتے تھے اس میں علم نشان اور
ترستے رہتے اس خزانہ پر ۸۰۰۰ دینار سالانہ خرچ پڑتا تھا وہ خلفا کامل ایک صدی اسی حالت پر قائم رہے اس
عرصہ میں جسقدر علم وغیرہ بنائے گئے سب اُسی مکان میں جمع پڑے رہے اور نیز اسی کے اندر قسم قسم کے ہتھیار
اور سنہری روپہلی زین و لگام کا انبار لگا رہا آخر اس خزانہ میں آگ لگ گئی اور جو کچھ اسمیں اندوختہ تھا سوائے
اس قدر ظہور کے جو بچا یا جا سکا سب جلکر خاکستر ہو گیا اسی جلے ہوئے سامان میں ایک خاص نشان بھی شامل تھا
جسکو بنو فاطمہ بہت عزیز رکھتے تھے اور اس کا نام انہوں نے "لواء الحمد" رکھ چھوڑا تھا۔ +

جنگی۔یا۔فوجی باجے

فوج میں باجے کا رکھنا قدیمی دستور ہے اس کی اصل غرض یہ ہے کہ جنگ کی حالت میں سپاہیوں کی ہمت بندھائی جائے اور تقویت و جرأت دلائی جائے تاکہ اُن خطرات کی فکر میں جن کا یقینی خدشہ ہوتا ہے اُنکے پاس نہ بھٹکنے پائیں فوج کے آگے آگے گانا یا گنگنانا بھی اسی لئے ہوتا تھا۔ ایام جاہلیت میں عرب والے "طبل" کے سوا اور کسی باجے سے واقف نہ تھے اور مسلمان لوگ صدر اسلام میں طبل و بوق کے استعمال سے بدیں خیال باز رہتے اور پہلو تہی کرتے تھے کہ وہ حکومت کے گھمنڈ اور اسکی شان و شکوہ سے بچنا چاہتے اور اس کو ناپسند کرتے تھے لیکن جبکہ خلافت ملک اور حکومت دنیاوی سے تبدیل ہو گئی مسلمان خلفاء (حکمرانوں) نے دنیاوی زیب و زینت کے ساتھ دلبستگی اختیار کی۔ روم فارس اور دیگر گذشتہ سلطنتوں کے لوگ انکے غلاموں کی جماعت میں داخل ہو کر مقرب ہوئے اور انہوں نے ان کو بھی وہ طریق سمجھائے جنکے سالک بن کر خود عیش و عشرت کے بحر ناپیدا کنار میں کودے اور آخر اسمیں غرق ہو چکے تھے تو مسلمان فرمانرواؤں نے منجملہ اُن چیزوں کے جن کو رومیوں اور فارسیوں سے اخذ کیا تھا فوجی باجوں کو بھی اقتباس کیا خلفا نے اپنے عاملوں کو جنگی باجے رکھنے کا حکم ابتدا محض اس غرض سے دیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بادشاہ اور حکام کی عظمت شان کا پتہ ملتا ہے مگر آخرکار یہ طریقہ بہت رائج ہوتا گیا اور روز بروز ان باجوں کو ترقی ہوتی گئی تاہم عہد اسلام میں فوجی باجوں کے اندر طبل اور بوق کے سوا اور قسم کا باجہ داخل نہ ہوا اور بسا اوقات صرف ایک فوج میں کئی سو طبل اور بوقیں ہوتی تھیں ٭

سلاح

ایام جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں۔ تلوار، نیزہ، کمان، اور ڈھال کے علاوہ اور کسی قسم کے اسلحہ نہیں پائے جاتے تھے انہیں اسلحہ کے استعمال کرنے پر اُن کی تمام کوششوں کا دارومدار رہتا، خصوصاً کمان کا استعمال بہت مشق کے بعد کیا جاتا تھا عرب والوں کیلئے روٹی کمانے کا ذریعہ اور اپنی عزت و آبرو بچائے رکھنے کا وسیلہ صرف یہی ہتھیار ہے ؎

قوس | چونکہ جنگی زندگی بسر کرنے کیوجہ سے عرب والوں کی بصارت بہت قوی اور انکی نظریں تیز ہوتی تھیں

اس لیئے ان کو کمان کے استعمال میں بہت بڑی مہارت حاصل ہوتی تھی، اور اس مہارت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو بہ نسبت دوسرے ہتھیاروں کے کمان کی حاجت زیادہ تھی علاوہ حالت جنگ و جدال کے وہ لوگ اس سے ہرنوں کے شکار میں بھی کام لیا کرتے تھے اُن کی تیراندازی کی مہارت اس حد کو پہنچ گئی تھی جس کے سچ سمجھنے میں تامل ہو سکتا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی عرب تیرانداز اس بات کا ارادہ کرتا کہ ہرن کی صرف ایک آنکھ کو نشانہ بنائے تو وہ نہایت آسانی سے اس قصد میں کامیاب ہوجاتا اسی لحاظ سے اعلےٰ درجہ کے قادر اندازوں کو "رماۃ الحدق" کے نام سے موسوم کرتے تھے ایک اچھا قادر انداز عرب "گوہ" (جانور) کو باندھ کر درخت سے لٹکا دیتا اور اسپر تیر چلا کر اسکے جس عضو کو چاہتا نشانہ بناتا یہانتک کہ پشت کی ہڈی (ریڑھ) کے ایک ایک جوڑ کو تیروں سے چھید تا جاتا اور کبھی اس کا نشانہ خطا نہ کرتا۔

اسلام کا عہد آیا تو اہل عرب کی یہی مہارت منجملہ اُن امور کے ایک نہایت قوی چیز ثابت ہوئی جنہوں نے اہل روم کو مغلوب کرنے میں عرب والوں کی امداد کی تھی اسلیئے کہ رومی لوگ تیراندازی میں بہت خام تھے اور اس بات کو ہمنے فتوح اسلامیہ کے بیان میں ظاہر بھی کر دیا ہے، مسلمان جنرل اپنی فتحیابی میں تیراندازی کے فوائد اور اسکے احسانات سے غافل نہ تھے بدیں لحاظ وہ اپنے سپاہیوں کو اس فن کی مشق و مہارت کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا کرتے۔ سوار ہو اور تیراندازی کرو اور اگر صرف تیراندازی کرنا چاہو تو مجھ کو یہ بات سواری سیکھنے سے زیادہ پسند ہے" اور یہ بھی آپ ہی کا قول ہے "مرد مومن کے تمام کھیل صرف تین باتوں میں منحصر ہیں اپنے گھوڑے کو چال ڈھال سکھائے، اپنی کمان کو خوب ٹھ کر کے تیراندازی کرے اور اپنی بیوی سے ہنسے بولے اسمیں شک نہیں کہ یہ امر حق ہے بیشک اللہ پاک محض خدا کیلئے ایسے کام کرنیوالے اور خدا کی راہ میں تیراندازی کرنے والے کو جنت میں داخل فرمائیگا۔ ایکبار منبر پر استادہ تھے اُسی حالت میں فرمایا تم سے جسقدر قوت بہم پہنچائی جا سکے بہم پہنچاؤ، ہوشیار ہو جاؤ اسمیں کوئی شک نہیں کہ تیراندازی ہی قوت ہے۔ تیراندازی ہی قوت ہے۔ تیراندازی ہی قوت ہے۔"

نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلفاء اور امراء سپاہ اپنے سپاہیوں کو مشق تیراندازی کی ویسی ہی تاکید کرتے رہتے تھے جسطرح گھوڑوں کی خبرگیری کرتے رہنے کی کیونکہ اہل عرب بڑے شہسوار ہوتے ہیں وہاں کے گھوڑے تیزی و چالاکی میں اور سوار کے قابو میں باسانی آجانیکے بارہ میں مشہور و معروف ہیں فوجی سپہ سالار افسر اپنے ماتحت لوگوں کو ہمیشہ ہدایت کرتے رہتے تھے کہ اپنے گھوڑوں کی بھی اسیطرح خبر لیتے رہا کریں جسطرح اپنی بیویوں کی غور و پرداخت

کرتے ہیں۔

زمانہ وسطیٰ میں مسلمانوں نے تیر اندازی کے اندر تفنن کیا یا اور کمانوں کے ذریعہ سے کئی ایک مرکب آلات تیار کیے ممکن ہے کہ ان آلات میں سے کوئی آلہ انہوں نے فارس والوں سے اخذ کیا ہو جس طرح عجمی لوگوں نے تاتاریوں سے جنگ کرنے کیوقت ایک آلہ مستنبط کیا تھا جسکا نام "مجراۃ" ہے یہ ایک لوہے یا لکڑی کا نلکہ ہوتا تھا اور اس کے اندر ایک شق (پرزہ) اور بہی ہوتی تھی اس نلکہ میں تیر ڈالکر دوسرے پرزہ کے زور سے اُسے پھینکتے تھے اور بہ نسبت کمان سے چلانے کے اس آلہ کے ذریعہ تیر اندازی کرنا تیر کے زور سے چلنے کا فائدہ دیتا تھا جس طرح پر آجکل بندوق کے ذریعہ سے گولی پھینکی جاتی ہے جو تیر اس آلہ کے ذریعہ سے پھینکے جاتے وہ بہت چھوٹے ہوا کرتے تھے مگر اہل عرب نے "مجراۃ" کو بہت کم استعمال کیا۔

تلوار۔ عرب والے تلوار کو تمام اسلحہ سے افضل و اشرف خیال کرتے تھے۔ اور باہر کے ملکوں سے منگوا کر استعمال میں لاتے غیر ممالک کی بنی ہوئی جو تلواریں عرب والوں میں بکثرت استعمال ہوتیں انمیں سب سے زیادہ مشہور حسب ذیل تلواریں تہیں، یمنی۔ ہندی۔ سلیمانی۔ شامی اور خراسانی یہ سب تلواریں "سیوف عتیقہ" کے نام سے مشہور تہیں نیز انمیں سے ہر ایک قسم کیلئے ایک مخصوص شکل یا علامت ایسی ہوتی تھی جسکی وجہ سے وہ بہ نسبت دیگر اقسام کے ممتاز ہو۔ مثلاً خالص یمانی تلوار جو زمانہ جاہلیت میں بنی ہو۔ دو سوراخوں سے پہچانی جاتی تھی، جو "سیلان" کے "سنبل" میں ہوا کرتے تھے (سیلان اس حصہ کا نام ہے جو قبضۂ شمشیر کی اصل جگہ ہے) یہ سوراخ ایک طرف سے زیادہ چوڑا ہوتا اور دوسری طرف سے تنگ یا ہر دو طرح برابر یکساں اور بیچ میں بہت تنگ ہوتا یمنی تلواروں میں سے ایک قسم کی تلوار کا نام "محفورہ" تھا اُن کے اندر کی نالیاں نہروں کی صورت پر بنی ہوئی تہیں جو مبرد و سوہان کے ذریعہ کہود دی جاتی تہیں بعض تلواروں میں مربع کہدے ہوئے نشانات بنے ہوتے تھے اور چند تلواریں ایسی بھی ہوتی تہیں جن میں متعدد نالیاں بنی ہوتیں، مگر یمن کی تلوار رگوں سے بہرحال بہت کم خالی ہوتی تھی، کبھی کبھی ان تلواروں پر تصویریں بنائی جاتیں یا کچھ عبارت لکھی جاتی یا پھول بوٹے بنے ہوتے تھے مگر یہ تلواریں زیادہ تر نرم اور گداز چیز کو کو کاٹ سکتی تہیں خشک یا سخت چیز یا لوہے پر پڑنے سے کر جاتی تہیں اور رومی تلواریں ان سے زیادہ استوار و سخت ہوتی کیونکہ اہل روم انکی آب بہت اچھی رکہتے تھے وہ تلواریں لوہے کو بلا تامل کاٹ دیتی تہیں اسی وجہ سے جب کبھی اہل عرب کو کوئی عمدہ کاٹ کی تلوار دستیاب ہوتی تو وہ اسکے قصے باہم نقل کرتے رہتے

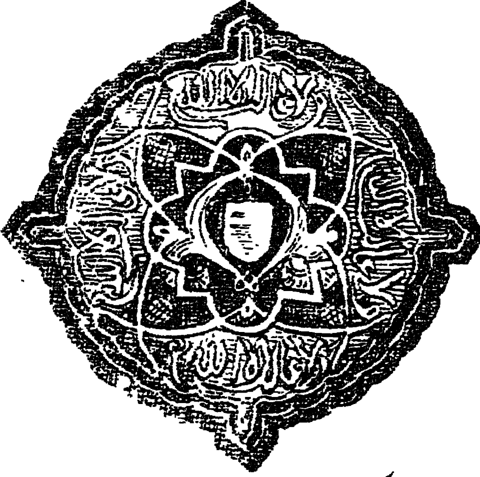
اور اُسے بہت دور دور شہروں میں مشہور کر دیتے تھے' اوائل اسلام میں علی بن ابی طالب کی تلوار "ذوالفقار" اور عمرو بن معدی کرب زبیدی کی شمشیر "صمصامہ" وغیرہ بہت نامی تلواریں تھیں "ذوالفقار" کی شان اسلامی تاریخ میں بہت بڑھی ہوئی ہے وہ آل ابی طالب میں مدت تک درا ثتہً چلی آئی اس کے بعد اُسے مہدی عباسی نے لے لیا' اور مہدی کے پاس سے یکے بعد دیگرے "ہادی" اور رشید کے قبضہ میں رہی اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس میں اٹھارہ نقرے" (ریڑھ کی ہڈیوں کے ایسے جوڑ) تھے اس لئے اس کا نام "ذوالفقار" رکھا گیا'

نیزے نیزے کا استعمال اکثر گھوڑوں پر سواری کی حالت میں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اہل عرب اس کے ٹوٹ جانیکے خوف سے اُس پر کچھ اطمینان نہ رکھتے تھے' حالت جنگ میں نیزہ کے استعمال سے متعلق اہل عرب کی جو ہدایتیں اور قواعد ہیں منجملہ اُن کے اسکے جنبش دینے کے طریقوں اور اسکے پھرانے اور لگانے کے قاعدوں میں صاحب آثار الدول نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے' میدانوں میں اکھاڑوں میں اور بادشاہوں کے سامنے نیزہ بازی کے کرتب دکھانا اور چیز ہے اور حالت جنگ میں اسکے استعمال کا اور ہی ڈھنگ ہے جنگ کیوقت نیزہ چلانیکے طریقوں میں ایک طریقہ "مواجہہ" ہے اسکی صورت یوں ہے کہ حریف پر حملہ کرتے ہوئے نیزہ کو بغل کے نیچے دبا کر اُسے اپنے گھوڑے کی دونوں کنوتیوں کے مابین رکھو اور اسیطرح سیدھا ہی مقابل کیجانب بڑھو یہانتک کہ اُس کے قریب پہنچ جاؤ پھر اگر دیکھو کہ حریف نے اپنا نیزہ داہنی جانب ڈالدیا ہے تو تم اپنا نیزہ بائیں جانب کر لو۔ یا بصورت خلاف نیزہ کا رُخ دوسری طرف کر دو اور کوشش کرو کہ پہلے تم ہی حملہ کرو اور خوب ہشیار اور مستعد رہو' نیزہ کو داہنے بائیں جنبش دیتے جاؤ تاکہ دشمن پر رعب چھایا رہے' اگر تم کو کسی طرف سے چوٹ کرنیکا موقع نہ ملتا ہو تو دشمن سے قریب ہونے وقت جس مقام کو اسکے نیزہ کی گردش سے خالی پاؤ فوراً اسی طرف سے گھس کر حملہ کر دو اور جسحالت میں تم دشمن کے مقابلہ سے نکلنا چاہو اور اسکی ابتدا کرنیکا ارادہ کرو تو اپنے نیزہ کو پیچھے کی طرف سے بائیں ہاتھ میں تھام کر اسکے سرے کو اوپر ہوا میں اٹھائے رہو اور اُسے اپنے داہنے کندھے پر رکھ کر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دو......

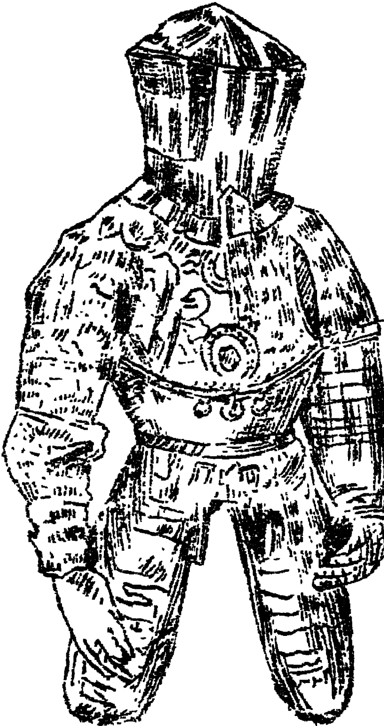
اور اگر دو سواروں کے مقابلہ کیلئے نکلنا ہو تو سب سے پہلے پاس والے سوار پر حملہ کرنا چاہیئے اور جب دونوں قریب ہی ہوں تو اسحالت میں ایک کو دکھانا چاہیئے کہ اُسپر چوٹ کیجاتی ہے اور حملے اُسکے دوسرے ساتھی پر کرنا چاہیئے لیکن پوری طرح حملہ کو تمام نہ کرکے فوراً دوسرے شخص پر ہاتھ چلاؤ اور سچا اور تلا ہوا ہاتھ لگاؤ......الخ

اہل عرب کے یہاں نیزوں کی اینان مختلف شکلوں کی ہوتی تھیں۔ مگر کھی۔ چوڑی۔ لمبی ترچھی اور سیدہی وغیرہ ؛

ڈہال عربوں کے ہاں ڈہال کئی قسم کی ہوتی تھی اور ہر ایک قسم ایک امر کیلئے مناسب تھی کوئی ڈہال مسطح، کوئی مستطیل، وسط میں گہری ہوتی اور کوئی قبہ نما جسکے کنارے جہکے ہوئے ہوتے تھے اور ہر ایک قسم کی ڈہال کا ایک جداگانہ فائدہ تھا، قبہ دار خمیدہ گگروالی ڈہال سے نیزہ کا وار نہیں رک سکتا تھا کیونکہ جہاں نیزہ لگا اوراسمیں پیوست ہوا۔ البتہ پتھروں اور تیرونکی بوچھاڑ میں وہ خوب کام دیتی تھی اور حریف کی تلوار بھی اسپر سے رک جاتی تھی مستطیل ڈہال تیروں سے بچانے کے کام آتی اسکا سر سوار کے سر کو اور اسکی لمبائی اسکے جسم کو محفوظ رکہنے میں کار آمد ہوتی، اور اسکی آڑ میں سوار سر کہولے بغیر ہی اپنی ایک آنکھ سے سامنے کی چیزوں کو بھی دیکھ سکتا تھا اور مسطح ڈہال نیزہ سے بچانے میں مفید ہوتی کبھی دو شخص ساتھ ساتھ نیزہ بازی میں شریک ہوتے اور ایک شخص دوسرے کو ڈہال کا کام دیے جاتا تھا ؛



(غرناطہ کی ڈہال)



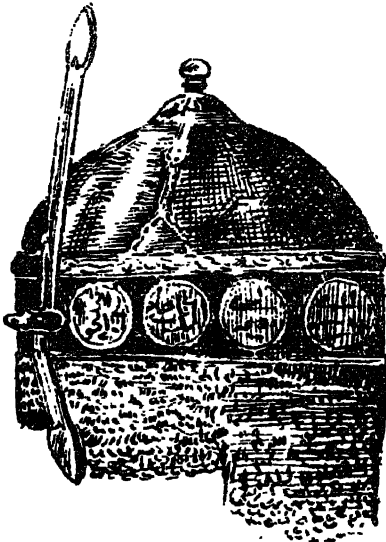
(ابی عبداللہ اخیر مسلمان بادشاہ اندلس کی زرہ)



(ابی عبداللہ اخیر بادشاہ اُندلس کا خود)

مسلمانوں نے ڈھال بنانیکے کام میں تفنن طبع کے جوہر بھی دکھائے تھے اُنپر آیتیں اور پند و نصیحت کے جملے اور اشعار وغیرہ نقش کئے تھے نیز ہر ایک ملک کی ڈھال دوسرے ملک کی ڈھال سے شکل میں جدا ہوتی تھی جنمیں دمشقی عراقی اور غرناطہ کی بنی ہوئی ڈھالیں اور دیگر مقامات کی ساختہ بھی داخل ہیں۔

زرہ اہل عرب کے ہاں زرہیں بہت سی قسموں کی ہوتی تہیں اسمیں اسبات۔ فولاد اور کتان کی زرہیں عمدہ ہوتی تہیں کتان کی زرہ کو "دلاص" کہتے تھے اہل عرب میں غالباً صرف سوار زرہیں پہنتے تھے جو روم و فارس کی بنی ہوئی ہوتیں تھیں نیز اُنکے پاس چند زرہیں مقررہ ناموں سے مشہور تہیں جیسے خالد بن جعفر کی زرہ جسکو ذات الازمہ کہتے تھے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اسمیں چند کڑیاں یا ہک اسطرح کے لگے ہوئے تھے کہ جب اسکا پہننے والا دامن سمیٹنا چاہتا تو اُنہیں ہکوں میں دامن کے سرے لٹکا لیا کرتا۔ زرہ اس پرزہ سے مرکب ہوتی جو سینہ کو محفوظ رکھتا اس پرزہ کا نام جوشن ہوتا۔ اور بیضہ۔ خود اور مغفر سر کی حفاظت کیلئے ہوتے زرہ کے بند پرزے کلائیوں پنڈلیوں اور ہاتھوں کے پنجوں کی حفاظت کے واسطے بھی ہوتے تھے



(ایک بادشاہ مصر کا خود)

اوائل اسلام میں اہل عرب کے اسلحہ صرف یہی تھے۔ بعد ازاں اہل عجم کے کچھ اسلحہ اُن کے استعمال میں اضافہ ہوئے مثلاً خنجر۔ تبر اور فارس وغیرہ اور اُن کی بناوٹ میں تنوع اور وقت کے مطابق تغیر بھی کیا گیا دیکھنے میں دمشق کی بنی ہوئی تلوار ملک عراق کی ساختہ تلوار سے جداگانہ اور مصر کی بنی ہوئی زرہ اُندلس کی بنی ہوئی زرہ سے علیحدہ نظر آئیگی اس کا فرق اشکال ۱۸ اور ۱۹ کے معائنہ سے سمجھ میں آ سکتا ہے جنمیں پہلی شکل اُندلس کے بنے ہوئے خود کی ہے اور دوسری مصر کے بنے ہوئے خود کی اسی پر تمام اسلحہ کی شکلوں کو قیاس کر لینا چاہیئے جن کی تفصیل سے ہم یہاں بخوف طوالت قطع نظر کرتے ہیں

محاصرہ کے آلات

اہل عرب کے ہاں محاصرہ کے آلات بالکل نہ تھے۔ کیونکہ وہ اس کے عادی نہ تھے کہ قلعوں کا محاصرہ کریں اُن کے رہنے کے گھر کھلے میدان میں استادہ کئے ہوئے خیمے ہوتے تھے جنکی حفاظت بجائے خندق اور شہر پناہوں کی تعمیر کے وہ اپنی ہمت و شجاعت سے کیا کرتے تھے اہل عرب نے سب سے اول جس خندق کی بنیاد ڈالی وہ وہ خندق تھی جو جنگ احزاب کے دن ۵ھ میں مدینہ کے گرد سلمان فارسی کی رائے و مشورہ سے تیار کی گئی تھی مگر جب اہل عرب کا میل جول عجمی لوگوں سے بڑھا تو جن چیزوں کا اقتباس اُنہوں نے اہل عجم سے کیا منجملہ اُنکے آلات محاصرہ بھی تھے اور اُنمیں بھی اہم آلات حسب ذیل تھے۔ منجنیق۔ دبابہ۔ کبش۔ اور یونانی آگ۔

منجنیق ایک قاذف آلہ تھا۔ قدیم زمانہ میں فنیقیہ والوں نے اسے استعمال کیا اور اُن سے یونانیوں اور اسرائیلی لوگوں نے اخذ کیا اس کا ذکر مکابیین کے سفر میں کئی جگہ آیا ہے یہ صنعت یونانیوں کے ذریعہ سے تمام دنیا کی سلطنتوں میں پھیلی اور اس کو اہل فارس نے بھی استعمال کیا جن سے اسلام کے بعد اہل عرب نے اخذ کیا

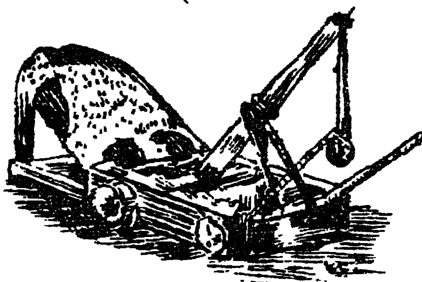


مشہور ہے کہ قرن اول کے وسط میں روم و فارس والوں سے مل کر اہل اسلام نے اس آلہ کا استعمال نہیں کیا
مگر ہم نے سیرۃ حلبیہ" میں دیکھا ہے کہ عرب والوں نے اس آلہ کو محاصرہ طائف میں استعمال کیا اور اس سے کام
لینے کی ترکیب بھی سلمان فارسی نے اسیطرح بتائی تھی جس طرح انہوں نے اہل فارس کے دیگر فنون حرب
سکھائے اور کہا جاتا ہے کہ منجنیق تو خود سلمان رض نے اپنے ہاتھوں سے تیار کردیا تھا۔ سیرۃ حلبیہ کے
مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس زمانہ میں مسلمانوں نے خیبر کا ایک دشوار گذار قلعہ فتح کیا ہے، تو انہیں
وہاں سے کئی منجنیقیں اور "دبابے" دستیاب ہوئے تھے،

منجنیق کی بہت سی قسمیں تھیں جن میں چھوٹی اور لبلبیوں اور کمانیوں کے ذریعے سے کھینچے
والی یا گوپھن کیطرح چکر سے چلنے والی ہوتی تھیں ان کا استعمال تیر، پتھر یا نفط کی شیشیاں پھینکنے کی غرض
سے ہوتا تھا اور کبھی کبھی بچھو وغیرہ موذی جانور بھی انکے ذریعہ سے پھینکے جاتے تھے اگر وہ چیزیں
جن کو پھینکنا منظور ہوتا وزن میں ہلکی ہوتیں تو شیشہ کے ڈلے رکھ کر ان کو بھاری کردیتے اور اگر سیال
ہوتیں جیسے نفط وغیرہ تو اسکے لئے ایک پیالہ نما برتن ترازو کے پلے کیطرح زنجیروں سے لٹکا ہوا استعمال میں لایا جاتا

بیسویں شکل میں ایک رومانی منجنیق کی تصویر دکھائی گئی ہے جسکے ذریعہ سے تیر اندازی کیجاتی
تھی اس تصویر سے معلوم ہوگا کہ ب اور ج دو قائموں کے اندر بہت سے تیر لگے ہیں جنکے سرے دشمن کیجانب ہیں دو
شخص (د) چرخی کو گھما رہے ہیں اور (د) چرخی (ن) دندانہ دار چرخی کو چکر دیتی ہے جس سے ایک قائمہ کے
کنارہ سے متصل ہونیوالی رسی (ا) لپٹتی جاتی ہے جو (س) چکر سے اور (ف) سے لپٹکر قائمہ (ا) کے کنارہ کو
پیچھے کیجانب موڑتی ہے یہ قائمہ ایک لوہے کے ٹکڑے سے بنا ہے اور اسمیں تسمے لگے ہیں جس سے وہ کمان کیطرح کھنچ
جھکتا ہے اور اسکی قوت اتنی ہوجاتی ہے کہ اگر
اسکی زد کو چھوڑ دیا جائے تو تیروں کے سروں پر
زور سے گریگا اور انہیں دور تک پھینک دیگا

(شکل ۲۱)

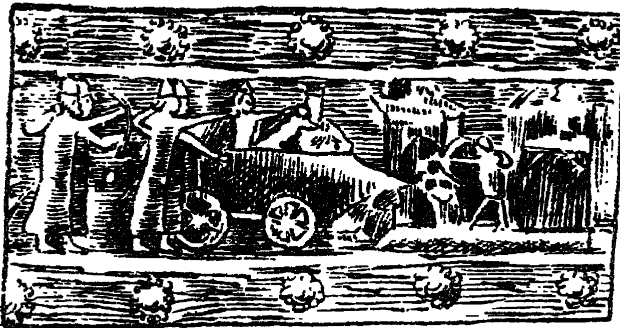


(پتھر پھینکنے کی منجنیق)

۲۱ ویں شکل میں پتھروں کے پھینکنے کی منجنیق
دکھائی گئی ہے یہ ایک لکڑی کا سیدھا
پھٹہ ہے جسکے سرے پر ایک گوپھن نما چیز
لٹک رہی ہے اسمیں پتھر رکھکر پٹہ کو تسموں کے

ذریعہ پیچھے کی جانب کھینچتے ہیں۔ پھر کے نیچے ایک مضبوط کمانی لگی ہے جو وقت کمانی پوری طرح دب جاتی ہے یکایک اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور وہ پھر زور کے ساتھ آگے کو جھکتے ہوئے ایک سلو تختہ پر جا گرتا ہے اور پتھر نکل کر دور جا پڑتا ہے اسکے علاوہ منجنیق کی چند اور صورتیں بھی ہیں جو اسی شکل کے تحت میں آجاتی ہیں۔ منجنیق کا استعمال بڑے بڑے پتھروں کے ذریعہ سے قلعوں کے منہدم کرتے دشمنوں پر تیر برسانے دشمنوں کے مکانات کو نفط کے ذریعے سے جلانے وغیرہ ضرورتوں میں کیا جاتا تھا آگ سے جلا کر شعلہ زن نفط کو تیل کے پلڑوں میں کہہ کر اور ہانڈی وغیرہ کے شکل ظروف میں بھر کر پھینکا جاتا تھا۔ منجنیقیں قد و قامت کی چھوٹائی بڑائی میں مختلف ہوا کرتی تھیں اکثر اوقات بعض صفتوں کے لحاظ سے منجنیقوں کے بھی ویسے ہی نام رکھدیئے جاتے تھے جیسے آجکل جہازوں اور توپوں کے نام ہوتے ہیں حجاج ابن یوسف کے پاس جو منجنیق تھی اس کا نام "عروس" تھا اور اُسکے استعمال کیلئے پانچسو آدمیوں کا عملہ مقرر تھا۔ اس منجنیق کو ۸۹ھ میں محمد بن قاسم نے ہندوستان کی جنگ پر بھیجا تھا اور اس کے ذریعہ سے اہل ہند کا ایک بہت بڑا بتخانہ توڑ ڈالا تھا۔

(ایک اشوری دبابہ جس کے ذریعہ سے شہر پناہ منہدم کیجا رہی ہے)



(شکل نمبر ۲۲)

دبابہ ایک چلانے کا آلہ ہوتا تھا جو بھاری بھاری لمبے چوڑے لکڑی کے تختوں سے بنا کر سر کہ میں تر کئے ہوئے نمدوں اور کھالوں سے منڈھا جاتا تھا تاکہ اُسپر آگ کوئی اثر نہ کر سکے اسکے بعد پہیوں پر چڑھا کر اسے چلاتے کبھی اس تدبیر سے ایک لکڑی کا برج تیار کیا جاتا اسکو بہت سے لوگ گول پہیوں کے ذریعہ سے دھکیلتے لے چلتے کچھ لوگ اس کے اوپر چڑھتے اور اُسپر سے شہر پناہ کی فصیلوں پر چڑھ جاتے جسکا بیان آگے چل کر آئیگا یا آلہ بنسبت

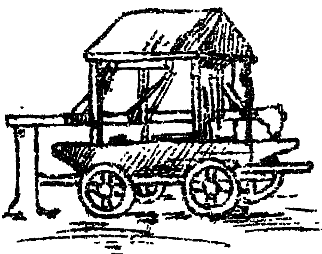
منجنیق سے زیادہ قدیم ہے۔ ابتداءً اس کو اہل مصر نے اور اشوریوں نے استعمال کیا۔ اُن سے یونانی پھر رومانی اور پھر فارسیوں نے اخذ کیا۔ سب سے آخر میں مسلمانوں نے بھی اس کا استعمال سیکھا۔ یہ آلہ گویا پہیوں پر چلنے والا ایک قلعہ ہوتا تھا جس کے وسیلے سے فصیلوں پر دھاوا کیا جاتا اور محاصرین سے اُن پر چڑھ کر جنگ کی جاتی تھی۔



(کبش رومانی)

کبھی قلعہ کی دیواریں منہدم کرنے کیلئے دبابہ کو کام میں لاتے۔ اُسے چلا کر دیوار کے نیچے پہنچا دیتے اور اسکا سر نوکدار بنایا کرتے تھے تاکہ اس سے دیواروں کو ٹکرا کر کھود ڈالیں۔ اسطرح بالآخر بڑی بڑی فصیلوں کو منہدم کر دیتے۔

کبش یہ بھی دبابہ کی شکل کا ہوتا تھا لیکن اتنا فرق تھا کہ اس کا سر آگے کو مینڈھے کے سر سے مشابہ اور نکلا ہوا کرتا تھا جسکے اندر لوگ پناہ لیکر بیٹھتے اور کبش کو بھی قلعہ یا شہر پناہ کی دیواریں منہدم کرنیکے کام میں لاتے۔ جیسے مذکورہ بالا مینڈھے کا سر لکڑی یا لوہے کی ایک موٹی سی بلی میں لگا ہوتا اور وہ بلی دو رسیوں میں جو دبابہ کی چھت سے لگی ہوئی چرخیوں پر کھنچا کرتی تھیں لٹکا کرتی تھیں تاکہ اس کے کھینچنے میں آسانی ہو۔ اس طریقہ پر صرف ایک آدمی دبابہ کے اندر اسکے پیچھے سے اس سر کو دیواریں مارتے رہنے کیلئے کافی ہوتا۔ یہاں تک کہ اُسے کھود کر سوراخ بنا لیتا۔



(کبش کا سرا)

۲۲ ویں شکل میں ایک رومانی کبش کی تصویر دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے برطانیہ والوں کی شہر پناہ پر حملہ ہو رہا ہے اور برطانی لوگ اس سے آگے دیکھ کر خوف کھاتے ہیں اور نشان صلح کھڑا کئے ہوئے اطاعت قبول کرنے کو نکلے ہیں۔

مسلمانوں نے اپنی بہت سی جنگوں میں فصیلوں پر چڑھنے کیلئے دبابہ اور کبش سے کام لیا ہے اور انکے منہدم کرنے یا توڑ کر راستہ بنانے کا بھی فائدہ اٹھایا ہے مسلمانوں کا دستور تھا کہ ایک فوج میں متعدد دبابے رکھا کرتے تھے جنہیں زیادہ تر چھوٹے اور مختصر اس قسم کے ہوتے کہ انمیں صرف چند شخص سما سکیں جو موقع بموقع ڈھب لگا کر فصیلوں پر چڑھ جائیں خلیفہ معتصم باللہ نے عموریہ کو فتح کرنے کیلئے بہت سے دبابے بنوائے تھے جنمیں کئی ایک اتنے بڑے بنے تھے کہ ان کے اندر دس دس آدمی بخوبی سما سکتے تھے

فصیلوں پر چڑھنے کیلئے دبابوں کے استعمال میں لانے کی یہ صورت تھی کہ کچھ لوگ انمیں سوار ہو کر انہیں لڑھکاتے ہوئے شہر پناہ کی دیواروں تک لیجاتے اگر کوئی خندق دیوار تک پہنچنے میں حائل ہوتی تو اسپر پلوں کی طرح تختے اور شہتیر ڈالدیتے اور اگر خندق چوڑی ہوتی تو اسے لکڑیوں اور ریت سے بھرے ہوئے بوروں اور مٹی وغیرہ سے جو انکے ساتھ رہتی پاٹ لیتے جو لوگ خندق پاٹنے کے کام میں مصروف رہتے تھے دبابہ کے اندر بیٹھنے والے لوگ انکی حفاظت ڈھالوں اور بڑی بڑی تھالیوں سے کرتے تھے تاکہ ان پر ان تیروں پتھروں اور نفط کے شعلوں کا اثر نہ ہونے پائے جنکی بارش محاصرین کیطرف سے فصیلوں پر سے ہوا کرتی تھی خندق پاٹکر دبابہ کو دیوار کے متصل لیجاتے اور اُسے ستونوں کے ذریعہ قائم کرنیکے بعد چیر کر اسمیں سے نکل پڑتے اور دیوار سے چمٹ جاتے اگر اس طریقے سے فصیل کی سطح ہاتھ نہ آتی تو اوپر چڑھنے کیواسطے سیڑھیاں لگا لیتے اور اوپر چڑھ کر اندر شہر میں اتر جاتے بشرطیکہ اس کارروائی کا موقعہ ملتا ورنہ فصیلوں کے اوپر ہی لڑتے رہتے تھے



یونانی آگ اہل عرب نے روم والوں سے جن چیزوں کا اقتباس کیا منجملہ ان کے ایک چیز یونانی آگ

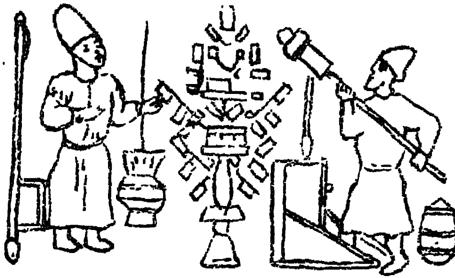
بھی تھی یہ آگ اصل میں مشرق والوں کی اختراع ہے کیونکہ ایشیائی لوگ اپنی لڑائیوں میں ایک قسم کا جلد بھڑک اٹھنے
والا مرکب استعمال کیا کرتے تھے، جسکی خبر یورپ والوں کو ساتویں صدی عیسوی سے پہلے نہ ہوئی تھی گمان ہے
ہے کہ کالینکوس نامی ایک شامی شخص نے اسی مشتعل ہونے والے مادہ کو اہل یورپ تک پہنچایا اور انہیں
اس کے استعمال اور بنانے کا طریقہ سکھایا۔ روم والے اس زمانہ میں اس کے سخت محتاج تھے، تاکہ اسکے
ذریعہ سے قسطنطنیہ وغیرہ اپنے شہروں سے جو یورپ اور ایشیا میں باقی رہ گئے تھے اہل عرب کو پرے رکھ
سکیں اور اس مرکب مشتعل ہونے والے مصالحہ کے دستیاب ہونے سے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے
اہل عرب نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کئی مرتبہ کیا، مگر اسی آگ کی وجہ سے اسے فتح نہ کر سکے رومیوں نے ان چیزوں کے
نام چھپانے میں بہت کوشش کی جن سے یہ مرکب بنتا تھا۔ یہانتک کہ اہل عرب خود ہی اس سے واقف ہو گئے اور
انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ روغن گندھک اور بعض روغنی اشیا اور تیلوں کے میل سے بنتا ہے جو سیال ہونے
کی وجہ سے ایک تانبے کے نل کے ذریعہ سے جسکو جہاز یا کشتی کے اگلے حصہ پر باندھ رکھتے تھے مخالفوں پر پھینکا
جاتا ہے اس سیال مادہ کو جلا کر پھینکتے تھے یا جلتے ہوئے بانوں کی شکل میں اسے پھینکتے تھے، یا کتان کے چیتھڑے
اسمیں تر کرکے اور آگ لگا کر جہازوں اور مکانوں پر پھینک مارتے جس سے وہ جل کر خاک ہو جاتے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس
آگ سے عبداللہ بن زبیر کو محاصرہ میں لیتے ہوئے حصین بن نمیر نے خانہ کعبہ کو جلا دیا تھا وہ اسی قسم کے مشتعل مادہ سے لگی تھی
"پیرس" کے مکتبۂ اہلیہ میں ایک قلمی مسودہ رکھا ہوا ہے جسپر کچھ عربوں کی تصویریں بنی ہیں کوئی انمیں
گھوڑے پر سوار ہے اور کوئی پیادہ انکے ہاتھوں میں چیتھڑے کے گدڑے یونانی آگ سے جلتے ہوئے موجود ہیں جنکو وہ
اپنے دشمنوں پر پھینک رہے ہیں (دیکھو شکل ۲۵) اور اہل عرب یونانی آگ کو پھینکا جانیوالا نفط کہا کرتے تھے۔

بارود کی ایجاد اس مقام پر ایک اعلے درجہ کی اختراع پائی جاتی ہے جسکے موجد ہونیکا فخر فرنگی
لوگوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ وہ چیز عربوں کی ایجاد ہے اس سے ہماری مراد بارود کا اختراع ہے اہل
فرنگ کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ بارود کا موجد ایک شخص "شوارتز" نام گذرا ہے جس نے ۱۳۲۰ء میں اس مصالحہ کو
ایجاد کیا مگر ایک انگریز پادری مسمی "روجر بیکن" نے جو تیرھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے ایک ایسے مرکب
مصالحہ کا ذکر کیا ہے جو بارود کی قسم سے اس کے زمانہ میں رائج تھا اور صحیح یہی بیان ہے کہ بارود کے استعمال کرنے میں اہل
عرب تمام لوگوں سے سبقت لے گئے ہیں اور اگر انہوں نے وہ ایجاد نہیں کی تو کم از کم اسمیں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا کہ انہوں
نے اس مادہ کو ایسی حالت تک ضرور پہنچا دیا تھا کہ وہ قرون وسطی میں اچھی طرح رائج و مشہور ہو گیا۔ سپین کے نامور مشرقی مورخ۔

"کانڈی" (المتوفی سنہ ۱۸۲۰ء) نے بیان کیا ہے کہ مراکش والوں نے سنہ ۱۱۱۸ء میں "سرقوسہ" کے باشندوں سے جنگ کرتے وقت آتشبار اسلحہ کا استعمال کیا تھا"۔

اسپر اتنی بات اور مستزاد کرنی چاہیے کہ عربی تواریخ اس امر کیجانب اشارہ کر رہی ہیں۔ کہ بلادِ مغرب میں جنگ کرتے وقت تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس قسم کے آتشبار اسلحہ استعمال کئے اس کیفیت کا صریح ذکر ہمیں "ابن خلدون" کے اس بیان میں ملتا ہے جو اُس نے ابی یوسف سلطان مراکش کے "سجلماسہ" کو فتح کرنے اور اس کو "بنی عبدالواد" کے ہاتھوں سے نکالنے کیلئے سنہ ۶۷۲ھ (سنہ ۱۲۷۳ء) میں چڑھائی کرنیکے متعلق لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے جبوقت سلطان ابو یوسف نے مغربی ممالک کو فتح کرکے وہانکے شہر اپنے مطیع و منقاد بنالئے اور بنی عبدالمومن کے دارالخلافت پر تسلط کرکے ان کو نیست و نابود کر ڈالا طنجہ کو فتح کرلیا مغربی شہر اور شرارت و فتنہ انگیزی کے بندرگاہ "سبتہ" کو مطیع کرلیا، تو اسوقت اُسے قبلہ رخ والے ملکوں کیطرف خیال کرنیکی نوبت آئی اور اُسنے قصد کیا کہ "سجلماسہ" کو فتح کرکے "بنی عبدالواد" کو جو اس ملک پر قابض و متصرف تھے وہاں سے نکالدے اور بجائے اُنکی حکومت کے اپنا اثر و اقتدار قائم کرے سلطان ابو یوسف تمام فوجوں اور بھیڑ بھاڑ کیساتھ رجب ۶۷۲ھ میں اسپر فوجکشی کرنیکو اٹھا اور اُسے جا گھیرا تمام اہل مغرب زناتہ عرب اور بربر کے لوگ اور اپنی ساری فوجیں کیا پیدل اور کیا سوار سب وہاں جمع کردیں ہر قسم کے آلات حصار لگادیئے منجنیقیں گردوں و نفط اندازی کے آلات اُنکے علاوہ ایسے آلات جو بارود سے مشتعل ہو کر نالی آگ کے ذریعہ سے لوہے کے ٹکڑے برساتے اور قدرت باری کا تماشہ دکھاتے تھے نصب کرکے کامل ایک سال تک صبح و شام اسپر دھاوے کئے مگر کوئی صورت کامیابی کی نہ نکلتی تھی۔ آخرکار پتھروں کی بوچھاڑ سے شہر پناہ کا ایک مختصر حصہ ٹوٹ گیا اور ایسی بےخبری میں ٹوٹا کہ شہر "سجلماسہ" کے لوگ اُسکے درست کرنیکی تدبیر بھی نہ کرسکے اور ابی یوسف کے سپاہی لپک کر شہر میں گھس گئے جسے انہوں نے بزور بازو فتح کرلیا۔

ابن خلدون کے مندرجہ بالا قول سے اس بات کی صریح شہادت ملتی ہے کہ بارود اہل عرب کے یہاں ایک مشہور چیز تھی اور وہ لوگ اس زمانہ سے نصف صدی قبل ہی اس کا استعمال اپنی لڑائیوں میں کرتے رہتے تھے جس زمانہ میں کہ اہل فرنگ "سودگش" کو اس کا موجد بتاتے ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل عرب نے بارود بنانیکی ویسی ہی ترکیب بیان کی ہے جیسی کہ آج کل پائی جاتی ہے۔ سینٹ پیٹرسبرگ دارالخلافہ روس کے کتبخانہ میں ایک قدیم عربی مسودہ موجود ہے جس میں دو عملوں کی



تصویر میں بنی ہیں جو آتشبار اسلحہ بنانے میں مصروف ہیں ایک شخص دائیں جانب ہے اور ہاتھ میں بندوق کی شکل کا ایک آلہ لئے ہے اس آلہ میں توڑا لگا ہے اور توڑے کے اندر بارود بھری ہے اس شخص نے اس توڑے کو ایک شعلہ سے جو اُسکے سامنے ہی قریب کر دیا ہے تاکہ بارود مشتعل ہو کر گولی کو دور پھینک دے۔



اسی مقام کے مناسب ایک سوار کی تصویر بنی ہے جو روئیں دار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نیزہ لئے ہے تاکہ ضرورت کے وقت انہیں روئی کو نوچ کر اور نفط میں تر کر کے دشمن پر پھینکا جا سکے اس سوار کے دونوں جانب دو پیدل آدمی ہیں ان دونوں شخصوں اور سوار کے گھوڑے کے جسم پر بھی ویسا ہی روئیں دار لباس ہے جو وقت حاجت نفط کیلئے استعمال ہو سکتا ہے۔

حالت جنگ میں فوجی نظام

تاریخ فوج کے بیان میں ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ متمدن قوموں کے یہاں فوجی نظام کی دو صورتیں تھیں یعنی سیدھی صفیں بنانا علیحدہ علیحدہ حصے کرنا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں کسی قاعدہ اور نظام کے پابند نہ تھے اُن کی جنگ اس قسم کی ہوتی تھی جسکو وہ "کر" اور "فر" سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اس طریقہ کا نام خود ہی اپنے معنوں کو عیاں کر رہا ہے کیونکہ جو وقت وہ لڑنے کیلئے تیار ہوتے تو یکایک اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور

حماۃ مسلمہ میمنہ کی اعانت اور اسکے انسداد خلل کیلئے — حماۃ مسلمہ قلب کی اعانت اور انسداد خلل کیلئے — حماۃ مسلمہ میسرہ کی اعانت اور انسداد خلل کیلئے

خندق — خندق

میمنہ کے سرے کا اگلے حصہ کا افسر | قلب اعظم کا سالار

میمنہ کے اگلے حصہ کے سردار کے ساتھی لوگ | سپہ سالار قلب اعظم کے ساتھی لوگ

صاحب المیمنہ کے ساتھی | بعض عام لوگ | بادشاہ کے بیٹے شہزادے

حماۃ | صاحب المیمنہ | اُن کے اتباع

حماۃ میسرہ | راس میسرہ کا افسر | راستہ صاف کرنیوالے یعنی سفر مینا کی پلٹنیں

فقہا اور منشی لوگ | بیگار وقت ضرورت بیلدار | عام لوگوں کے مرابط

خدم | خواجہ سراؤں کے مقدم | عام لوگوں کے مرابط | امیر حرس

شہزادے | قاضی | محتسب

میمنہ کی طرف سے کیمپ کا راستہ تیس قدم چوڑا اور طول خواہ کتنا ہی ہو

میسرہ کی طرف سے کیمپ کا راستہ تیس قدم چوڑا اور طول خواہ کتنا ہی ہو

حرس (سنتری) سوار اور پیدل

بادشاہ

حرس سوار اور پیادے

صاحب الحرس

اسپہبد	انخوان
اسپہبد کے ہمراہی	طبیب لوگ
صاحب الساقہ (ساقہ کا افسر)	کحال لوگ
افسر ساقہ کے ساتھی	براح لوگ
اُن کے اتباع	ہاتھی۔ اگر ہوں

خندق

	اسپہبد	صاحب مصلی
ہتھیار بنانیوالے	وہ افسر جو لوگوں کو بادشاہ کے روبرو پیش کرتا	صاحب الطریق (راہدار)
آزاد لوگ	علم بردار	نقارہ قرنا اور بوق بجانیوالے لوگ
صاحب المیسرہ	خواجہ سرا لوگ	نقارچی لوگ
صاحب المیسرہ کے ساتھی	دارجہ	راہ صاف کرنیوالے (سفر مینا پلٹنیں)

خندق

جب دیکھتے کہ انہیں کسی قسم کی کمزوری لاحق ہو رہی ہے تو فوراً بھاگ نکلتے اور پھر پلٹ کر حملہ کر دیتے اسی طرح
بلا کسی نظام اور ترتیب کے لڑتے رہے اسلام کا ظہور ہوا تو منجملہ اُس کے احکام کے ایک جنگ میں صفیں
مرتب کرنے کا بھی ہوا جو اس آیت میں مذکور ہے ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً
کانھم بنیان مرصوص۔ بیشک اللہ پاک اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں بنیان مرصوص
کی طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں یعنی جس طرح دیوار میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کی ممد ہو کر باہمی استحکام
کا باعث ہوتی ہے اسی طرح وہ لوگ ایک دوسرے کے استقلال و پامردی کا وسیلہ ہو جاتے ہیں جو قریب ملکر
سیدھی صفیں استادہ ہوں اور حدیث میں آیا ہے۔ المومن للمومن کالبنیان المرصوص یشد بعضہ
بعضاً۔ اسی بنا پر نبی صلعم کے عہد میں مسلمانوں کی لڑائیاں صف بندی کے ساتھ ہوا کرتی تھیں اور اسی
طریقہ کو "زحف" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ لوگ اس طرح سیدھی صف مرتب کرتے تھے جس طرح نماز
کیلئے سیدھی صفیں بناتے ہیں اور اسی انداز سے صفیں باندھے اور قدم ملائے ہوئے دشمن پر بڑھتے تھے۔

مسلمانوں کا بدوی قبائل کے ساتھ ایک ایسے نظام سے جنگ کرنا بھی جس سے وہ لوگ محض
ناآشنا تھے منجملہ اُن امور کے تھا جنکی وجہ سے مسلمانوں نے کرّ و فر والے عربی قبیلوں کو نیچا دکھایا اسبات کا
بڑے بڑے نامور فاتحوں کے حالات پر نظر غائر ڈالکر اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں مثلاً حضرت سلطان سلیم عثمانی اور
نپولین بوناپارٹ وغیرہ کی [illegible]
نئے نظام کے ذریعہ فتح کیا [illegible]

[illegible] اپنے جنگجو [illegible] اونٹوں [illegible] بار برداری [illegible] جانوروں کے جنہیں [illegible]
اور خیمہ وغیرہ کا بار کیا کرتے تھے شکست کھانے اور پیچھے دکھانے سے روکا کرتے تھے [illegible] ان کے
پیچھے صف بستہ کھڑا کر دیا کرتے تھے تاکہ اُن کیلئے سطح دم لینے اور آرام پانے کا موقع بجائے اس صف کو "مجہوزہ" کے
نام سے موسوم کرتے تھے یہ بھی ایک ایسی تدبیر تھی جو میدان جنگ میں ان کو ثابت قدم رکھتی تھی مگر مسلمانوں نے
باوجودیکہ زحف (صف بندی) کیساتھ ان کو ثبات کا فائدہ حاصل ہوتا تھا پھر بھی اپنے پیچھے عورتوں بچوں اونٹوں
اور سامان رسد وغیرہ [illegible] جنگ میں [illegible] تعداد لڑنے مرنے پر ہمت صابر رہتے تھے

زمانہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میں فوج اگر قلیل ہوتی تو ایک ہی ورنہ دو صفوں میں مرتب ہوا کرتی تھی
خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تو پھر ان کی کئی صفیں بننے لگیں اس صف بندی میں سپاہیوں کے اسلحہ اور انکی

خاص حالات پر لحاظ کر کے مقدم اور موخر صفیں بنائی جاتی تھیں۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر اس وصیت کا ذکر کرتے ہیں جو علیؓ کے مشہور جنگ "صفین" کے دن ۳۷ھ میں اپنے فوجی لوگوں کو فرمائی تھی اس وصیت کے مختصر ہی لفظوں سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں جنگ کیوقت فوجی نظام کی کیا حالت ہوتی تھی۔ علیؓ نے فرمایا تھا:۔

"اپنی صفیں سیدھی کرو انہیں مضبوط دیوار کی مانند بناؤ زرہ پوشوں کو آگے رکھو اور بے زرہ لوگوں کو پیچھے دانتوں کو بھینچ لو۔ کیونکہ یہ صورت (ہام) سے زیادہ تلواروں کی ضرب میں قوت پیدا کرنیوالی ہے نیزہ کی سنانیں باہم ملالو اس سے سنانوں کی حفاظت خوب ہوتی ہے آنکھیں نیچے کر لو اس سے دل خوب مضبوط رہتا ہے اور قلوب کو تسکین ہوتی ہے آوازیں پست رکھو اس لئے کہ یہ صورت ہزیمت اٹھانے کو دور بھگانیوالی ہے اور وقار کیلئے اولیٰ ہے اپنے نشانوں کو قائم رکھو انہیں جھکنے نہ دو اور جو لوگ تم میں بہت بہادر ہیں انکے سوا نشانوں کو کسی اور کے حوالہ نہ کرو۔ صدق و صبر سے مدد لو اس لئے کہ صبر ہی کے اندازہ سے فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے"

کرادیس اس کے بعد بنی امیہ کے زمانہ میں عربی فوجوں کی اور بھی کثرت ہوئی اور وہ اہل عجم سے ملے جلے تو انکا خیال "تعبیہ" کیجانب رجوع ہوا یعنے فوجی جماعتوں کو کرادیس کی شکل میں مرتب کرنے کا طریقہ اختیار کیا جنکی حالات ہم فوج کی تاریخ میں بیان کر آئے ہیں۔ کرادیس کی ترتیب یوں ہوتی تھی کہ اہل روم جنگ کے وقت اپنی فوجوں کے کئی حصے کر دیا کرتے تھے جنہیں یونانی زبان میں "کورتیس" کہتے تھے اس لفظ کے معنے ٹکڑہ یا فوجی جماعت کے ایک حصہ کے ہیں ہر ایک کردس کی کئی صفیں کر کے اُسے فوجی مربع کی شکل میں بنا لیتے تھے بادشاہ یا (کمانڈر انچیف) اعلےٰ سپہ سالار اور اس کے حاشیہ کے لوگوں مع نشانوں اور شعار وغیرہ کے ایک کتیبہ مقرر کر کے بیچ میں ایستادہ کرتے اور اُسے قلب کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس کتیبہ کے مقابل سامنے کی طرف ایک اور کتیبہ ہوتا جو کہ بظن غالب صرف سواروں سے مرتب و قائم کیا جاتا اس کا نام مقدمہ ہوتا بادشاہی کتیبہ کے داہنے طرف ایک کتیبہ "میمنہ" نامی اور اسی طرح بائیں طرف ایک کتیبہ "میسرہ" نام کا متعین ہوتا اور ایک ٹکڑا فوج کا سب سے پیچھے رہتا اسکو فوج کا ساقہ کہتے تھے جسکی صورت حسب ذیل ہوتی۔

میسرہ ۴	قلب الجیش ۳ مقدمہ ۱ (above) ساقہ ۵ (below)	میمنہ ۲

فوجوں کو اس طرح جمانے میں اس کے پانچ ٹکڑے ہوتے ہیں اسی وجہ سے فوج کو خمیس کے نام
سے بھی موسوم کیا جاتا ہے غرضیکہ اس صورت پر فوج مرتب ہو کے قدم ملائے صفیں درست کئے دشمن کی طرف چلا
کرتے تھے اور اکثر اوقات اپنے پیچھے کوئی اس قسم کا سامان کر لیا کرتے جو اُن کی پیشقدمی میں ثبات
و استقلال پیدا کر سکے جس طرح کہ اہل فارس جنگ کے میدانوں میں بہت سے ہاتھیوں پر ہودج اور عماریاں
بند ہوا کر ان میں طرح طرح کے ہتھیار اور لڑنے والے لوگوں کو بھر دیتے اور نشانات بھی اسی جماعت کے ساتھ ہوتے
اس گروہ کو وہ لوگ میدان جنگ میں اپنے پیچھے اسطرح رکھا کرتے تھے جیسے بہت سے قلعے ہوں اور انکے ذریعہ سے انکے
دلوں کو تقویت ہوتی تھی بعض اوقات اہل فارس شاہی تختوں کو اپنا جائے پناہ مقرر کر لیا کرتے اس کی یہ صورت ہوتی
کہ لڑنے والوں کے پس پُشت میدان جنگ ہی میں بادشاہ کا تخت نصب کیا جاتا شاہی خدم و حشم اور اسکے
حاشیہ کے لوگ اور بعض وہ فوجی افسر جو علاوہ بادشاہ کے فوج کا دل بڑھانے کا کام دیتے تھے یہ سب لوگ شاہی
تخت کو اپنے حلقہ میں لئے رہتے اس شکل سے شاہی تخت کی ہیکل میں ایک عجیب قسم کی عظمت پیدا ہو جاتی
اور وہ مقام لڑنے مرنے والوں کیلئے پناہ لینے اور ستانے کا ایک عمدہ موقع بنجاتا۔ اکثر حالتوں میں عجمی بستہ بند
بھی کر و فر کے ساتھ لڑا کرتے تھے اور اپنی سپاہ کے پیچھے اسی طرح کی جائے پناہ بنا لیا کرتے جنکے
اقسام کا شمار کرنا دشوار ہے' رومیوں اور فارس والوں سے جنگ چھیڑ کر اہل عرب کو اکثر میدانوں میں اس
بات پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ بھی انہیں کے طریقہ سے جنگ کریں اسکی ایک مثال یہ ہے کہ خالد بن ولید نے
۱۳ھ میں مشہور واقعہ یرموک کے وقت یہ طرز اختیار کیا اور انہوں نے اہل عرب کی فوجوں کو اس
شکل سے میدان میں جمایا کہ وہ اس سے پہلے کبھی اس طرح مرتب نہ ہوئی تھی خالدؓ نے اپنی فوج کے (۳۶) سے
(۴۰) تک کردوس بنائے قلب کو کئی حصوں میں بانٹ کر اس کا افسر ابا عبیدہؓ بنایا میمنہ کے کئی ٹکڑے کرکے اسپر
عمرو بن العاص اور شرجیل بن حسنہ کو سردار کیا اور میسرہ کے کئی اجزا کر کے اسپر یزید بن ابی سفیان کو
افسر بنا دیا الخ اور ۱۴ھ کی جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاصؓ نے بھی اسی ترتیب سے کام لیا تھا۔

مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عرب نے اس ترتیب کا برتاؤ رومیوں سے لڑنے کیلئے انکے بالمقابل مجبوراً کیا
تھا اور دراصل اپنی جنگوں کا اصول تعبیہ کے ساتھ فوجوں کا مرتب کرنا مروان بن محمد بن امیہ کے آخر خلیفہ کے
وقت ۱۲۸ھ میں قرار دیا کیونکہ اسی خلیفہ نے صفوں کو توڑ کر "کرادیس" کو منظم کیا اور یہ اصول اختیار کرنیکے بعد پہلے
"ضحاک" خارجی اور بعدہٗ "خیبری" سے لڑا صفوف کے اصول کو باطل کر دینے کے بعد رفتہ رفتہ "زحف" کا

قاعدہ لوگوں کو بھول گیا اور اس کے بعد لڑنے والوں کے پس پشت کسی زائد صف کا رکھنا بھی اسلامی حکومت میں عیش پسندی کا دخل ہونے کی وجہ سے سٹ گیا شدہ شدہ اہل عرب میدان جنگ میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لیجانا بھی ترک کرنے لگے یہاں تک کہ آخر کار بالکل چھوڑ بیٹھے۔

علاوہ ازیں بعض ان دعویداران خلافت نے جو اہلبیت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تھے صف بندی کے اصول کو ترک کر کے "کرادیس" کا نظام اختیار کرنا اسلام میں بدعت پھیلانا سمجھا وہ صفوں کیساتھ "زحف" کو اچھا سمجھ کر اسی پر قائم رہے گو اسکا نتیجہ اُنکے حق میں خطرناک ہی کیوں نہ ثابت ہوا اس امر کا شاہد قصہ ہے جو ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن علی بن ابیطالب کیجانب منسوب ہے۔ جسوقت خلیفہ منصور عباسی نے عیسیٰ بن موسیٰ کو انکے مقابلہ پر روانہ کیا اور یہ دونوں حریف کوفہ سے ۱۶ فرسخ کے فاصلہ پر مقام "باخمرا" میں متقابل ہوئیں تو امام ابراہیم کو انکے کسی دوست نے صلاح دی کہ وہ اپنی فوجکو کرادیس میں مرتب کریں کیونکہ کرادیس بحالت جنگ زیادہ ثابت قدم رہتے ہیں اگر ایک کردوس کو شکست ہوجائے تو اس کی جگہ پر دوسرا کردوس جم سکتا ہے لیکن صفوں میں یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی اگر اس کا ایک حصہ بھی منہزم ہو تو سب کی سب پامال ہوجائے۔ اس نیک صلاح کے جواب میں خود ابراہیم اور اُسکے تمام رفقا نے کہا ہم اہل اسلام کی صف بندی کے علاوہ کسی اور صف بندی کو اختیار نہیں کرینگے۔ اس سے انکی مراد اس آیت کا حکم تھا "ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ ....الآیۃ" مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کو زک ملی اور تباہ و برباد ہو گئے۔

مسلمانوں نے مدنیت میں رسوخ حاصل کرنیکے بعد دیگر اقوام کے فنون جنگ میں تفنن بھی کیا اور انکی کتابوں کا ترجمہ کرنے اور انہیں پڑھنے کے بعد اس صیغہ میں بہت سے جدید طرز اور اصول رائج کئے مسلمانوں کے یہاں فوجی تعبیہ کی قسمیں متعدد ہوگئیں یہانتک کہ سات شکلیں قائم ہوئیں اگرچہ وہ ان تمام صورتوں کو ایک ساتھ نہیں برتتے تھے تاہم انہوں نے انکو اپنے فنون جنگ میں داخل ضرور کر لیا تھا۔ پہلا تعبیہ یہ تھا کہ فوجکی ترتیب ہلال کی شکل پر کیجاتی تھی کہتے ہیں کہ قدیم اہل فارس نے ہلالی ترتیب کی دو قسمیں بنائی ہیں ایک سیدھا ہلال یا نوکدار ہلال یہ صورت بہت آسان اور سادہ ہی جیسے آسمان کا چاند ہوتا ہے۔

دوسری ترتیب ہلال مرکب کی اس کی یہ صورت تھی کہ ہلال کے دونوں طرف بھی دو ہلال نما صفیں بنائی جاتیں گویا اسکے دو بازو ہیں تیسرا تعبیہ مربع مستطیل ہوتا اور چوتھا اُلٹے ہلال کی وضع کا ( ) پانچواں تعبیہ تھا کہ فوج کو معین ٹھیک مربع کی شکل میں منتظم کیا جاتا چھٹا تعبیہ مثلث △ اور ساتواں دائرہ نما دو حصہ کی شکل پر یعنی دو دائرے اسطرح ہوتے کہ ایک دوسرے کے اندر بنایا جاتا یہ آخری قسم کا تعبیہ اسوقت اختیار کیا جاتا جبکہ اُن کی فوج قلیل اور غنیم کی سپاہ بہت زیادہ ہوتی۔ اور یہ تعبیہ اس تعبیہ سے ملتا جلتا ہی جو متمدن لوگوں نے

تفنن کر لیتے کرتے سب سے آخری اور مکمل تعبیہ دریافت کیا ہے اس سے ہم وہ تعبیہ مراد لیتے ہیں جو کہ بوناپارٹ نے قائم کیا تھا اور جس کے ذریعہ سے اسنے تمام ملکوں کو پامال کر ڈالا اور جو آج کل کی تمام منتظم فوجوں کا بہترین نظم ہے

مسلمان لوگ فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیتے تو اسے کرادیس یا مربعوں یا مثلثوں کی صورت میں ترتیب دیتے اور یا فوج کا کچھ حصہ کرادیس کی شکل میں رکھتے اور کچھ حصہ کو مربع یا ہلالی یا معین یا مثلث کی صورت پر مرتب کرتے جیسا موقع ہوتا یا جیسی حالت پیش آتی ؛

فوجی کمپ اوائل اسلام میں نظم و ترتیب لشکر کا کوئی خاص علم نہ تھا بلکہ اہل عرب اپنے خیموں کے نصب کرنے میں اور انکو ترتیب دینے میں اسی ڈھنگ پر چلتے تھے جیسے وہ زمانہ جاہلیت میں چلتے آئے تھے امیر کا بڑا خیمہ وسط میں ہوتا تھا اور اس کے گردا گرد ماتحت افسروں اور خاص لوگوں کے خیمے نصب ہوتے تھے اگر ان کے ساتھ عورتیں اور بچے ہوتے تھے تو ان کو پڑاؤ کے پیچھے ٹھہراتے مگر جب انہوں نے بال بچوں کا ساتھ رکھنا ترک کیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تو انہوں نے کمپ قائم کرنے میں روم اور فارس والوں کی پیروی اختیار کی اور حسب اقتضائے حالات اس میں تفنن بھی کیا اور جس زمانہ میں فوجی فرقوں کی تعداد بڑھ گئی حاشیہ کے لوگوں اور غلاموں کی کثرت ہوئی تو فوجی کمپ نے ایک خاصے بارونق و آباد شہر کی صورت حاصل کر لی جسمیں فوجی سپاہیوں کے اقسام کے علاوہ منشی عالم طبیب کحال اور طبل بجانیوالے (نقارہ نواز) اور اتباع وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے جیسا شکل ۲۸ سے معلوم ہو سکتا ہے اور یہ نقشہ اسلامی عہد میں فوجی کمپ کا سب سے بڑھیا ترقی یافتہ نظام کا ہے ؛

فوجی قواعد اور شعار

فوجی قواعد اوائل اسلام میں جسوقت فوج جنگ پر آمادہ ہونے کو ہوتی تو اسکے سردار "النفیر النفیر" کی آواز دیتے تھے یہ صدا ان کے محاورہ میں حملہ کرنے کی علامت تھی جس طرح آجکل مصر کے فوجی افسر ایسے موقعہ پر پہلے "ہجوم حاضر ال" اور پھر صرف لفظ "ہجوم" کی صدا لگاتے ہیں اور اگر سپاہ کو جنگ سے باز رکھنے کی ضرورت ہوتی تو اہل عرب "الرجعۃ الرجعۃ" کہتے تھے جس کی جگہ ان دنوں ملک مصر میں "جریہ" کا لفظ بولا جاتا ہے سوا ان کے

سلہ اسلامی کمپ کے لئے دیکھو نقشہ نمبر ۱ ؛

لڑنے پر تیار ہونیکا اشارہ کرنا مقصود ہوتا تو "الخیل الخیل" کی ندا دیجاتی تھی اس غرض کے لئے بصری فوجوں میں پہلے "بین یا یہ حاضر ال" اور اسکے بعد صرف لفظ "بین" کا استعمال ہوتا ہے جبکہ منظور ہوتا کہ سوار لوگ گھوڑوں سے اتر آئیں تو "الارض الارض" کہتے اس کی شمال بصری افواج میں "این یا یہ حاضر ال" اور اسکے بعد تنہا لفظ "این" کا استعمال کرتا ہے جب اہل اسلام متمدن قوم کی حیثیت میں آئے اور انکی فوج کے مختلف حصے اور قسمیں نکلیں اور فوجی حرکتوں کی جدا جدا شکلیں قائم ہوئیں تو انہوں نے ہر ایک حرکت کے لئے ایک خاص ندا مقرر کی جسکا لفظ اپنے معنے اور مراد پر دلالت کرتا تھا ان صداؤں کے نام حسب منسجہ ذیل ہیں

(۱) المیل (۲) الانقلاب (۳) الانفتال (۴) تسویۃ الانفتال (۵) استدارۃ صغری (۶) استدارۃ کبری (۷) تقاطر (۸) اقتران (۹) رجوع الی الاستقبال (۱۰) استدارۃ مطلقۃ (۱۱) اصعاف (۱۲) اتباع المیمنہ (۱۳) اتباع المیسرہ (۱۴) جیش منحرف (۱۵) جیش مستقیم (۱۶) جیش مورب (۱۷) رص (۱۸) تقدم (۱۹) حشو (۲۰) رادفہ (۲۱) ترتیب بعد ترتیب۔

جسوقت فوجی افسر کا ارادہ ہوتا کہ اپنی فوج کو کسی طرف مائل کرے یا اسے کوئی خاص صورت ان صورتوں میں سے اختیار کرائے وہ انہیں کلمات میں سے ایک کلمہ پکار دیتا اور فوجی سپاہی جو ان کلمات کے معنے اور مراد سے واقف ہو چکے ہوتے تھے فوراً وہی حرکت اور شکل اختیار کر لیتے جس طرح آجکل کی فوجیں کرتی ہیں اسکے کچھ مدت بعد ان سب کلموں کو صرف دو کلموں میں مختصر کر دیا جو حسب ذیل ہیں:۔

"ہوتجوا" اور "ہو تبا" اور اپنی مراد کے پورا کرنے میں اشاروں سے مدد لیا کرتے تھے اسلئے فوجی سپاہیوں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسر کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہیں جس وقت وہ کسی طرف پھرے خود بھی اسی کے ساتھ پھر جائیں ان دونوں لفظوں کی تشریح یوں کیگئی ہے "ہوتجوا" سے مراد ہے کہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاؤ اور "ہو تبا" سے اسکے برعکس؛

فوجی شعار ایام جاہلیت میں عرب نے چند خاص لفظ مقرر کر رکھے تھے جنکے ذریعے سے وہ حالت جنگ و پیکار میں اپنے موافق اور طرفدار شخص کو شناخت کیا کرتے ان الفاظ کا نام "شعار" تھا وہ الفاظ معین نہیں تھے بلکہ حالت اور ضرورت کے مطابق ایک لفظ کو اپنی اصطلاح ٹھہرا لیا کرتے؛ جنگ "احد" کے دن کفار عرب کے قبائل کا شعار "یا للعزی یا لھبل" کا کلمہ تھا حیرہ میں مذحج کے قبیلہ ازد کا شعار "یا آل عباد اللہ" مقرر ہوا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار میں سے ہر ایک کیواسطے ایک علیحدہ شعار مقرر فرما دیا تھا

مہاجرین کا شعار تھا۔ "یا بنی عبدالرحمن" قبیلہ اوس (انصار کا ایک قبیلہ) کا شعار تھا۔ "یا بنی عبید اللہ" اور خزرج (انصار کا دوسرا خاندان) کا شعار "یا بنی عبداللہ" تھا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے خیل کو "خیل اللہ" کے نام سے موسوم فرمایا تھا۔ اسکے بعد اہل اسلام اپنی فوجوں کے مختلف شعار مقرر کرتے رہے جنکے ذریعہ سے وہ اپنے لوگوں کو باہم پہنچانتے تھے اور یہ شعار اسی انداز پر مقرر کیے جاتے جس طرح اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

ثغور اور عواصم

اس سے اسلامی مملکت کی برّی اور بحری حدود مراد ہیں بیانات مندرجہ بالا میں دیکھا گیا ہے کہ اہل عرب ملک شام کی فتح کیلئے بڑہے تو انہوں نے پہلے ملک شام کے اس خشکی کے حصّہ کیطرف سے پیشقدمی کی جو صحرا سے متصل "حوران" کی سمت میں واقع ہے چونکہ رومیوں کی بڑی قوتیں زیادہ تر ساحلی شہروں میں ہی تہیں اسلئے اہل عرب نے اپنی فتوحات کو برّ سے بحر کی جانب بڑہانا اور پھیلانا شروع کیا اور ملک کے اصلی باشندوں پر غلبہ حاصل کرنیکے بعد رومیوں کو بھی زیر کر لیا۔ دمشق کو فتح کر لینے کے بعد وہ لوگ ساحل کیجانب بڑہے جو اسلامی فوجیں ساحلی مقامات کیطرف بڑہی تہیں اُن کے افسر یزید بن ابو سفیان اور انکے بھائی "معاویہ" تھے یہ فوجکشی اس زمانہ میں ہوئی جبکہ دمشق پر "ابو عبیدہ" حکمران تھے یزید بن ابی سفیان نے حملہ کرکے بیروت صیدا اور جبیل کو فتح کر لیا۔ مگر چند روز کے بعد اہل روم نے پلٹ کر پھر ان مقامات کو مسلمانوں سے واپس لے لیا جس کی وجہ یہ تھی کہ روم والوں کی بحری قوت بہت بڑہی ہوئی تہی یہ مقامات زمانہ دراز تک برابر رومیوں ہی کے قابو میں رہے جبکہ حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے اور امیر معاویہ ان کیطرف سے ملک شام کے عامل تھے تو انہوں نے "طرابلس" وغیرہ مقامات کو فتح کیا۔ معاویہ بحری جنگ کے بہت شائق تھے اور عثمانؓ اس جنگ سے اسی طرح ڈرتے تھے جسطرح خلیفہ عمر بن الخطابؓ۔ معاویہ نے عثمانؓ سے بہت کچھ الحاح و اصرار کے بعد آخر کار بحری جنگ چھیڑنے کی اجازت حاصل کر لی اور اسوقت ملک شام کی سرحدیں (دریا کے ساحلی شہر) مسلمانوں کے قابو میں آئے عرب لوگ چاروں سمت سے آن آن کر ان شہروں میں آباد ہونے لگے اور بہت سے مسلمان وہاں مقیم ہو گئے خلفائے راشدین کے عہد میں ثغور (سرحدیں) شام۔ انطاکیہ وغیرہ وہ ساحلی مقامات تھے جنکو خلیفہ رشید عباسی نے "عواصم" کے نام سے موسوم کیا۔ اہل اسلام عواصم سے پہلی طرف کے مقامات پر حملے کرتے رہتے تھے

"اسکندرونہ" اور "طرطوس" کے مابین چند قلعوں میں تھوڑے سے بہت اہل روم باقی رہ گئے تھے بنو امیہ نے اپنی حکمرانی کے زمانہ میں ان مقامات کو بھی فتح کر لیا سرحدی مقامات کی آبادی اور رونق عباسی خاندان کے دور میں بہت بڑھ گئی اور وہاں بہت بڑی تعداد محافظ سپاہ کی معہ سامان جنگ کے اس غرض سے رکھی جانے لگی کہ رومیوں کی لوٹ مار کو روک سکے کیونکہ وہ لوگ عرب والوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے پر آمادہ رہتے اور موقع پاکر نہایت سخت قتل و غارت کر جاتے تھے اہل عرب نے ان مقامات پر بہت سے پائدار جدید قلعے بنائے اور ان قلعوں کی بھی مرمت کرائی جو رومیوں کے بنائے ہوئے تھے اور وہاں کے باشندوں کو بخشش وظائف میں بڑی بڑی رقمیں مقرر کر کے ان کو جہاد کا حکم دیا۔

اسلامی مملکت کی سرحدوں پر جتنی خشکی میں واقع تھیں انہوں نے ایسا ہی کیا کوئی ایک مضبوط شہر چن کر انہیں سرحدی شہر بنا دیا ان میں فوجیں رکھیں اور اسلحہ خانے بھی متعین کئے تاکہ وہ سپاہ غنیم کے حملوں کو روکنے کے کام آئیں اور وقتاً فوقتاً دشمنوں پر خود بھی جہاد کیا کریں۔

بنابریں اسلامی ممالک کی سرحدیں بعض اہل روم کے محاذی اور کچھ اہل فارس کے برابر میں واقع تھیں اور جو سرحدیں رومیوں کے مقابل واقع تھیں ان میں سے کوئی مقام سمندر کی طرف رومی ممالک سے متصل ہوتا تھا اور کوئی خشکی کی جانب اور بعض مقامات ایسے تھے جہاں خشکی اور تری دونوں سمتوں سے اہل روم کے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔

بحری حدود مطلق طور پر مصر اور شام کے سرحدی مقامات تھے اسلئے اگر ہم شمال کی طرف سے شامی حدوں کو گننا شروع کریں تو سب سے پہلے طرطوس اسکے بعد اذنہ پھر مصیصہ، عین زربہ، کنیسہ، ہارونیہ بیاس اور نقابلس وغیرہ مقامات واقع ہوتے ہیں ان تمام مقامات کی آمدنی ۰۰۰۰۰ا دینار ہوتی تھی جو انہیں کی ضرورتوں اور کاموں مثلاً فوجی تنخواہوں قلعوں اور شہر پناہوں کی مرمت اونٹوں اور گھوڑوں کے رکھنے بنوانے اور جدید قلعوں کی تیاری وغیرہ امور میں یہ سب رقم خرچ کی جاتی تھی اس میں سے بچا کر بیت المال میں کچھ بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی فوج کی تنخواہیں بیت المال سے ادا کرنی پڑتی تھیں مصری سرحدی مقامات میں بلاد فرما، عریش، دمیاط اور اسکندریہ شمار ہوتے تھے۔

شمالی سمت کی شامی سرحد سے وہ سرحدی مقامات بھی متصل تھے جنکو جزیرہ عراق کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے "جزائری" کہتے تھے ان میں سب سے پہلا مقام "مرعش" تھا اسکے بعد "الحدث" اور الحدث کے بعد شمیشاط" کی ثغور تک مسلسل بہت سے قلعے چلے گئے تھے اور شمیشاط کے بعد ملطیہ (ملاطیا) واقع تھا ان

سرحدی ممالک کی سالانہ آمدنی "مالی" کی آمدنی سمیت ۷۰۰۰۰ دینار ہوتی تھی، جس میں سے ۴۰۰۰۰ دینار سالانہ انہیں مقامات کی ضرورتوں میں صرف ہو جاتا اور ۳۰۰۰۰ دینار باقی بچتے جنہیں ۱۷۰۰۰۰ دینار اور ملا کر پورے دو لاکھ دینار کی رقم ان اولیاء اللہ اور گداگروں کے مصارف میں اٹھتی تھی جو وہاں رہتے تھے جہاد کیلئے جو فوجیں روانہ ہوتیں ان کے اخراجات اس کے علاوہ تھے، مذکورہ بالا سرحدیں ہی جہادوں کے واقع ہونیکا ذریعہ تھیں، ان ثغور کے عواصم (صدر مقامات) "دلوک" "رعبان" اور "منبج" تھے اور جو سرحدیں مشرقی سمت میں ممالک ہند سے ملتی تھیں ان کے بیان ہم سے بخوف طوالت قطع نظر کرتے ہیں۔

غزوات

سرحدات متذکرہ بالا اسلامی ممالک کی حدود تھیں انہیں کو سنہ ۱۷۰ میں ہارون الرشید عباسی نے جزیرہ اور قنسرین سے توڑ کر ان کا نام "عواصم" رکھ دیا اہل اسلام ہر سال ان مقامات سے خشکی اور تری میں جہاد کرنے کو نکلا کرتے اور اشاعت اسلام کیلئے سعی کیا کرتے تھے، جہاد مسلمانوں پر فرض تھا اور خلفا ان کو اس کا خیال دلاتے رہتے تھے، جس کی مثال ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے "لا یدع احد منکم الجہاد فانہ لا یدع قوم الا ضربہم اللہ بالذل" یعنے اے اہل اسلام تم لوگوں میں سے کوئی شخص جہاد کو ترک نہ کرے کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں جو جہاد کو چھوڑ دیتی ہو اور اللہ پاک اسے ذلیل و خوار نہ کر دیتا ہو۔ یہ فقرہ خلیفہ ممدوح نے اپنے خلیفہ مقرر ہونے کے دن فرمایا تھا بحری غزوات کی یہ صورت تھی کہ مسلمانوں کے جہاز سواحل مصر و شام پر اکٹھے ہو کر جزیرہ قبرس میں باہم ملجاتے ان جہازوں کی تعداد ۵۰ اور ۱۰۰ کے مابین ہوتی تھی، جس قدر جہاز قبرس میں مجتمع ہوتے انکو "اسطول" (بیڑہ) کہتے تھے اور "اسطول" کی کمان ثغور شام کے جہازی افسر کے حوالہ ہوتی جس زمانہ میں بیڑہ مصر اور شام کے سواحل پر جنگ میں مصروف رہتا تھا اسوقت اس کے مصارف میں ایک لاکھ دینار خرچ ہوتے تھے،

اہل عرب کے غزوات فصلوں اور موسموں کے اعتبار سے معین ہوتے تھے کوئی غزوہ "صیفی" ہوتا (موسم گرما کا) تو کوئی "شتوی" (ایام سرما کا) اور کسی کو "ربیعی" (موسم بہار کا) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ربیعی غزوہ ماہ "ایار" (مئی کی دسویں تاریخ کو واقع ہوتا تھا یعنے جبکہ مسلمان اپنے چارپایوں کو موسم بہار میں خوب چاچکا چکتے اور ان کے گھوڑوں کی حالت عمدہ ہو جاتی تھی، اسکے بعد وہ لوگ جہاد پر نکلتے تیس دن تیس دن یعنے دس "یونیو" (جون) تک وہ لوگ جہاد میں مصروف رہتے گویا اس زمانہ میں ان کو روم میں گھاس کثرت سے مل سکتا تھا جس کی وجہ سے ان کے گھوڑے دوسری بار موسم بہار کا لطف اٹھا لیتے تھے اور خوب چرا کر لیتے تھے

اہل اسلام جنگ وجہاد بند کر دیتے اور ۲۵ دن یعنی ۵ "تموز" (جولائی) تک مقیم رہتے پھر اس عرصہ میں انکے گھوڑے تر و تازہ اور قوی ہو جاتے تو "صیفی" غزوہ کے لئے مجتمع ہو کر دسویں تموز (جولائی) کے بعد سے جہاد میں مصروف رہتے اور اسکے بعد سے اپنے تفوں (جہاد سے رکے رہنے) کے وقت تک کوئی ساٹھ دن اسی حالت پر قائم رہتے بعض سالوں میں موسم گرما کے اندر دو بار غزوہ کرتے اور ان حملوں کا نام "صائفۃ الیمنیٰ" اور "صائفۃ الیسریٰ" رکھتے ہیں۔

جاڑوں کے موسم میں وہ لوگ بہت کم جہاد کیا کرتے اور بیس راتوں (دن) سے زیادہ اس میں مصروف نہیں رہتے اور زیادہ دور بھی نہ جاتے تھے یہ حملہ شباط (فروری) کے آخر میں ہوا کرتا اور غازی لوگ شروع اذار (مارچ) تک دشمنوں کے ملک میں پڑے رہ کر اپنے ملک میں واپس آجاتے اور اپنے گھوڑوں کو موسم بہار میں آرام دیتے

اس بیان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمان خلفا نے صرف اپنی قلمرو کی حفاظت ہی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ وہ ممالک متصلہ پر حملہ آور ہوتے رہنا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے اور یہ صورت خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے قسم تھی جیسے کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس جہاد کے معاملہ میں بنو عباس کا شوق تمام خلفاء سے بڑھ کر دیکھا جاتا ہے ان کو اطمینان کے ساتھ حکومت کرنا نصیب ہوا اور اسلامی مملکت پوری طرح انکے تابع فرمان ہو گئی تو انہوں نے معاً غزا (جہاد) کی جانب توجہ کی اپنی حکومت کے اوائل میں ہر سال اپنے یہاں کے ایک یا چند سپہ سالاروں کو اہل روم سے جہاد کرنے کیلئے اسطرح بھیجتے رہتے جس طرح کہ حاجیوں کی جماعت حج کیلئے روانہ کیا کرتے تھے اس کے بعد بذات خاص رومیوں پر حملہ کرنے میں شریک ہونے لگے ۱۶۳ھ میں خود خلیفہ مہدی عباسی نے رومیوں کے ملک پر حملہ کیا اور ۱۶۵ھ میں اپنے بیٹے رشید کو ۹۵۷۹۳ سپاہیوں کے ساتھ روم والوں سے جہاد کرنے کیلئے روانہ کیا۔ رشید اپنی جرار فوجوں کو لئے ہوئے رومی ممالک میں گھستا ہوا اور راستہ میں رومی لوگوں کے "مسالح" پر گذرتا ہوا خلیج قسطنطنیہ تک جا پہنچا۔ راہ میں جس قدر قلعے رومیوں کے ملے وہ سب پامال ہو کر مسلمانوں کے قابو میں آ گئے مگر ان مقامات کے سرداروں نے ۱۹۳۴۵۰ دینار اور ۲۱۴۰۸۰۰ درہم نذر کر کے مسلمانوں کو صلح پر رضامند کر لیا اور اپنی بستیوں کو بچا لیا رشید بڑھتا ہوا جب قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گیا تو وہاں کے باشندے سخت خائف ہوئے اس زمانہ میں "ایرینی" قسطنطنیہ کے تخت پر جلوس فرما تھی اس لئے رشید سے ستر ہزار دینار سالانہ فدیہ ادا کرتے رہنے کی شرط پر صلح کر لی اور یہ بھی شرط قرار پائی کہ رشید کی واپسی میں رہبر دیئے جائیں گے اور راہ میں قیام کرنے کے مقامات پر بازار کھلوا دیئے جائیں گے۔ تاکہ اسلامی فوج اور مسلمان خلیفہ کو کسی چیز کی تکلیف نہ ہو اس صلح کی میعاد

تین سال تھی اس حملہ میں مسلمانوں کو علاوہ رقوم متذکرہ بالا کے ۳۴۵۶ نفر اسیران جنگ بیس ہزار سات
چارپائے اور ایک لاکھ پاس گائیں اور بکریاں بھی غنیمت میں ملیں اور صرف اسی ایک غزوہ میں ۴۵ ہزار
رومی علاوہ قیدیوں کے ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اسیقدر بیان کر دینا اس امر کی توضیح کیلئے کافی ہے کہ
مسلمانوں کو جہاد کی رغبت کیونکر زیادہ ہوتی تھی :-

جنگی جہازوں کے بیڑے

دریائی سفر | اہل عرب اسلام سے قبل دریائی سفر کے عادی تھے البتہ "تبابعہ" بادشاہوں کے عہد میں
جو حمیر اور سبا کے گھرانے سے تھے کچھ کشتیاں ان کے یہاں تھیں وہ بھی محض اس وجہ سے کہ یہ لوگ خشکی اور
تری دونوں میں کاروبار تجارت کیا کرتے تھے حجازی عرب ہمیشہ سے دریائی سفر کرنے میں خائف ہوتے چلے آئے
تھے اور ان کو اس سفر میں قدم رکھنے کی جرات نہیں پڑتی تھی چنانچہ بدوی لوگوں کی آجتک یہی حالت ہے ظہور اسلام
کے بعد مسلمانوں کے نشانات حکومت مصر اور شام کے سواحل پر لہرانے لگے اور انہوں نے اہل روم کے جنگی
جہازوں اور انکی دریائی جنگ کا مشاہدہ کیا تو ان کے دل بھی دریا میں جہاد کرنے کے لئے گدگدائے مسلمانوں میں
سب سے اول جس شخص نے دریا کا سفر کیا وہ "علاء ابن الحضرمی" تھے جو عمر بن الخطاب کے عہد خلافت میں بحرین کے عامل
تھے انہوں نے سواحل فارس کو فتح کرنے کی خواہش کی لیکن چونکہ خلیج فارس کے بیچ میں حائل ہونے کیوجہ سے
ان کو سواحل مذکورہ تک پہنچنا بغیر دریائی سفر کے ناممکن تھا لہذا وہ جہازوں کے ذریعہ سے اس خلیج کو عبور
کر گئے انہوں نے عمر رض سے اس امر کی اجازت نہیں لی تھی اور ان کو اپنے حملہ میں فتح بھی نصیب نہیں ہوئی۔
اسلئے عمر رض کو انکا خود مختارانہ حیثیت سے یہ کام کرنا ناپسند ہوا اور خلیفہ ممدوح نے ان کی سزا یہ تجویز فرمائی کہ وہ امیر کرد سعد
بن ابی وقاص" کے ماتحت ہیں عمر رض نے مسلمانوں کو دریائی سفر سے روکنے میں نہایت سختی سے کام لیا تھا معاویہ
بن ابی سفیان دمشق اور اردن کی افواج کے کمان افسر جنرل بہت عالی حوصلہ اور بلند خیال شخص تھے انکو روم
کے اس پار والے ملکوں پر حملہ آور ہونیکے شوق سے عمر رض سے دریائی سفر کی اجازت لینے پر بار بار تقاضا کیا خلیفہ ممدوح
انکی درخواست کی منظوری سے انکار کیا اسپر معاویہ نے اصرار کیا تو خلیفہ کی خدمت میں سود مند معاویہ نے بطور پر لکھ
بھیجا خلیفہ ممدوح نے "عمرو بن العاص" ملک مصر کے امیر سے یہ خواہش کی کہ وہ دریائی سفر کی کیفیت کا خاکہ

تحریر کریں اور ایک خط بھیجکر اُن سے اس سفر کی ٹھیک ٹھیک حالت کا اندازہ لینا چاہا جس کے جواب میں امیر مذکور نے حسب ذیل تحریر بھیجی۔ امیر المومنین میں نے دریا کی یہ حالت دیکھی ہے کہ وہ گویا ایک بہت بڑی مخلوق ہے جسپر چھوٹی مخلوق (انسان) سوار ہوتا ہے وہاں آسمان اور پانی کے سوا کچھہ نظر نہیں آتا، اگر پانی گدلا ہوتا ہے تو دلوں کو غمگین بنا دیتا ہے اور تلاطم میں آتا ہے تو ہوش اُڑا دیتا ہے اسمیں یقین کی کمی اور شک کی زیادتی بڑھ جاتی ہے انسان کی دریائی سفر میں ایسی حالت ہوتی ہے جیسے ایک لکڑی پر کیڑا بیٹھا ہو اگر وہ لکڑی اُلٹ پلٹ جائے تو کیڑا ڈوب جائیگا۔ اور وہ لکڑی سلامتی سے کنارے جا لگے تو کیڑا خوشی سے چمک کر اُڑ جائیگا، عمرؓ کے پاس تحریر پہنچی تو انہوں نے معاویہ کو لکھ بھیجا اُس ذات پاک کی قسم ہے جسنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حق کیساتھ مبعوث کیا ہے میں ہرگز دریائی سفر میں ایک مسلمان کو بھی نہ بھیجونگا مگر عثمانؓ کی خلافت کا دور آیا تو انہوں نے معاویہ کا اصرار دیکھہ کر ان کی درخواست منظور کر دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ دریائی سفر میں جہاد کرنے کیلئے جانا اختیاری فعل رہے جسکا دل چاہے جائے جس کا دل نہ چاہے نہ جائے اس اجازت کے بعد ۲۸ھ میں معاویہؓ دریا کی راہ سے قبرس پر حملہ آور ہوئے جزیرہ مذکور کے باشندوں نے ۷۲۰۰ دینار سالانہ ادا کرتے رہنے کے اقرار پر امیر مذکور سے صلح کرلی یہ سب سے پہلا حملہ تھا جو مسلمانوں نے دریائی سفر کے ذریعہ سے کیا اور چونکہ اس میں اُن کو فتح مندی نصیب ہوئی اسلئے اُن کے شوق کی آگ زیادہ بھڑک اُٹھی اور اسکے بعد سے وہ دریائی جنگوں میں بخوبی حصہ لینے لگے اسکے واسطے بھی انہوں نے گرمی اور سردی کے موسم میں خاص خاص اوقات اسی طرح مقرر کر لئے جیسے کہ خشکی میں حملہ کرنیکے معین کر رکھے تھے جنکا بیان اوپر آچکا ہے۔

اسلام میں جہازوں کے بیڑے

اہل عرب کو فن ملاحی میں کچھہ دخل نہ تھا اسلئے پہلے انہوں نے اُن رومی لوگوں کو جو انکے قبضہ میں آچکے تھے اس کام پر لگایا جنمیں جہاز بنانے والے کاریگر اور ناخدا لوگ بکثرت موجود تھے، ان لوگوں نے مسلمانوں کیلئے جہاز وغیرہ تیار کئے اُن کے فوجی جوانوں اور اسلحہ جنگ سے آراستہ کیا اور انپر فوجیں اور جنگی سپاہیوں کو سوار کرا کے دریا کے راستے سے مقامات پر حملہ کی تیاریاں کیں جہازوں کے مجموعے کا نام اہل عرب نے "اسطول" مقرر کیا جو دراصل ایک یونانی نام کا لفظ (ی ر ر ر ہے) ہے جسے اہل عرب نے معرب کر لیا تھا اہل عرب نے اپنے اسطول کی خاص قیامگاہ بحر روم کو ٹھہرایا دریائی سفر (ملاحت) میں شام۔ افریقیہ اور اندلس کے مسلمان شریک رہتے اور انہوں نے جہاز سازی کے کارخانے (ترسانہ) قائم کئے جو ان ممالک میں ہر ایک جگہ جہازوں کی ساخت اور

انکے سفر در سامان کی تیاری و بہمرانی کا کام دیتے تھے۔ عہد اسلام میں سب سے پہلا دار الصناعۃ عبد الملک بن مروان کے دور میں بمقام "تیونس" بنایا گیا خلیفہ مذکور نے اپنے عامل "حسان بن نعمان" کو جو افریقیہ پر حکمران تھا اس کی ہدائت کی تھی جسنے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں کارخانہ کھولا جہاز بنوائے اور ان کو سامان رسد اسلحہ جنگ اور جنگی سپاہی بھر کر "صقلیہ" (سسلی) پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا مگر اس حملہ والے لوگوں کو جزیرہ مذکور کا فتح کرنا نصیب نہوا۔ بلکہ یہ خاندان بنو اغالب کے حکمرانوں کے عہد میں مکمل ہوا اور زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب کے زمانہ میں اس جزیرہ کی فتح کا "اسد بن فرات" کے سر سہرا بندھا۔ بلکہ اسکے ساتھ ہی اسنے "قوصرہ" کو بھی فتح کر لیا اس کے بعد سے مسلمانوں کو دریائی جنگوں کا شوق بڑھتا گیا اور انہوں نے افریقیہ اور اندلس میں اسطولوں کی تیاری کا کام بڑھا دیا چنانچہ عبد الرحمن ناصر کے عہد میں صرف اندلس کے اندر جنگی جہازوں کی تعداد ... تک پہنچ گئی تھی اور اسیطرح افریقیہ میں بھی جہازوں کی کثیر تعداد پائی جاتی تھی یہ واقعہ چوتھی صدی ہجری کی وسط کا ہے اندلس کے سب سے زیادہ مشہور بندرگاہوں میں بجانہ اور مریہ کا نام لیا جاتا ہے اندلس میں متعدد دار الصناعۃ بن گئے تھے اور ہر ایک کارخانہ ایک اسطول تیار رکھتا تھا جس پر ایک کمان افسر اور رئیس مقرر ہوا کرتا تھا کمان افسر بیڑہ کے اسلحہ جنگ اور سپاہیوں کے معاملات کا انتظام کیا کرتا تھا اور رئیس اس کو بادبانوں یا چپوؤں سے چلانے کا اہتمام کرتا جب بہت سے جنگی جہازوں کے بیڑے کسی جگہ حملہ کرنے یا اور کسی غرض سے ایک ہی مقام پر مجتمع ہو جاتے تو وہ اپنی خاص بندرگاہ میں صف باندھ کر کھڑے ہوتے اور ان جہوں پر سلطنت کے اعلے طبقوں میں سے کسی امیر کو منتظم اور مہتمم بنا دیا جاتا تھا۔

ملک مصر میں ان ترسانوں کی بنیاد پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی میں پڑ گئی تھی جسکا بیان آگے چلکر آئیگا اور سب سے پہلے جس شخص نے مصر میں اسطول کو قائم کیا وہ "عنبسہ بن اسحٰق" مصر کا امیر تھا جو متوکل علی اللہ عباسی وہاں کا حکمران تھا اس جنگی بیڑے کے قائم ہونیکا باعث یہ امر ہوا کہ اہل روم ۲۳۸ھ میں "دمیاط" پر حملہ کر کے اسپر قابض ہو گئے اور دل کھولکر قتل و غارت کیا امیر مصر کو اسبات کا سخت صدمہ ہوا اسنے اسطول کیلئے جہازوں کے تیار کرنیکا حکم دیا اور دریائی سپاہ کی بھی اسی طرز پر ایک جماعت مرتب کی جس طرح بری فوجوں کی جماعتیں مرتب تھیں اور ان کے روزینے خود ان کی پیادہ بری سپاہ کے برابر مقرر کر دیئے لوگوں نے یہ صورت دیکھکر اپنی اپنی اولاد کو تیر اندازی اور اصول جنگ کے سکھانے میں بہت کوشش شروع کر دی اس کام کے لئے امیر مصر نے تجربہ کار اور ہوشیار افسر منتخب کر کے ان جہازوں پر تعینات کیا اور اسکے

سامان جنگ و رسد سے ان کو لیس کرکے ان جہازی بیڑوں کے زمرہ میں شامل کر دیا جو افریقیہ اندلس اور شام کیطرف رومیوں کے مقابلے پر جا رہے تھے مسلمانوں اور اہل روم کی دریائی لڑائی تذبذب حالت میں رہتی تھی کبھی رومی غالب آجاتے اور کبھی مسلمان چونکہ غالب فریق مغلوب لوگوں کو گرفتار کر لیجاتا تھا اسلئے خلفائے اسلام کو ایک نئی ضرورت "فدیہ" دیکر اپنے ہم قوم اسیروں کو آزادی دلانیکے متعلق پیش آئی اور اس زر تاوان کا نام انہوں نے "فداء" رکھا۔

(شکل ۲۹) عربی جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ روم والوں کے ساتھ مصروف جنگ ہے اور اہل روم اسپر یونانی آگ برسا رہے ہیں۔

شکل نمبر ۲۹



عربی بیڑہ رومیوں سے لڑ رہا ہے اور یونانی آگ پھینک رہے ہیں۔

مسلمان اسیران جنگ کو زر فدیہ دیکر سب سے اول ہارون الرشید عباسی نے ۱۸۹ھ میں آزادی دلائی تھی اس واقعہ سے قبل فدیہ کی صورت یہ تھی کہ آدمی سے آدمی بدل لیا جاتا تھا جتنے مشہور "فدیے" مسلمانوں نے ادا کئے انکی تعداد تیرہ ہے اور وہ سب بنی عباس کے عہد میں دیئے گئے تھے جنمیں سب سے آخری فدیہ ۳۳۵ھ میں مطیع اللہ عباسی کے عہد کے اندر ادا کیا گیا اور جن لوگوں کو خلفائے اس تمام مدت کے اندر فدیہ دیکر آزادی دلائی انکی تعداد پچاس ہزار کے قریب پہنچی تھی۔ زر فدیہ ادا کرنے یا اسکے متعلق گفتگو کرنیکا کام اکثر اوقات "لامش" کے مقام پر انجام پاتا تھا جو بحر روم کے سواحل میں طرطوس کے قریب ایک جگہ ہے "فداء" کے موقعہ پر مسلمانوں اور رومیوں دونوں کی بڑی بڑی جماعتیں موجود ہو کر اسکے تصفیہ اور تبادلہ وغیرہ میں دو تین ہفتے

بلکہ اس سے زیادہ عرصہ تک مصروف رہتے تھے پہلی فدا کے موقعہ پر مسلمانوں کے قریب ۵ آدمیوں کا بہت بڑا مجمع تھا اور وہ ہر طرح کے عمدہ سامان اسلحہ اور گھوڑوں لعد زرق برق سامانوں سے آراستہ تھے انہوں نے تمام کوہستان اور ہموار زمینوں کو بھر دیا تھا اور اپنے زور و قوت کو پوری طمطراق سے دکھایا تھا اسی کے مقابلہ میں رومی لوگوں کے جنگی جہاز دوسری طرف بہت ہی آراستہ ہو کر اپنا جاہ و جلال دکھاتے ہوئے آئے تھے اور مسلمان قیدی اُنکے پاس تھے اس فدا میں جتنے آدمیوں کا فدیہ ادا کیا گیا ان کی تعداد ۲۷۰۰ تھی چنانچہ اسی کے بابت مروان بن ابی حفصہ شاعر خلیفہ ہارون الرشید کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

وفکت بک الاسریٰ التی شیدت	اے خلیفہ تیری وجہ سے وہ قیدی اسیری سے چھوٹے جن کے واسطے اس قسم کے
لھا محابس مافیھا حمیم یزورھا	مضبوط قید خانے بنے تھے جن میں کوئی رشتہ دار بھی نہیں نظر آتا جو ان کے ملنے کو آتا ہو
علی حین اعیی المسلمین فکاکھا	جبوقت مسلمانوں کو اُن قید خانوں سے آزادی پانے کی طرف سے یاس ہو چکی تھی اور
وقالوا اسجون المشرکین قبورھا	قید نے انکو تھکا دیا اور وہ کہہ رہے تھے کہ مشرکوں کے بندیخانے انکی قبریں ہیں

جب مصر کا ملک عبیدیین (فاطمی لوگوں) کے قبضہ اقتدار میں آیا جو افریقیہ کے فرمانروا تھے ان لوگوں نے اسکندریہ دمیاط اور مصر کے اندر جنگی بیڑوں کے بنانے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا اور انکے زمانہ میں بحری فوج کی تعداد پانچہزار تک پہنچگئی تھی جنکی تنخواہیں مقرر تھیں ان تنخواہ پانیوالے فوجی ملازموں میں دس جاگی افسر تھے جنکو دس سے بیس دینار تک ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور ایسے سپاہی بھی تھے جو اس سے کم تنخواہیں پاتے یہانتک کہ بہت لوگوں کی تنخواہ صرف دو درم ماہوار بھی اور سب سے کم درجہ کی تنخواہ تھی۔ بحری فوج کے ملازموں کو جاگیریں بھی دیجاتی تھیں اور ان جاگیروں کا نام "غازیوں کے ابواب" مقرر تھا یہ جاگیریں تنخواہ کے علاوہ ہوتی تھیں جنگ کیوقت جاگی افسروں کے حلقہ میں کسی ایک افسر کو بیڑہ کا کمانڈر بنا دیا جاتا تھا اور جہاد پر جانے کی حالت میں وہی کمان افسر ان کو حکم و احکام دیتا رہتا اس رئیس کے ساتھ سلطنت کے امراء میں سے کوئی بڑا امیر بھی ہوتا تھا۔

جنگی جہازوں کے بیڑوں پر جو مجاہدین رہتے تھے ان کی تنخواہ خود خلیفہ بذات خاص وزیر کے مواجہہ میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کیا کرتا اور اسکی وجہ سے بحری مجاہدین کی عزت و تکریم مقصود ہوتی تھی فاطمی خلفا کے سب سے اول خلیفہ معزالدین اللہ کے عہد میں جہازوں کی تعداد ۶۰۰ ہو گئی تھی اور اسکے بعد گھٹتے گھٹتے صرف ۸۰ تک رہ گئی۔ جنگی بیڑہ کو لڑنے کیلئے روانہ کرنے کے وقت بہت دھوم دھام کا جلسہ اور خوب شان و شکوہ کا اظہار کیا کرتے خود خلیفہ بھی جہازات کی روانگی اپنی نظر سے دیکھنے میں شریک ہوتا اور وہ ایک ہی جہد کے مقام مقس نیں کے

ساحل پر اس کی نشست اور سیر کیواسطے مخصوص تہا۔ (قاہرہ کے بیرونی جانب) جلوس فرما ہوتا اور جہازی بیڑے کے افسر اس مکان کے نیچے جہازوں کو لاتے جہاز اسلحہ اور سامان جنگ سے خوب سجے ہوئے اور جھنڈیاں اڑاتے سامنے سے گذرتے تے۔ جہازوں پر منجنیقیں نصب کی ہوتی تہیں اور وہ انکے ذریعے سنگباری کرتے جاتے تھے دوسرے جہاز پتھروں کی مانند چلتے اور جنگ کرتب دکھاتے باری باری سلامی اُتارتے ہوئے نکل جاتے غرضیکہ جہازات اُسوقت میں تمام وہ حرکتیں کرتے تھے جو ان کو حالت جنگ میں کرنی پڑتی تہیں اور جسے آجکل مصنوعی جنگ کہتے ہیں اس کے بعد رئیس اور مقدم خلیفہ کے روبرو حاضر ہوتے اور خلیفہ ان کو رخصت کرتے ہوئے مقدم کو ۱۰۰ دینار اور رئیس کو ۲۰ دینار عطا فرماتا اور اسی طرح کا جلسہ اسوقت بھی کیا جاتا جبکہ جنگی بیڑے لڑائی سے فارغ ہوکر واپس آتے تھے سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں جنگی بیڑوں کا ایک خاص دفتر بھی قائم ہوگیا تہا جس کا نام "دیوان الاسطول" تہا اور اس کام میں جسقدر اخراجات پڑتے تھے وہ اسی دفتر سے ادا کیے جاتے تھے۔

اسلامی مملکت کو وسعت دینے میں سطولوں کو بہت بڑا اثر حاصل تہا اس لئے کہ مسلمانوں نے اسکے ذریعہ سے بحر روم کے مشہور جزیرے فتح کرلئے تہے جنہیں سرڈینیا۔ سسلی۔ مالٹا۔ کریٹ۔ اور قبرص وغیرہ سب شامل تھے ان جزائر کے علاوہ اہل اسلام نے بحر روم کے اکثر ساحلی مقامات بھی جو یوروپین ممالک سے متصل سے فتح کرلئے تھے اور اس دریا کے اندر ان کے جہازات آمدورفت رکھتے ہوئے اسلامی فوجوں کو لے کر سسلی سے شمال کی سمت میں براعظم یورپ کے اس حصہ کو جو اٹلی کے مقبوضات میں داخل تہا پامال کرتے تہے اور اسلامی فوجیں ممالک فرنگ کے بادشاہوں پر حملہ کرکے اُن کے ملکوں میں گہستی چلی جاتی تہیں ایسے حملے یوں تو عموماً ہوتے رہے لیکن شاہان بنو الحسن کے عہد میں جو سسلی کے حکمران اور فاطمی خلفاء کی دعوت کے پیرو تھے بہت زور شور کے حملے مسلمانوں کی طرف سے ممالک فرنگ پر ہوئے اور اُن سے تمام یوروپین میں ایک تہلکہ مچ گیا فرنگی لوگ اپنے جنگی بیڑوں کو بحر روم کے شمالی مشرقی گوشہ کی جانب ہٹا لے گئے اور اہل اسلام جنگی بیڑوں اور جہازوں کے ذریعہ سے تمام سمندر کے مالک ہوگئے اور بحری دنیا میں ویسے ہی بادشاہ ہوگئے جیسے کہ خشکی کے سلطان تھے اسوقت یوروپین اقوام کی کمزوری حد تک پہنچ چکی تہی اور یہ حالت ایک مدت تک قائم رہی۔ تاآنکہ ناموس تاریخ کے مقتضا سے مصر میں عبیدی حکومت اور اندلس کی اموی سلطنت میں کمزوری اور ادبار کے آثار عیاں ہوئے اور اہل یورپ غفلت کی گہری نیند سے چونک کر سنبھلے اور اپنے قبضہ سے نکلے

ہوئے ملکوں کو اہل اسلام سے واپس لینے پر آمادہ ہو کر انہیں پھر فتح کرنے لگے یورپ کی قوموں نے خاص اسلامی ممالک پر حملے کئے اور اسکے بعد سے صلیبی لڑائیوں کے جو واقعات گزرے وہ نہایت مشہور و معروف ہیں۔

مسلمانوں نے جنگی جہازوں کا معاملہ مہمل کر دیا تھا اور بحری فوج کو گھٹا دیا اس صیغہ کا خاص دفتر بھی انکی حکومت سے نیست و نابود ہو گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ دریائی فوجوں کے سپاہی مجاہدین فی سبیل اللہ اور غزاۃ فی اعداء اللہ کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور لوگ ان کی دعاؤں سے برکت حاصل کرنیکے متمنی رہتے تھے یا ایک وقت ایسا آیا کہ "اسطولی" کا لفظ ملک مصر میں ایک اہانت کا لفظ خیال کیا جانے لگا اور جنگی جہازوں کی خدمت ان کے یہاں شرم و ذلت کا کام سمجھی جانے لگی مصریوں کی یہ کیفیت اس زمانہ تک برابر قائم رہی جبکہ ملک ظاہر بیبرس بندقداری کا ظہور ہوا جو ممالیک (غلاموں کے) خاندان کا مشہور بادشاہ تھا اس فرمانروا نے جنگی بیڑوں کی حالت دوبارہ کچھ درست کی مگر اب وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی جو عروج اسلام کے عہد میں تھی۔

مصر اور شام میں اسطولوں کی شان بہت گر گئی تھی مگر اندلس اور افریقیہ میں اس کی قوت قائم تھی یعنے مغربی حکومت دریائی طاقت کیلئے مخصوص تھی اور انکی یہ حالت انکے عہد حکومت کے آخر زمانہ تک قائم رہی مغربی مسلمان حکمرانوں کے اسطولوں کی تعداد یورپ اور افریقیہ کے دونوں خطوں میں صرف ایک سو اسطول رہ گئی تھی یہ روایت ابن خلدون کی ہے اسی اثنا میں ملک مغرب کے اسطولوں کا مشہور میر البحر احمد صقلی پیدا ہوا جو چھٹی صدی ہجری میں گزرا ہے اس کے عہد میں مسلمانوں کے اسطولوں نے اسقدر ترقی کی کہ نہ کبھی اس سے قبل اتنی زیادتی ہوئی تھی اور نہ بعد میں رہی اور اس کے بعد سلطنت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ اسطولوں کی قوت بھی کم ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اندلس کے ملک میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوتے ہی مسلمانوں کی بحری طاقت کا وجود بھی گم ہو گیا۔

دارالصناعۃ اہل عرب کے نزدیک دارالصناعۃ سے وہ کارخانہ مراد ہے جس کو ہم آجکل "ترسانہ" یا "ترسخانہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ دونوں لفظ اسی دارالصناعۃ سے منقول ہیں اس لئے کہ اہل یورپ نے ممالک عرب کو فتح کرنیکے بعد جن باتوں کو ان سے حاصل کیا منجملہ اسکے ایک جہازسازی کا بھی فن تھا جس طرح اہل عرب نے اس فن کو اپنے اسلاف سے سیکھا تھا اسی طرح یورپین اقوام نے اہل عرب کی شاگردی کی سپین والوں نے دارالصناعۃ کا نام رکھا تھا اور دیگر یورپین زبانوں نے اس لفظ کو ہسپانی زبان سے لیا جسکی وجہ سے تلفظ کا فرق ہوتے ہوتے یہ لفظ

ہوگیا اور عرب کے لوگوں نے اس لفظ کو سپین والوں کی زبان سے لیا جس میں اسکا تلفظ ترکی طرز پر
تھا اس لئے انہوں نے اسے ترکی لفظ سمجھ کر اس کا معرب ترسخانہ یا ترسانہ بنالیا۔ مگر بہتر یہ تھا کہ اس کا
نام دار الصناعۃ رکھا جاتا اصطلاح کی وجہ یورپین زبان کے لفظ (امیرال) کے عربی لفظ
"امیر البحر" سے بدلجانے کے بارہ میں بیان کی جاتی ہیں۔ +

منجملہ اسلامی ممالک کے اندلس۔ افریقیہ، شام اور مصر میں بکثرت دار الصناعۃ واقع تھے اسی لئے
سب سے پہلے جو کارخانہ مصر میں بنایا گیا وہ فسطاط کے مقابل جزیرہ روضہ میں پہلی صدی ہجری کے اندر
تعمیر ہوا تھا اس کے بعد احمد بن طولون نے اسے بڑھانے اور اعلےٰ درجے کا بنانے پر توجہ کی اور بعد ازاں کارخانہ
اخشید کے عہد میں جو چوتھی صدی ہجری کے شروع میں گذرا ہے خاص فسطاط میں منتقل کر دیا گیا تاکہ اس کارخانہ اور
فسطاط کے مابین دریا نہ حائل رہے اسکے بعد آنیوالے زمانہ میں فاطمی خلفاء نے ایک دار الصناعۃ بمقام
"مقس" اپنے آباد کئے ہوئے شہر قاہرہ کے قریب بنایا۔ ان کارخانوں میں طرح طرح کے جہاز بنائے
جاتے تھے جنہیں جنگی مصرف کے ہوتے اور معمولی کاروبار کے اغراض میں کام دینے والے بھی اور
بعض باربرداری کیلئے بھی [illegible] تے مگر جسقدر جہاز یہ کارخانہ تیار کرتا ان کی بالعموم دو قسمیں ہوتی تھیں
ایک جنگی دوم نیلی۔ نیلی جہاز وہ کہلاتے تھے جو صرف دریائے نیل میں اسکے سب سے اعلےٰ چڑھاؤ سے
دہانہ تک آمد ورفت رکھتے اور غلہ وغیرہ سامان تجارت لاتے اور لیجاتے تھے اور جنگی جہاز وہ ہوتے جو جنگ میں
استعمال ہوا کرتے اور لڑنیوالوں کو جہاد میں لیجاتے انہیں جہازوں کے مجموعہ کا نام اسطول ہوتا تھا۔

کشتیوں کی صورتیں اور اُن کے اسباب

جنگی جہاز کئی قسم کے ہوتے تھے جو شکل میں متفاوت قد و قامت اور
زور و قوت میں کم و بیش ہوتے تھے ایک قسم کے جہاز کو شونہ کہتے تھے
یہ بڑے بڑے جہاز ہوا کرتے تھے جنہیں دشمنوں کے حملہ سے اپنی مدافعت
کرنے کیلئے قلعے اور برج بنائے جاتے تھے دوسری قسم کا نام "حراقہ" تھا اس میں منجنیقیں رہتی تھیں جن کے
ذریعہ سے دشمنوں پر جلتا ہوا نفط پھینکا جاتا تھا اور منجنیق کو "عرادہ" کہا کرتے تھے تیسری قسم "طرادہ"۔ یہ ایک
چھوٹی سی تیز رو کشتی ہوتی تھی۔ چوتھی قسم کے جہاز جنکے ذریعہ سے نیل میں گشت لگایا کرتے تھے عشاریات
کہلاتے تھے نیز چند اور خاص قسموں کی کشتیاں بھی اور کاموں کیلئے پائی جاتی تھیں مثلاً۔ شلندیات اور
مسطحات وغیرہ اہل عرب اپنے یہاں کے جہازوں کو یونانی اور رومانی اقوام کے جہازوں کی مانند بنایا کرتے تھے

جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس فن میں مذکورہ بالا قوموں کی شاگردی کی تھی۔

اہل عرب کے ہاں جنگی جہازوں کے ضروری سامان حسب ذیل اشیاء داخل تھیں زرہ۔ خود۔ درق ڈھالیں۔ نیزے کمانیں کلالیب اور باسلیقات جو لوہے کی زنجیریں ہوتی تھیں اور انکے سروں پر آنکڑے لگے رہتے تھے اور عرادات (منجنیقیں) اور عرب لوگوں نے ایک اور طریقہ بھی نکالا تھا وہ یہ تھا کہ ستونوں کے بالائی حصہ اوپر کی طرف سے کھلے ہوئے منہ کے بہت سے صندوق لگا دیتے تھے اور دشمن کے آنے سے پہلے ان صندوقوں میں کچھ لوگ جا بیٹھتے جو وقت غنیم قریب آجاتا اور جنگ چھڑ جاتی تو ان تھیلوں میں سے جو صندوقوں کے برابر لٹکتی رہتی تھیں پتھروں کی بھرمار کرتے تھے اور خود بخوبی تمام صندوقوں کے اندر محفوظ بیٹھے رہتے اور کبھی کچھ لوگوں کے پاس ڈھیلوں اور پتھروں کی جگہ پر جلتے ہوئے نفط کے قارورے ہوا کرتے جنکے ذریعہ سے وہ دشمنوں پر آتشباری کرتے تھے یا بن بجھے چونہ کا سفوف ہوتا تھا جو چونہ اور ہرتال کو باہم ملا کر اور باریک پیس کے رکھ لیا جاتا تھا اسکو دشمنوں پر پھینکتے تھے اسکے غبار سے غنیم اندھے ہو جایا کرتے تھے اور بعض اوقات جبکہ غبار کثرت سے جسم پر جا پڑتا تو بدن میں سوزش پیدا کر دیتا تھا یا دشمنوں پر سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے ظروف پھینکا کرتے تھے یا گھولنے صابون ڈالتے تھے تاکہ دشمنوں کے قدم پھسل جائیں اور وہ جمکر لڑ نہ سکیں۔ اہل اسلام جہازوں کے چاروں طرف کھالیں اور نمدے سرکہ پانی پھٹکری وغیرہ میں تر کرکے لٹکا دیا کرتے تھے تاکہ وہ نفط کی بلا سے محفوظ رہیں اور ان پر آگ اپنا اثر نہ کرنا پائے اور بعض اوقات احتیاطاً بورق اور نطرون میں بنی ہوئی مٹی یا سرکہ میں گندھی ہوئی خطمی استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی نفط کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں۔

اثنائے جنگ میں اہل عرب جس قسم کی احتیاطیں کرتے تھے منجملہ ان کے ایک یہ امر بھی تھا کہ وہ رات کی تاریکی غالب ہونے پر اپنے جہازوں میں آگ سلگاتے تھے اور اسے کسی برج کو ڈھکتے تھے اور جب ہوا میں زیادہ میانہ منظور ہوتا تو جہاز پر بالین بھی نیلے رنگ کی چڑھا دیتے تاکہ وہ دور سے نمایاں نہ ہونے پائے مسلمان اپنے جہازوں کے نکڑ پر ایک آلہ تبر کی شکل کا لگاتے اور اسکو "لجام" کہا کرتے تھے وہ ایک لوہے کا لمبا اور نہایت تیز نوکدار ٹکڑا ہوتا تھا اس کا پچھلا حصہ نیزہ کی انی کی طرح پولا ہوتا تھا بنایا جاتا تھا اور اسے پچھلے حصے کیطرف سے ایک لکڑی میں لگا دیا جاتا تھا جو جہاز کے اگلے سرے پر بیچ کیطرح نکلی ہوتی تھی اور اسے "اسطام" کے نام سے نامزد کرتے تھے اس طرح لگام کی صورت جہاز کے اگلے سرے پر ایک تیشہ سے

نیزہ کی طرح ہوجایا کرتی تھی اور اس سے دوسرے جہازوں کو صدمہ پہنچانے میں کام لیتے تھے جو وقت یہ آلہ کسی جہاز کے پہلو میں زور سے لگتا تھا اُسے پھاڑ دیتا تھا اور اس میں پانی بھر جانے سے ڈوبنے کا خطرہ پیش نظر ہو جاتا تھا جس سے اس جہاز کے لوگ امان کے طالب ہوتے اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ کلالیب (یعنی آنکڑے دار زنجیروں) کا فائدہ یہ تھا کہ جو وقت دشمن کے جہازوں میں سے کسی جہاز کے قریب جا پہنچتے تو ان زنجیروں کو اُس پر ڈال کر اُسے پھنسا لیتے اور روک کر ان زنجیروں کو تان دیتے پھر جلد جلد ان پر تختے بچھا کر پل باندھ لیتے اور غنیم کے جہاز میں گھس جاتے تھے مگر جب دشمن زور آور ہوتا تو وہ اُنکے انکڑوں کو فولادی بھاری تبروں کے ذریعے سے کاٹ کر بیکار کر دیتا تھا

بیت المال

بیت المال سے بحث کرتے وقت اسبات کی ضرورت ہے کہ حکومت کے مالی صیغہ سے متعلق.... خراج صدقہ۔ عشر خمس اور جزیہ وغیرہ شاخہائے آمدنی پر بھی نظر ڈالی جائے اور ان سب کے حالات بیان کئے جائیں۔ بیت المال کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کے مسلمان لوگ مستحق ہوں اور اسکا کوئی خاص مالک متعین نہ ہو سکے وہ بیت المال کا حق ہے اور ہر ایک ایسا خرچ جو مسلمانوں کی ضروریات اور اسباب بہبود سے متعلق واجب ہے اس کا برداشت کرنا بیت المال کے ذمہ ہے جن مالوں کے مسلمان لوگ حقدار قرار پا سکتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں صدقہ۔ غنیمت اور فئی ان اموال میں سے ہر ایک کیواسطے خاص احکام بھی ہیں جن کا بیان آگے چل کر آئے گا اور جو مصارف بیت المال کے ذمہ ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں فوج کی تنخواہیں اور وظیفے دینا۔ ہتھیاروں یا دیگر سامان حرب کی قیمتیں ادا کرنا اور اس کے علاوہ رفاہ عام پر صرف کرنا۔

صدقہ صدقہ کیا ہے؟ زکاۃ ہی اسمیں اور زکاۃ میں نام کا فرق ہے اور مسمّٰی ایک ہی ہے وہ مالدار مسلمانوں سے لے کر ان کے محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اسکی حقیقت ہم اوپر بیان کر آئے ہیں صدقہ کا ایک صدر دفتر مرکز خلافت میں ہوتا اور ماتحت ولایتوں یا شہروں میں اسکی شاخیں ہوتی تھیں ہر ایک مقام پر صدقہ کا والی (حاکم محصل) مستقل طور پر وہاں کے مالداروں سے

صدقہ کو وصول کرکے وہیں کے غربا پر تقسیم کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ زکواۃ کے مصادر چار تھے:
چوپایوں کی زکواۃ سونے چاندی کی زکواۃ۔ پھلوں میووں کی زکواۃ اور کھیتی کی زکواۃ۔

چوپایوں کی زکواۃ اونٹ گائے اور بھیڑ بکریوں پر ہوتی تھی اُسکے چند احکام بھی ہیں جنکو خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے وضع فرمایا تھا۔[1] اسبات پر ایک خط سے استدلال کیا جاسکتا ہے جو ابوبکرؓ نے انس بن مالک کے نام اسوقت لکھا تھا جبکہ ان کو بحرین کا عامل بنا کر بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ صدقہ فریضہ ہے جس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں پر لازمی مقرر فرمایا اور جس کا خداوند پاک نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے اس لئے جس مسلمان سے اس صدقہ کا واجبی حق مانگا جائے اُسے فوراً ادا کرنا چاہیئے اور اگر کسی سے زیادہ طلب کیا جائے تو وہ ادا کرے چوبیس اونٹوں یا اس سے کم کی زکواۃ بکریوں کیساتھ ادا کیجائیگی اسطرح کہ ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکواۃ کے طور پر دیجائے جب اونٹوں کی تعداد پچیس تک پہنچ جائے تو پینتیس اونٹوں تک زکواۃ میں ایک مادہ بنت مخاض (ایک سالہ کامل اونٹ کا بچہ) دیجائیگی۔ ۳۵ سے ۴۵ اونٹوں تک ایک مادہ بنت لبون (دو سالہ کامل اونٹ) ۴۶ سے ۶۰ اونٹوں تک ایک حقہ (پورے تین سال کی اونٹنی جو بلوغ کو پہنچ گئی ہو) ۶۱ سے ۷۵ تک ایک مادہ جذعہ (پانچ برس کی پوری اونٹنی) ۷۶ سے ۹۰ اونٹوں تک دو بنت لبون۔ ۹۱ سے ۱۲۰ تک دو حقے۔ جس کے پاس صرف چار اونٹ ہوں اُسپر کچھہ زکواۃ نہیں ہے تاوقتیکہ خداوند پاک اسے اس قابل نہ کردے کہ وہ زکواۃ ادا کرسکے مگر جو وقت پانچ اونٹ ہوجائیں تو انپر ایک بکری دیجائے چرائی پر چھوٹی رہنے والی بکریوں پر جبکہ وہ چالیس یا اس سے اوپر ہوں ایک سو بیس تک ایک بکری زکواۃ دینی چاہیئے ۱۲۰ بکریوں سے زائد دو سو تک دو بکریاں اور دو سو کے اوپر تین سو تک تین بکریاں زکواۃ میں نکالی جائینگی لیکن اگر بکریوں کا ریوڑ جو محض چرائی پر بسر کرتا ہے چالیس سے ایک بھی کم ہو تو اسپر زکواۃ نہیں ہے لیکن اسوقت جبکہ خدا کو منظور ہو اور وہ شخص قابل ادائے زکواۃ یعنے صاحب نصاب ہوجائے۔

---

[1] فاضل مولف کا یہ بیان اُن کے پندار کے مطابق خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن ہمارے زعم و اعتقاد میں باطل ہے کیونکہ ہمارا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ حضور انور روحی فداہ کا قول کلام اللہ کی تفسیر ہوتا ہے اور الحمد للہ جمہور علمائے اسلام اسی کے قائل ہیں لہٰذا اصل قوانین زکواۃ حضرت خداوندی کے وضع کردہ ہیں اور ان کا اعلان پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہوا ہے قرآن مجمل ہے اور حدیث اس کی تفصیل۔ مترجم عفی عنہ

سکہ کی چاندی (روپیہ درہم وغیرہ) پر ۱/۴۰ حصہ زکوٰۃ دینی واجب ہے لیکن اگر ۱۹۹ درہم سے زائد نہوں تو زکوٰۃ واجب نہوگی البتہ اگر خداوند کریم اُسے مالک نصاب کامل یعنے (۲۰۰) درہم کا مالک بنا دے اور فقیہہ لوگوں نے اسبارہ میں بہت سی تفصیل بیان کی ہے جسکے ذکر کا یہ موقعہ نہیں ہے گھوڑوں گدھوں اور خچروں پر زکوٰۃ نہیں ہوتی اور چاندی کی زکوٰۃ ۲۰۰ درہم سے کم پر واجب نہیں ہوتی (۲۰۰) درہم پر سالانہ ۵ درہم زکوٰۃ ہے یعنے ۲½ فی صدی یا ۱/۴۰ حصہ اسی حساب سے سونے کی زکوٰۃ بھی لی جاتی ہے یعنی ہر ۲۰ مثقال سونے پر نصف مثقال سونے کے بیس مثقال سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے اور جب بیس مثقال سے زائد ہو تو اسی نسبت سے زکوٰۃ کی مقدار بڑھتی جائیگی تجارتی مال یا اس کے مثل چیزیں سونے چاندی کی قسم سے سمجھی جاتی ہیں

پھلوں کی زکوٰۃ اُن کی آب رسانی کی مختلف اقسام کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی تھی اگر اس قسم کے پھل ہوتے کہ انہیں پانی دینے میں صاحب مال کو زیادہ دقت یا صرف برداشت کرنا نہ پڑتا ہو یعنی بارانی یا نہری پانی سے انکو سیراب کر لیتے تھے تو ان کی زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ نکلتی تھی اور اگر اس قسم کے پھل ہوتے جنکی آبرسانی میں محنت اور صرف کثیر اٹھانا پڑتا تو اس کی زکوٰۃ بیسواں حصہ نکالی جاتی اور ہر حالت میں پھلوں پر اسوقت تک زکوٰۃ واجب نہوتی تھی جبتک کہ وہ پانچ وسق یا اس سے زائد نہوں ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع عراق کی تول سے ۵⅓ رطل (۵ پونڈ) کا ہوتا تھا انگور کی بیل اور کھجور یا اسی قسم کے دیگر پھلدار درخت میوہ جات کی قسم میں داخل تھے۔

کاشت کی اجناس سے بھی جن سے تمام قسموں کے غلے مراد ہیں مثلاً گیہوں چاول لوبیا اور چنا وغیرہ اسوقت تک زکوٰۃ نہ لیجاتی تھی جبتک کہ یہ پانچ وسق تک نہ پہنچ جائیں اور انکا حکم بھی مثل پھلوں کی زکوٰۃ کی ہے جہاں جہاں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا مناسب ہے اُسکا قرآن پاک میں صریح ذکر آچکا ہے اور وہ یہ ہے ۱؎ انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل" اسی بنیاد پر زکوٰۃ کی آمدنی آٹھ برابر حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے ایک حصہ فقیروں کو دیتے تھے فقیر وہ لوگ جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو دوسرا حصہ مسکینوں کو دیا جاتا یہ ایسے لوگ ہوتے جنکے پاس تھوڑا بہت مال ہوتا تو سہی لیکن انکے بسر اوقات کیلئے کافی نہیں یہ لوگ فقیروں کی نسبت ذرا خوشحال

۱؎ خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو مال خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جنکے دلوں کو پرچانا منظور ہے اور نیز یہ مال قید غلامی و غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں مجاہدین کے ساز و سامان میں اور مسافروں کی زاد راہ میں صرف ہونا چاہیے

ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک کا حصہ اس کی حالت کے لحاظ سے اتنا مقرر کرتے جو اس کی گذران کو کافی ہوتا یا جیسا ملی الصدقہ (صیغہ زکوٰۃ کا افسر) کو مناسب معلوم ہوتا تو اسی کے موافق وہ تقسیم کر دیتا مگر شرط یہ تھی کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو اتنا مال نہ دیا جائے جو ۲۰۰ درہم سے زائد ہو کیونکہ جب سے اس قدر مال ملجائیگا تو اسپر خود بھی زکوٰۃ دینی واجب ہو جائیگی قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں جو روایت لکھی ہے اسکے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عمر بن الخطاب نے اسبارہ میں یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ المساکین کا لفظ اہل ذمہ (یہود و نصاریٰ) کے فقرا کو بھی شامل ہے لیکن فقرا کا لفظ صرف مسلمان حاجتمندوں پر بولا جاتا ہے تیسرا حصہ ان لوگوں کو ملتا تھا جو زکوٰۃ کے وصول کرنے اور بانٹنے پر عامل مقرر ہوتے جنہیں امین اور مباشر (وصول کرنیوالے) افسر اور ماتحت ہر قسم کے عملے ہوتے اور وہ اپنی اپنی اجرتیں لیتے تھے جب انکے حصہ کا مال فاضل بچ رہتا یا انکے حقوق سے بڑھ جاتا تو وہ فاضلہ رقم باقیماندہ حقدارونپر حصہ رسدی تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چوتھا حصہ مولفۃ القلوب پر خرچ کیا جاتا تھا یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن کو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اور انکے خلفاء یا تو مسلمانوں کو انکے شر سے بچانے کیلئے اور یا انہیں انکے قوم اور قبیلہ کو اسلام کی طرف رغبت دلانے کی غرض سے مالی امداد دیکر انکو اپنی جانب مائل کرتے تھے جس کا بیان اوپر آچکا ہے مگر جبکہ مولفۃ القلوب لوگوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو اسے مال زکوٰۃ میں سے کوئی رقم نہیں دی جاتی تھی بلکہ مال غنیمت یا فئی میں سے اسکو مل جاتا پانچواں حصہ غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے میں خرچ کر دیا جاتا تھا چھٹا حصہ قرضداروں کو دیا جاتا تھا تاکہ وہ ادائے قرض سے سبکدوش ہوں۔ ساتواں حصہ راہ خدا میں جہاد کرنیوالوں کے لئے سامان جنگ بہم پہنچانے پر خرچ ہوتا اور آٹھواں حصہ ان مسافروں کو ملتا جنکے پاس سفر خرچ نہیں ہوتا تھا

صدقات کا عامل دیگر صیغہ مال کے عاملوں سے یوں ممتاز ہوا کرتا تھا کہ اسے اپنی تحصیل کردہ آمدنی میں سے بلا اجازت غیرے خرچ کرنیکا حق حاصل ہوتا تھا بجز اس صورت کے جبکہ اسے اسکی کسی وجہ سے ممانعت کر دیگئی ہو بخلاف اموال فئی و غنیمت کے جنکے عاملوں کو بجز خلیفہ یا اسکے قائمقام والی یا وزیر کا حکم حاصل کرلنے کے کسی طرح ان مالوں کو خرچ کرنیکا اختیار نہیں ہوتا تھا۔

غنیمت

غنیمت اس آمدنی کا نام ہے جسکو مسلمان جنگ کر کے حاصل کریں اور اسکی چار قسمیں ہیں جنگی قیدی۔ لونڈی غلام جو جنگ میں پکڑے گئے ہوں اراضیات اور نقد مال و دولت

اسیر وہ مرد ہوتے تھے جو حالت جنگ میں پکڑے جاتے اسبارہ میں اسلامی شریعت کے بہت سے احکام و شرائط ہیں

اور اماموں نے اس کی حد مقرر کرنے میں اختلاف کیا ہے جسکے بیان کا یہ موقع نہیں منجملہ ان شرطوں اور حکموں کے فدیہ کا قبول کرنا بھی ہے یعنے وہ مال جو گرفتار شدہ دشمن اپنی آزادی کے معاوضہ میں دے اُس سے لینا جو مال اس طرح لیا جاتا وہ باقی مال غنیمت پر اضافہ کردیا جاتا تہا "سبی" وہ عورتیں اور بچے جو حالت جنگ میں مفتوحہ ملکوں سے گرفتار ہوکر مسلمانوں کے ہاتھ آتے ان کا قتل کرنا جائز تہا مگر وہ مال غنیمت میں شامل کرکے فاتح لوگوں میں تقسیم کردیئے جاتے تہے ہاں فدیہ کا لینا ان لوگوں کی بابت بھی درست تھا۔

زمین جو حالت جنگ میں لیجاتی تھی اسکی یا تو یہ صورت ہوتی کہ بزور شمشیر اُسپر قبضہ کیا جاتا اور وہاں کے باشندے زبردستی نکالدیئے جاتے تھے یا یہ کہ وہاں کے لوگ بلا کسی جنگ کے محض خوف کیوجہ سے خود ہی اُسے چھوڑ کر بہاگ گئے ہوتے تھے اور یا یہ صورت ہوتی تھی کہ وہ زمین چند شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کی صلح میں داخل ہو جاتی تھی یہ آخری شق فئی کے قسم سے تھی انہیں حالات و اختلافات کیوجہ سے ان اراضیوں پر مختلف قسم کے لگان مقرر ہوتے تھے مثلاً عشر وغیرہ۔

منقولہ جائدادوں کو جن کا منتقل کرنا آسان ہوتا تہا مثلاً چوپائے اور مال وغیرہ لڑنیوالے لوگوں میں تقسیم کردیتے تھے ابتدائے اسلام میں تقسیم بقاعدہ طور پر ہوتی تھی خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خیال کیمطابق اسے تقسیم فرمادیا کرتے تہے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو مال غنیمت ہاتھ لگا وہ ۲ھ کا اندر واقعہ "بدر" کے موقع پر ملا تہا مہاجرین اور انصار اسکے باہم بانٹ لینے میں جھگڑنے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مثل ایک مسلمان کے تہے آپنے اپنا حصہ بھی سب کے برابر ہی لگایا اسکے بعد آیۃ۔ "واعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل" کے حکم سے خمس کا قاعدہ مقرر ہوا اور سب سے پہلی غنیمت جسمیں خمس (۱/۵ حصہ) نکالا گیا غزوہ بنی قینقاع کی غنیمت تھی جو اسی سال حاصل ہوئی اسکے مال کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا جسمیں سے چار حصے لڑنےوالوں کو برابر برابر بانٹ دیئے گئے اور ایک پانچواں حصہ جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس تہا پانچ حصوں میں بانٹا گیا پہلا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات خاص اور اپنی ازواج مطہرات پر صرف فرماتے تھے اور اسمیں سے مسلمانوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتے تھے دوسرا حصہ قرابتمندوں پر صرف کرتے تہے جو خاصکر بنو ہاشم نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہتوم اور گھرانے کے لوگ اور بنو عبد المطلب اور بنو عبد مناف ہوتے نکے سوا قریشی لوگوں میں سے اور کسی گھرانے والے کو یہ حق حاصل نہ تہا تیسرا حصہ حاجتمند یتیموں پر خرچ کیا جاتا اور اس حصہ میں لڑکے اور لڑکی دونوں کیلئے یکساں حکم تہا چوتہا حصہ ان مسکینوں

پر تقسیم کر دیا جاتا جن کے پاس بقدر ضرورت خرچ نہوتا اور پانچواں حصہ اُن مسافروں کیلیے مخصوص تھا جن کے پاس سفر خرچ وغیرہ نہوتا تھا۔

اسلاب یعنے مقتول لوگوں کے کپڑے اور اُنکے ہتیار بھی مال کی قسم سے شمار ہوتے تھے اور انکو قاتل لوگوں پر تقسیم کر دیتے تھے اور ہر ایک شخص اپنے مقتول دشمن کا "سلب" پاتا تھا۔

جو اراضیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تہیں خواہ وہ بزور شمشیر لی گئی ہوں یا صلح کے ذریعہ سے ان کی بابت صدر اسلام میں چند شخصوں نے یہ چاہا تھا کہ انہیں بھی مال غنیمت میں داخل کر کے فاتح لوگوں میں اسی طرح تقسیم کر دیا جائے جس طرح اور مالوں کو بانٹ دیا جاتا ہے مگر عمر بن الخطاب نے ان کو اس امر کی اجازت نہیں دی جیسا کہ ان کی ایک تحریر سے عیاں ہوتا ہے جو انہوں نے فتح عراق کے بعد وہاں کے عامل سعد بن ابی وقاص رض کو ارسال فرمائی تھی۔ خلیفہ ممدوح اس میں رقم فرماتے ہیں: "حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ میرے پاس تمہاری وہ تحریر پہنچی جسمیں تمنے یہ ذکر کیا ہے۔ کہ لوگوں (مسلمانوں) نے تمسے درخواست کی ہے کہ مفتوحہ اراضیاں بھی ان کو اسی طرح تقسیم کر دیجائیں جسطرح اور اموال غنیمت بانٹ دیے جاتے ہیں اس لئے جس وقت تم کو میری یہ تحریر ملے تم دیکھو کہ فوجی لوگ مال اور اسباب کی قسم سے تمہارے پاس کیا کیا لائے ہیں ان سب کو موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دو اور اراضیوں اور نہروں کو ان کے کاروبار کرنے والوں کے ہاتھوں میں رہنے دو تا کہ مسلمانوں کے عطیات میں کام آئیں کیونکہ اگر تم اراضیوں کو بھی موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دوگے تو جو لوگ اُنکے بعد ہونگے انکے واسطے کچھہ بھی باقی نہ رہے گا۔"

عمر بن الخطاب کی تحریر پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اراضیاں بھی ہمارا حق ہے کیونکہ ہمنے ان کو اپنی تلواروں کے ذریعہ سے فتح کیا ہے مگر سعد بن ابی وقاص نے اُن سے بحث کر کے ان کو بند کر دیا اور کہا کہ اسپر خراج مقرر کیا جائیگا اور وہاں کے باشندوں پر جزیہ مقرر ہوگا اور یہ دونوں آمدنیاں بہت عرصہ تک مسلمانوں کیلئے مال غنیمت ہونگی اسی بنیاد پر عمر رض نے جزیہ اور اخراج مقرر کیا اور عراق اور اسکے علاوہ دیگر ملکوں کی سب زمینوں پر جو فتح ہوئی تہیں یہ لگان مقرر کر دیا گیا اسکی تفصیل کتاب ہذا میں لکھی گئی جس طرح اہل فارس اور رومیوں کے ہاں اندراج کا قاعدہ تھا اور اسی صورت کو ترتیب دفاتر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

فئی بیت المال کے اموال میں سے تمام باقی حصہ کا نام ہے اور شروع میں "فئی" ہر ایسے مال کو کہتے

ہیں جو مشرک لوگوں سے بغیر جنگ اور خونکشی کے ہاتھ آیا ہو اس میں جزیہ، خراج اور عشر وغیرہ سب داخل ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فئی کے مال میں سے ویسا ہی خمس ملتا تھا جس طرح مال غنیمت میں سے مگر ان کے دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد ان کا وہ حصہ بھی جو فئی میں سے مقرر تھا بیت المال کا حق ہو گیا صدر اسلام میں فئی کے چار باقی حصے فوج والوں پر تقسیم ہو جاتے تھے جو مہاجرین اور انصار کا گروہ تھا اور سب کو برابر برابر حصہ ملتا تھا یہاں تک کہ عمر نے دفتر مرتب کیا اور جنگی لوگوں کی تنخواہیں مقرر کیں جنکا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اس وقت سے فئی کی آمدنی بیت المال میں جمع ہونے لگی اور اس میں سے فوجی سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کو انکے مقررہ حقوق دینے میں خرچ کیا جانے لگا۔

اس سے قبل جو امور بیان ہو چکے ہیں انمیں کہا دیا گیا ہے کہ اہل صدقات فئی اور غنیمت پانے والوں کے علاوہ ہوتے تھے اسلئے صدقے فئی کے مستحقوں میں اور فئی کا مال صدقوں کے حقداروں میں تقسیم نہیں ہوتا تھا۔ مال غنیمت ہجرت کرنے والوں اور ان جنگی لوگوں کا حق تھا جو اشاعت اسلام میں سعی کرتے تھے اور صدقہ کے مستحق لوگ نہ تو جنگی لوگوں میں سے تھے اور نہ مہاجرین کیونکہ صدر اول میں مہاجر کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا تھا جنہوں نے اسلام کی طلب کیلئے اپنے وطن سے مدینہ کیجانب ہجرت کی تھی جس گھرانے کے تمام لوگوں نے اسلام قبول کر کے ترک وطن کر دیا تھا وہ "بررۃ" کہلاتے تھے اور جس خاندان کے چند لوگوں نے ترک وطن کیا تھا ان کو "خیرۃ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ گویا اس لحاظ سے تمام مہاجر لوگ دو قسم کے تھے ایک "بررۃ" دوسرے "خیرۃ"۔ اسکے بعد ایک وہ زمانہ آیا کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہو گیا اور جزیرہ عرب کے اسلامی مفتوحات میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں کی صرف دو قسمیں رہ گئیں۔ ایک قسم کے لوگ "مہاجر" کہلاتے تھے اور دوسرے "اعراب" کیونکہ صدقہ پانے والے لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں "اعراب" کے نام سے موسوم ہوتے تھے اور فئی کا حصہ پانے والے "مہاجرین" کہلاتے تھے اسی بارہ میں ایک شاعر یوں کہتا ہے:۔

تدارا افضا الیاں بعصابی ادرح خراج من الذرابی[1]

مہاجر لیس باعرابی

صدر اسلام میں خلفائے مہاجرین اور اعراب کے مابین فرق کرنے میں نہایت حیران ہیں کیا

---

[1] صدقات لینے والے کیلئے ایسا لبادہ دیا ہو جو قیمتی لبادہ سے زیادہ خوش رنگ ہو گیا تھا ہو تو وہ مہاجر ہے نہ کہ اعرابی۔

کرتے تھے اسلیئے جس وقت خلیفہ یہ ارادہ کرتا کہ کسی طالب کو کچھ مال عطا کرے تو اس کو [illegible] کے مال میں سے
اسوقت تک نہ دیتا تھا جبتک کہ اس عطیہ کا نفع عامہ مسلمین کے رفاہ تک نہ پہنچتا ہو ورنہ وہ اس شخص کو صدقہ
کے مال میں سے دیتا اور عمر بن الخطابؓ کی نسبت اس قسم کے بہت سے قصے روایت کیئے جاتے ہیں جو اس بات
پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس قاعدہ پر نہایت سختی کیساتھ قائم رہے منجملہ ان قصوں کے ایک حکایت یہ بھی ہے:

عمرؓ کی خدمت میں ایک اعرابی نے حاضر ہو کر عرض کی:

یا عمر[1] الخیر جزیت الجنة ... اکس بنیاتی وامهنه
وکن لنا من الزمان جنة ... اقسم بالله لتفعلنه

عمرؓ نے فرمایا "اگر میں اس بات کو نہ کروں تو کیا ہوگا؟"

اعرابی نے کہا "اذن[2] ابا حفص لاذهبنه"

عمرؓ "اگر تم نے بسر کرلیا تو پھر کیا ہوگا؟"

اعرابی: یکون[3] عن حالی لتسألنه ... یوم یکون الاعطایا هنه
والموقف المسئول بینهنه ... اما الی نار[4] واما جنه

اعرابی کے برجستہ جوابات سنکر عمرؓ اس قدر روئے کہ ان کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور
انہوں نے اپنے غلام سے کہا "اے غلام! میرا یہ کرتہ اس شخص کو اس دن کیلئے دیدے نہ کہ اس کی
شاعری کے صلے میں نہیں دیتا بلکہ اس دن کے ڈر سے دیتا ہوں! اور خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ اس کرتہ
کے سوا میں کسی اور چیز کا مالک بھی نہیں ہوں"۔ اس کے بعد اعرابی کو کچھ انعام وغیرہ دیا صرف اپنی ذاتی
مال میں سے عطا فرمایا مسلمانوں کے مال میں سے نہیں اس لئے کہ اس کی نغز گوئی کا صلہ ان کی ذات
کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں پڑتا تھا لہذا وہ عام مصالح کی حد سے خارج ہو گیا تھا۔

جن باتوں نے لوگوں کو عثمان کا دشمن بنا دیا منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے [illegible]

---

۱ اے نیک عمر تم کو جنت ملے تم میری لڑکیوں اور ان کی ماں کو کپڑے پہنا دو تم میرے لئے زمانہ کے صدمات
روکنے والی ڈھال بنجاؤ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو گے ۲ تو ایسی حالت میں بھی اے ابو حفص میں ضرور [illegible]
(زمانہ کی) جو تم وہ بسر ہی کرلیں گے ۳ وہ ایسی جگہ ہوگی جہاں تم سے ان کا حال دریافت کیا جائیگا وہ ایسی [illegible]
کہ وہاں عطیات نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ ایسی ذمہ داری کی جگہ ہوگی جس کو یا دوزخ تک یا جنت تک [illegible]

لوگوں کو انعامات بانٹنے شروع کردیئے تھے اور متذکرہ بالا دونوں باتوں کے مابین کسی فرق کا لحاظ نہیں رکھا تھا ہجرت کا زمانہ گزر کر اسلامی دولت (حکومت) کا دور شروع ہوا۔ تو مسلمان حکمرانوں نے دونوں قسم کی آمدنیوں زکاۃ و صدقات اور فیٔ کو دونوں مذکورہ بالا فریقوں کے مابین حسب ضرورت وقت اور مناسب حال صرف کرنا جائز رکھا جوں جوں اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر فیٔ کی آمدنی بڑھتی گئی اور اسکے ابواب متعدد ہوتے گئے اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ملکی حکام کی وصول کردہ رقمیں جو اموال کی مختلف اقسام مثلاً زکوٰۃ۔ جزیہ خراج عشر۔ جہازوں کی آمدنی کا دسواں حصّہ وہ خمس کی آمدنیاں جو کانوں کی پیداوار اور چراگاہوں کے محاصل سے ہاتھ آتی تھیں ٹکسال کی آمدنی رصدخانوں۔ جاگیروں اور محفوظ ذخائر غلہ کے محاصل وغیرہ وغیرہ ان سب کا نام فیٔ رہ گیا۔ صدقات کے متعلق اوپر بہت تفصیل کردی گئی ہے مگر اب آگے چل کر ہم ان آمدنیوں کا ذکر کریں گے جو فیٔ کی آمدنیوں میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم تھیں

جزیہ

جزیہ اور خراج اس طرح تو باہم بہت ملتے ہوئے ہیں کہ وہ دونوں اہل غیر مسلم لوگوں سے وصول کئے جاتے ہیں اور فیٔ کی آمدنیوں میں داخل ہیں جو ہر سال مقررہ اوقات میں واجب الادا ہوتی ہیں مگر اس حیثیت سے ان دونوں میں فرق ہے کہ جزیہ ہر آدمی پر مقرر ہوتا ہے اور اسلام قبول کر لینے سے وہ ساقط ہو جاتا ہے لیکن خراج اسلام لانے سے بھی ساقط نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ادا کرنا مسلم اور غیر مسلم دونوں کیلئے ضروری ہے۔

جزیہ کی تاریخ

جزیہ کچھ اسلام کے محدثات (نئی پیدا کی ہوئی باتوں) میں سے نہیں ہے بلکہ یہ تمدن قدیم کے زمانہ سے رائج چلا آیا ہے ایتھنز کے رہنے والے یونانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ساحل ایشیائے کوچک کے رہنے والوں پر جزیہ مقرر کیا تھا اور انہوں نے اس جزیہ کا تقرر اس فرض کے معاوضہ میں کیا تھا جو انہوں نے ان مقامات کے باشندوں کو اہل فنیقیہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی بابت اٹھائی تھی اور فنیقیہ اس زمانہ میں اہل فارس کا مقبوضہ ملک تھا ان سواحل کے باشندوں کو اپنی جانوں کی حفاظت کے مقابلہ میں مال کا دیدینا آسان معلوم ہوا اور انہوں نے اسے خوشی کے ساتھ منظور کر لیا تھا رومانی لوگوں نے جن قوموں کو زیر کر کے اپنا تابع فرمان بنایا ان پر انہوں نے مسلمانوں کی اس مقدار جزیہ سے جس کو فاتحین اسلام نے اس زمانہ کے بعد مقرر کیا تھا کہیں اور کئی حصہ بڑھ کر جزیہ مقرر کر دیا تھا کیونکہ رومانی لوگوں نے جس زمانہ میں گال (فرانس) کا ملک فتح کیا ہے تو انہوں نے وہاں کے ہر ایک باشندہ پر جزیہ مقرر کیا تھا جسکی مقدار (۹) سے (۱۵) گنی سالانہ تک کے مابین ہوتی تھی پس کہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے مقرر کردہ جزیہ

سات گنی تھی رومانی لوگوں نے جن ممالک کو فتح کیا تھا کچھ ان سبھوں میں جزیہ کی تعداد اتنی ہی بھاری نہیں کبھی تھی مگر وہ گال ایسے ہی بعض اور مقامات میں اتنا بھاری جزیہ لگانے کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ ان جگہوں میں جزیہ کی رقم اشراف سے انکی اپنی اور انکے نوکروں چاکروں اور غلاموں کی بابت وصول کیجا یا کرتی تھی فارس والے بھی اپنی رعایا جزیہ وصول کرتے تھے ہمارے مشہور ہندی علامہ دوست شیخ شبلی النعمانی کا خیال ہے کہ جزیہ کا لفظ اصل میں فارسی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا اصلی ملفظ "گزیت ہے"، چنانچہ علامہ موصوف نے اپنے اس قول کا ایک رسالہ میں جو انہوں نے ۱۸۹۴ء کے اندر شائع کیا ہے بہت تفصیل کے ساتھ بنایا بھی ہے اور علامہ ابن اثیر نے کسرٰی نوشیرواں کے اس برتاؤ کا بیان کرتے ہوئے جو اس نے خراج اور جزیہ کے بارہ میں برتا تھا لکھا ہے اور فارس کے حکمرانوں نے محکوم لوگوں پر جزیہ کا ادا کرنا لازم کر دیا تھا سوائے بڑے بڑے لوگوں اور شریف خاندان والوں اور فوجی خدمت انجام دینے والوں اور مرزبانوں اور منشیوں کے۔ اور ان لوگوں کے جو بادشاہ کی خدمت میں رہتے تھے ہر ایک انسان پر اس کے مرتبہ اور آمدنی کے انداز سے ۱۲۔ ۸۔ ۶ اور ۴ درم مقرر کئے گئے تھے" یہ قول بھی ہمارے فاضل دوست شیخ شبلی نعمانی کے کلام کا مؤید ہے اسلئے یہ بات ظاہر ہے کہ اہل عرب نے جزیہ کے لفظ کو لفظاً اور معناً دونوں اعتبار ہی سے فارس والوں سے لیا اور اسے معرب کر لیا جس کی وجہ سے وہ لفظ (جزیہ) ہوگیا اور مسلمانوں نے اس آمدنی کے جمع کرنے کی کیفیت میں عمل اختیار کیا، جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے اور مسلمانوں نے بھی اس رقم کو اہل اسلام کے ذمہ سے اسیطرح اٹھا دیا جسطرح کسرٰی کے معزز لوگوں اور بڑے گھرانے والوں وغیرہ کو اس سے بری کر دیا تھا کیونکہ مسلمان حکام کے ہاں عام اہل اسلام کا وہی درجہ تھا۔ جو کسرٰی کے ہاں فوجی سپاہیوں اور معزز لوگوں وغیرہ کو حاصل تھا اور جن کو اس نے جزیہ سے بری کر دیا تھا۔

جزیہ کی مقدار

مسلمانوں نے جزیہ کی جو مقدار مقرر کی تھی اسکی صورت مختلف ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) حالت اور موقع کے مطابق اور اس کی رضامندی کا لحاظ کرکے جو کہ ان اور انکے دشمنوں کے مابین قرار پا جاتی تھی جزیہ مقرر فرماتے تھے چنانچہ جس وقت انہوں نے "نجران" کے رہنے والوں سے مصالحت کی ہے تو ان کے مابین رضامندی اس بات پر ہوئی تھی کہ نجران والے سال بھر میں اس انداز سے جزیہ ادا کیا کریں کہ ۱۰۰۰ حلّے صفر کے مہینہ میں اور ۱۰۰۰ حلّے رجب کے مہینے میں دیں اور ہر حلّہ کی قیمت ایک اوقیہ (چاندی) ہو اور اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہونا چاہیئے" اھ "ح" والوں سے ہر رجب کے مہینے میں سو دینار ادا کرنے پر مصالحت کی اور "مقنا" کے باشندوں سے انکے ہاں کی لکڑیوں بنے ہوئے کپڑوں اور پھلوں کے چہارم حصہ

سالانہ لیتے رہنے پر صلح کی اور ان کے علاوہ اسی طرح جیسے جزیرہ عرب کے یہودیوں سے بھی صلح کر لی تھی،
ابی بکرؓ کے آخر عہد تک جزیہ کی کوئی مقدار معین نہیں رہی مگر جو وقت عمرؓ کا دور خلافت شروع ہوا
اور اسلامی فتوح میں وسعت و کثرت ہوئی تو جزیہ کی بھی ایک مقدار مقرر کی گئی عمرؓ نے فوجی افسروں کے نام یہ
حکم صادر فرمایا کہ ہر ایسے شخص پر جس پر استرا چل گیا ہو (یعنے اس کے ڈاڑھی مونچھیں آگئی ہوں) جزیہ مقرر
کر دو اور جنکے پاس صرف چاندی کے سکے ہیں اُن سے چالیس درم اور سونے کے سکے رکھنے والوں سے
چار دینار سالانہ لو اسکے علاوہ ان جزیہ ادا کرنیوالوں پر لازم ہے کہ وہ مسلمان کی خوراک کیلئے ہر مہینہ میں دو "مد"
(ایک پیمانہ تھا) گیہوں اور "تین" اقساط" زیت (روغن زیتون) بھی ادا کیا کریں اور ہر انسان کیلئے جو شام اور
جزیرہ میں ہے اتنا ہی ہوگا اسکے بعد جزیہ کی شرح معتدل ہو کر لوگوں کے درجوں اور مقدرت کے اعتبار سے مقرر کی گئی
اب اس کا تعین یوں ہوا کہ بظاہر اچھے مالدار شخص پر سالانہ ۴۸ درم واجب الادا کیے گئے جو ۴ درم ماہوار کے
قسط سے ادا کرنے پڑتے تھے متوسط الحال آدمی پر ۲۴ درم سالانہ یعنے دو درم ماہوار کی قسط سے اور فقیر پر ۱۲ درم
سالانہ اور بچوں اور عورتوں اور اہل عبادات اور اُن رہبانوں سے جو گوشہ نشینی اختیار کر کے لوگوں سے ملنا جلنا
ترک کر دیتے تھے کچھ بھی نہ لیا جاتا تھا یہ مقدار جزیہ کی عام طور پر رائج تھی لیکن وہ ممالک اس قاعدہ سے خارج تھے جن کی
فتح کیوقت کسی خاص اتفاق سے جزیہ کی شرطیں قرار پائی تھیں جیسے کہ امیر عمرو بن العاص کیساتھ مصر کی
صلح قرار پاتے وقت یہ ٹھیرا تھا کہ قبطی لوگ شریف ہوں یا وضیع جوانیں سمجھدار اور بالغ ہو چکے ہیں وہ سب
فی نفر دو دو دینار ادا کرینگے شیخ فانی اور نابالغوں اور عورتوں پر کچھ بھی نہیں ہوگا اور قبطیوں پر لازم ہوگا
کہ جو مسلمان لوگ اُنکے ملک میں آئیں اُن کی تین دن دعوت کریں اور اسکے سوا کئی اور باتیں بھی طے پائی تھیں
اکثر حالتوں میں جزیہ کی مقدار اس لحاظ سے مقرر کرتے تھے کہ جو کچھ لوگوں کے پاس انکی آمدنی اور خرچ کا
موازنہ کرنیکے بعد بچ رہے وہ مقدار جزیہ میں لیجائے جیسا کہ ملک عراق میں جزیہ والوں کیساتھ کیا گیا کیونکہ جس افسر نے
اس ملک کو فتح کیا اُسنے وہاں کے ہر نفر پر ایک دینار جزیہ مقرر کر دیا تھا مگر جس زمانہ میں عبدالملک بن مروان خلیفہ ہوا
تو اُسنے رقم مذکورہ کو بہت کم خیال کیا اور اپنے اس عامل کو جو جزیرہ پر مقرر تھا اسکی بابت تحقیقات کرنیکا حکم
بھیجا اُسنے وہاں کی مردم شماری کرائی اور تمام لوگوں کو کاروباری اور پیشہ ور بنایا اور یہ حساب کیا کہ ایک
پیشہ ور یا کاریگر تمام سال میں کسقدر کماتا ہے اس آمدنی میں سے اسکے کھانے پہننے کے اخراجات حسب حیثیت
کم کیے اور تعطیلوں کے دن مجرا دیکر حساب لگانے سے ان سب کا حاصل یہ ہوا کہ فی کس چار دینار سالانہ بچتے ہیں اسلئے

اسنے ان لوگوں پر چار دینار جزیہ لگا دیا اور سب کو ایک ہی طبقہ اور درجہ میں رکھا ۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں جزیہ صرف غیر مسلم لوگوں سے لیا جاتا ہے اور جس وقت کوئی جزیہ دینے والا مسلمان ہو جائے تو اس کے ذمہ سے وہ ساقط ہو جاتا ہے مگر عبد الملک بن مروان کے عہد میں اس قاعدہ کی پابندی ترک کر دی گئی تھی کیونکہ حجاج نے اُن ذمیوں پر بھی جزیہ مقرر کر رکھا تھا جو داخل اسلام ہو چکے تھے عبد الملک نے اپنے بھائی عبد العزیز کو جو اس کی طرف سے ملک مصر کا عامل تھا فرمان بھیجا کہ وہ بھی مصر میں نو مسلم ذمیوں کو جزیہ سے بری نہ کرے عبد العزیز بن مروان نے عبد العزیز بن حجیرہ سے جو اسکے خواص میں سے تھا اس بارہ میں رائے طلب کی۔ ابن حجیرہ نے اس بات کو بہت بُرا خیال کیا اور کہا خدا کی پناہ! کیا تمہیں کو ملک مصر میں اس بُرے قاعدہ کے رواج دینے میں سب سے اول نمبر لینا ہے؟ واللہ اہل جزیہ اپنے راہبوں تک کا جزیہ تو برداشت کرتے نہیں اب تم اُسے اُن لوگوں پر کیونکر مقرر کر دو گے جو انمیں سے مسلمان ہو گئے ہیں؟" یہ بات سن کر عبد العزیز بن مروان اس خیال سے باز آ گیا مگر جب مشہور زاہد اور نیک طینت خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا عہد آیا تو انہوں نے اس بُرے قانون کو ملک عراق سے بھی اُٹھا دیا اور اس کے بعد سے پھر کبھی کسی مسلمان پر جزیہ مقرر نہیں ہوا غیر مسلم لوگوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے کیوں نہوں جزیہ قبول کیا جاتا مگر بت پرست عرب لوگوں یا مرتد (دین اسلام سے پھر جانیوالے) لوگوں سے نہیں بلکہ ان کیلئے سوا اسلام یا تلوار کے اور کسی بات کی منظوری نہیں ہوتی باقی رہے۔ نصاریٰ۔ یہود۔ مجوس (آتش پرست) اور عجمی بت پرست اُن سے تین چیزوں میں سے ایک قبول کیجاتی۔ اسلام۔ جزیہ۔ یا تلوار۔ +

اس خاص قید و بند لگانے سے مقصود یہ تھا کہ عربی قوم قوم واحد کی حیثیت سے تیار ہو اسی لئے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی حیات ہی میں جزیرہ عرب سے بت پرستی کا نشان کھو دیا تھا اور عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ان باقیماندہ یہود اور نصاریٰ کو بھی نکالدیا جو عہد نبوت میں کہیں کہیں پڑے رہ گئے تھے۔

ہم اس بات کو بیان کر آئے ہیں کہ جزیہ ان لوگوں کے سوا اور کسی پر مقرر نہیں ہوتا جو بالغ ہوں اور تندرست اور اسکے معنے یہ ہیں کہ جزیہ قتل یا قتال (جنگ) کا بدلہ ہے یعنے یہ کہ جزیہ کا ادا کرنیوالا شخص نہ قتل کیا جائیگا اور نہ جنگ میں بلایا جائیگا چنانچہ سلطنت عثمانیہ کی بھی نصرانی رعایا "ورغیسکریہ" کے نام سے مشہور ٹیکس ادا کرتی ہے جو اس لحاظ سے جزیہ کیساتھ بہت مشابہ ہے کیونکہ یہ ٹیکس ان سے فوجی خدمت سے معاف ہونے کے معاوضہ میں لیا جاتا ہے۔ +

خراج

خراج کی تاریخ

خراج اس کو کہتے ہیں جو لگان کی قسم سے زمین پر مقرر کیا جاتا ہے یا اراضیات کا محصول جو اقسام لگان میں سب سے قدیم ہے اس کے وضع ہونے کی اصل یہ ہے کہ لوگ زمین کو بادشاہ یا شاہنشاہ کی ملک خیال کرتے تھے۔ یہ اعتقاد بھی بہت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے توراۃ میں زمین کے زراعۃ مصر کی ملکیت میں داخل ہونیکی بابت صاف و صریح اقوال پائے جاتے ہیں سفر تکوین (پیدائش) کے سنتالیسویں باب میں مشہور قحط و گرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو وقت قحط کے زمانہ میں مصر کے رہنے والوں کو بھوک نے تنگ کیا تو انہوں نے یوسف علیہ السلام کے پاس سے غلہ خریدنے میں اپنی تمام کمائی از قسم سونے چاندی اور چارپایوں کو بیچ دی اور جب انکے پاس زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ بچی تو اسے بھی روٹیوں کے معاوضہ میں بیچ دی۔

دیگر قدیم ملکوں میں بھی زمین کی یہی حالت تھی پس زمین بادشاہ کی ملک ہے اور اسکے رہنے والے صرف اسکی پیداوار سے نفع اٹھاتے ہیں اس پیداوار میں حکومت کا بھی ایک حصہ مقرر ہوتا ہے اسی کو خراج کہتے ہیں تاتاری لوگوں کی عادت میں داخل تھا کہ انسان چوپایوں کی ملک سے مالدار ہوتا ہے باقی رہی زمین اسکی ملکیت کا حق افراد کو حاصل ہونا ناپسند کرتے تھے قدیم جرمنی والے زمین کو صرف اپنے حکام اور رئیسوں کی ملکیت خیال کرتے تھے اسی لئے انکے ہاں جو شخص قبیلہ کا سردار ہوتا تھا وہ اراضیوں کو افراد قبیلہ پر تقسیم کر دیتا تھا اور آئندہ سالوں میں پھر انکو باری باری اول بدل کر کے یہی اراضیاں تقسیم کرتا رہتا غرضیکہ ایک قطعہ کو ایک ہی شخص متواتر دو برس تک زیر کاشت نہ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ "صقالیہ" کے بعض گھرانوں میں آجتک ایسی ہی عادت شائع ہے۔

اسی سے رومانی لوگ اپنی سلطنت کی اراضیوں پر لگان باندھتے تھے اور مصر و شام وغیرہ بھی منجملہ انہیں ممالک کے تھے جن کو مسلمانوں نے اہل روم کے ہاتھوں سے چھینا اور سرفتح کیا تھا رومانی لوگوں کے زمانہ میں ہر ایک صوبہ کے اندر خراج کا ایک خاص دفتر ہوتا تھا جس میں اس صیغہ کے اعمال اور اس کی آمدنی و خرچ مرتب رکھا جاتا تھا اس صیغہ (محکمہ) میں محرر، محصل اور کارکن ملکی لوگوں میں سے یا فرقہ حکام سے مقرر کئے جاتے تھے اہل فارس کی بھی عراق و فارس میں یہی حالت تھی کیونکہ فارس والوں نے رومان اور یونان کے قوانین میں سے اکثر کا اقتباس کیا تھا۔

مسلمانوں نے ظاہر ہو کر شام، مصر اور عراق وغیرہ ممالک فتح کرنیکے بعد انمیں کسی قسم کا تغیر نہیں کیا بلکہ

وہاں خود بھی اسی طرح دفاتر اور محکمے قائم کئے دفتروں کے محرر خاص ملکی لوگوں میں سے مقرر ہوتے تھے جو مذہباً نصاری اور مجوس تھے اور جس طرح اگلی حکومتوں کے عہد میں ان خدمتوں پر مامور رہتے چلے آئے تھے اسیطرح اس عہد میں بھی جگہ پاتے رہے چنانچہ ملک مصر میں محکمہ خراج کے کارکن قبطی لوگ تھے اور اُنکے دفاتر قبطی ہی زبان میں لکھے جاتے تھے شام میں جو دفتر تھا اسکے کارپرداز رومی تھے جو رومی زبان میں لکھا پڑھا کرتے تھے اور عراق کا دفتر فارسی زبان میں تحریر کیا جاتا تھا اہل عرب صرف دفتروں کے کام کو دیکھنے بھالنے اور انکی آمدنی کو اپنے قبضہ میں کر لینے سے مطلب رکھتے تھے گویا کہ ان کو ملک کے فتح کرکے کچھ وہاں کا مالک بننا مقصود ہی نہیں تھا اور اس کی اصلی وجہ ان دنوں میں ان کا دنیداری کیجانب مائل اور دنیا کی جانب سے متنفر ہونا تھی مگر جب وقت حکومت کا سر رشتہ بنو امیہ کے ہاتھوں میں آیا اور مسلمان لوگ بدویانہ زندگی کی تاریکی سے نکل کر شہری زندگی کی روشنی میں آئے اور انکی جبلی سادہ لوحی لکھنے پڑھنے اور باخبر ہو جانیسے فہم و فراست سے بدلگئی اور اہل عرب اور انکے آزاد شدہ غلاموں میں بہت سے لائق لائق منشی اور حسابدان پیدا ہوگئے تو انہوں نے دفاتر کو اپنی زبان میں بدل لیا اور وہاں کے کاروبار پر مسلمانوں میں سے کام کرنیوالوں کا تقرر کرنے لگے۔

اہل عرب میں سے جس شخص نے سب سے اول انقلاب کو رائج کیا وہ عبد الملک بن مروان تھا اسنے ۸۱ھ کی قریب یہ تغیر کیا اُسیوقت سے تمام دفتر عربی زبان میں ہوگئے اور دراصل عربی دفاتر کہلانے کے مستحق ہوئے اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ عبد الملک اس تغیر کا صرف شروع کرنیوالا تھا مگر پھر اسکی تکمیل اسکے جانشینوں نے کی کیونکہ ملک مصر کے دفاتر ۸۷ھ کے قریب جاکر ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں پوری طرح عربی میں منتقل ہو چکے تھے

باقی رہا حجاز کا صوبہ اس کا دفتر مدینہ میں اسی طرز اور انداز پر تھا جس طرح کہ عمر بن الخطاب نے اسے مقرر کر دیا تھا اور جسے ہم اس کی جگہہ پر بیان کر آئے ہیں اور وہ دفتر اس صورت سے بہت مشابہ تھا کہ اُسے فوجی یا اعمال اور وصول لگان کا دفتر کہیں اس لئے کہ اسمیں صحابہ کے نام مدون کئے گئے تھے اسکے وظائف اور طبقے متعین ہوئے تھے اور مصر شام اور عراق کے ممالک سے فوجکی تنخواہیں اور روزینے کے بعد جسقدر بقایا حصہ خراج اور جزیہ کا مدینہ کو آتا تھا وہ بھی اسی دفتر میں منضبط کیا جاتا تھا لیکن ابتدائے اسلام میں راشدین اور بنو امیہ کے عہد کی حالت یہ تھی کہ خود خلفاء بہ نفس نفیس خراج کے کاروبار کی نگرانی اور اس کی وصولیابی کا بندوبست کیا کرتے تھے مگر جب عنان حکومت بنو عباس کے قبضہ میں آگئی تو انہوں نے خراج کا بھی ایک صدر دفتر دار الخلافت میں قائم کیا اور صوبجات کے دفتروں کو اسکا ماتحت بنا دیا

اس دفتر کا افتتاح خلیفہ سفاح نے کیا تھا اور اس کا کاروبار برامکہ کے بعد خالد بن برمک کے سپرد فرمایا تھا برامکہ کے معاملاً حکومت میں دخیل ہونے کا یہ پہلا زینہ تھا جس کیوجہ سے ان کو سلطنت کے خزانوں میں تصرف حاصل ہو گیا جس قسم کے تصرفات برامکہ نے حکومت کے مالی صیغہ میں کئے منجملہ اُنکے ایک یہ بات بھی تھی کہ وہ لوگ اپنے کنبہ والوں اور بیٹوں کو ممالک کے خراج کا ٹھیکہ (اجارہ) دیدیتے تھے جسطرح پر کہ خلیفہ مہدی کے عہد میں برمک کے بیٹے یحییٰ نے ملک فارس کے خراج کی ضمانت کی اور آخر کار اس میں اس کو خسارہ اُٹھانا پڑا اسکے بعد خراج کا دفتر بھی دیگر دفاتر کی طرح وزیروں کے قابو میں آگیا یہانتک کہ عباسی حکومت میں ضعف پیدا ہو نیز جبکہ امراء دولت حکومت کے صیغوں پر مالک بن بیٹھے تو راضی باللہ عباسی کے ایام میں تمام دفتر توڑ دیئے گئے

خراج کا مقرر کرنا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اہل عرب نے خراج اور اس کے دفاتر اسی طرز پر قائم کئے تھے جیسے کہ وہ اگلی حکومتوں (روم اور فارس) کے عہد میں رہتے چلے آئے تھے مقریزی کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل عرب خراج کی وصولیابی تعدیل یعنے بٹائی سے کیا کرتے تھے جب دیہات اور بستیاں آباد ہوتیں اور وہاں کے باشندے بکثرت ہو جاتے تو خراج بھی بڑھجاتا اور اگر وہاں کے باشندوں کی تعداد کم ہو جانیسے اُجاڑ ہو جاتیں تو خراج کو بھی گھٹا دیا کرتے تھے۔

ملک شام کی آمدنی بھی اسی انداز پر وصول کیجاتی تھی مگر اہل فارس اپنی اراضیات کا خراج مقاسمہ یا بٹوارے کے ذریعہ سے لیا کرتے تھے یہانتک کہ اسلام سے قبل فیروز کے بیٹے قباد نے اسکی پیمائش کرائی اور رقبہ کے لحاظ سے خراج اس طرح مقرر کیا کہ ایک جریب (۳۶۰۰ گز مربع۔ زمین پر ایک درم نقد اور ایک قفیز جنس پیداوار کی لگان میں وصول کیجائے اس لگان کے وصول کرنیمیں آراضیات کی حالت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا خواہ اسمیں پیداوار ہو یا نہو لگان ادا کرنا ضروری ہوتا تھا مسلمانوں نے ان ممالک کو فتح کرنیکے بعد حسب ضرورت حالات خراج میں تعدیل کی اور تمام ملک میں طرح طرح کی رعایتیں جاری کر دیں اہل اسلام نے اراضیات کی بابت چند عام قانون اور قاعدے بھی بنائے تھے جو حسب مندرجہ ذیل ہیں۔

اسلامی ممالک میں زمین کی چار قسمیں ہیں (۱) وہ زمین جس کو مسلمانوں نے نئے سرے سے قابل کاشت بنایا ہو یہ زمین عشر (دسویں حصہ) کی ہے یا اس اراضی کی پیداوار کا دسواں حصہ لیگا اور وہ اراضی احیاء اموات کی قسم سے شمار کیجائیگی (۲) وہ زمین جس کے باشندوں نے اسی پر قابض ہونیکی حالت میں اسلام قبول کیا ہو یہی لوگ اسکے پانیکے زیادہ مستحق ہیں اور وہ بھی عشر ہی کی زمین ہے (۳) وہ زمین جسے مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا ہو

اور وہ ان کیلئے مال غنیمت ہے اور وہ بھی عشر کی زمین شمار کیجاتی ہے (۴) وہ زمین جس کے باشندوں نے وہاں قابض ہونے کی حالت ہی میں مسلمانوں سے صلح کرلی ہو۔ یہ زمین خراج کیلئے مخصوص ہوتی تھی اور اس کا خراج کسی حالت میں باطل نہیں ہوتا تھا خواہ وہاں کے رہنے والے اسلام ہی کیوں نہ قبول کرلیویں ایسی زمین پر اسکے متحمل ہونے کے لحاظ سے مقرر ہوتا تھا یعنے اُسپر اتنا ہی خراج مقرر کیا جاتا تھا جتنا وہ برداشت کرسکے پھر جب ملک عراق فتح ہوا تو عمرؓ نے سواد عراق پر وہی خراج مقرر کیا جو اسپر اہل فارس نے لگا رکھا تھا یعنے فی جریب ایک قفیز اور ایک درم نقد قفیز جریب کا دسواں حصہ یعنے ۳۶۰ گز مربع ہوتا تھا عمرؓ نے عراق کے دوسرے حصہ میں اور طریقہ سے خراج مقرر کیا یعنے انہوں نے خراج کی مقدار کو پیداوار کی قسم کے تابع کردیا اور عثمان بن حنیف کو وہاں کی پیمائش کا حکم دیا جنہوں نے ان آراضیات کی پیمائش کرکے انگور کی ٹٹیوں اور گھنے درختوں کی ایک جریب پر دس درم اور کھجور کے درختوں کے ایک جریب رقبہ پر آٹھ درم اور جَو کی زمینوں کے ایک جریب رقبہ پر دو درم لگان مقرر کیا اور عمرؓ نے اس تشخیص جمع کو قبول فرمالیا۔

عراق کی زمین سے خلیفہ منصور کے عہد تک مساحت توظیف یا وظیفہ کی صورتوں میں خراج لیا جاتا رہا مگر چونکہ منصور عباسی کے زمانہ میں نرخ گھٹ گیا تھا اور پیداوار زمین کا لگان ادا کرنے کیلئے کافی نہوتی تھیں سواد کا حصہ بالکل ویران ہوگیا تھا اس لئے خلیفہ مذکور نے مقاسمہ (بٹائی) کا طریقہ جاری کردیا۔ جس کیوجہ سے غلہ زیادہ ہوتا تو خراج بھی زیادہ ہوجاتا اور وہ کم تو یہ بھی کم بٹائی کے خراج کی مقدار متعین کرنا خلیفہ کے ذمہ تھا مگر وہ نصف غلہ سے زیادہ اور پانچویں حصہ سے کم نہ ہوتا تھا۔

زمین کی ملکیت

زمین کی ملکیت اسی حالت پر رہی جو آغاز اسلام میں قائم ہوئی تھی یعنے وہ امام کی ملکیت تھی اور لوگ اسے صرف استعمال میں لاتے تھے حکومت کا ایک حق اس زمین کی پیداوار میں ہوا کرتا تھا اور اسکے علاوہ بعض اراضیاں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں جن کو "اواسی" اور "اباعدیہ" وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے تھے اور انکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے انیسویں صدی عیسوی کا آغاز جو مملکت عثمانی میں سیاسی اصلاحوں کے جاری ہونے کا زمانہ تھا بہت سے مفید تغیرات کا باعث ہوا منجملہ حکومت عثمانیہ کے صوبجات کے مصر بھی ایک صوبہ تھا جب وہ گذشتہ صدی کے اوائل میں محمد علی پاشا اعظم کے تصرف میں آیا تو انہوں نے دوراندیشی سے یہ خیال کیا کہ جبتک کاشتکار اپنی زمین کا مالک نہ ہوجائیگا اسوقت تک وہ اسکے تردد کا پورا اہتمام اور اسکی حالت کو درست رکھنے کی فکر نہ کریگا جبوقت محمد علی پاشا مصر کے گورنر مقرر ہوئے ہیں ملک مصر کی حالت تھی

کہ وہاں کی اراضیاں چند ذی مرتبہ اور با اثر امرا کے قبضہ میں تھیں جو لوگ کاشتکاروں کو زمینیں اٹھا دیا کرتے تھے اور ان کی کاشت کرایا کرتے پیداوار کی آمدنی سے حکومت کا مالیہ (جمع) ادا کرنے کے بعد باقی منافع سے خود فائدہ اٹھاتے اور عیش و عشرت کی داد دیتے رہتے تھے محمد علی پاشا نے مصر کا ملک کئی مدیریات (کمشنریوں) میں مدیریات کو مرکزوں میں اور ان کو نواحی میں منقسم کیا اور ان میں انتظام قائم رکھنے کیلئے تنخواہ دار افسروں کا تقرر کیا اور تحصیلدار لوگ مقرر کئے تاکہ وہ لگان اور گورنمنٹ کی جمع کو وصول کریں التزامات (تعلقہ داریوں) کو توڑ دیا اور ہر سمت کی اراضیاں خود وہیں کے باشندوں پر اس طرح سے تقسیم کر دیں کہ کاشتکار اس زمین کے حصہ پر جو اُسے ملا تھا اور دوسرے شخص کے حصہ کے برابر ہوتا کھیتی باڑی کر سکتا تھا۔

مگر سعید پاشا خدیو ہوئے تو انہوں نے اپنی وہ مشہور یادداشت جو ۵ اگست ۱۸۵۸ء کو صادر کی تھی جاری کی بعد ملکی باشندوں کیلئے زمین کو پورے طور پر شرعی ملکیت بنا دیا تاکہ وہ نسلاً بعد نسل انکے خاندانوں میں منتقل ہوتی رہے اسی وقت سے ملک مصر کی سرزمین مصری باشندوں کی ملک ہو گئی اسی قانون کیمطابق سلطنت عثمانیہ کے بھی تمام ممالک محروسہ میں عمل کیا گیا کیونکہ باب عالی نے سعید پاشا کی یادداشت پر جو اسبارہ پر لکھی گئی تھی دستخط ہمایونی کے ساتھ تصدیق فرما دی تھی۔

ارتفاع خراج

اس سے وہ رقم مراد ہے جو ہر سال ممالک کے خراج سے جمع ہوا کرتی ہے یہ ایک ایسی بات ہے جس کا متعین کرنا دشوار ہے کیونکہ باختلاف اوقات و مقامات یہ بھی مختلف ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ بھی دقت ہے کہ عرب مورخین اکثر حالتوں میں خراج کی مقدار بیان کرتے ہوئے جزیہ اور خراج دونوں آمدنیوں کو اکٹھا کر لیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خراج کی آمدنی۔ مگر اس سے مراد خراج اور جزیہ دونوں کی آمدنی ہوتی ہے جزیہ خراج سے بہت کم ہوتا تھا اور اسکے ثبات میں بھی بہ نسبت خراج کے کمی ہوتی تھی کیونکہ ذمی لوگ مرور زمانہ کیساتھ ساتھ اسلام بھی قبول کرتے رہتے تھے اسلئے جزیہ کی مقدار گھٹتی رہتی تھی بسا اوقات عرب مورخوں نے خراج کی آمدنی میں عشر (دہ یک) وغیرہ کی آمدنیاں بھی داخل کر دی ہیں اسلئے ہم آگے چلکر جو مثالیں دیں گے وہ بنو امیہ کے عہد میں وصول جمع کی مثالیں ہیں جن سے ان دنوں اسلامی ممالک میں رائج تھیں

عمرؓ کے عہد میں ۲۰ھ کے اندر "سواد" کے خراج کی مجموعی آمدنی ۱۲۰۰۰۰۰۰۰ درہم تھی اور ۶۲ھ کے قریب عبید اللہ بن زیاد کے زمانہ میں ۱۳۵۰۰۰۰۰۰ درہم ہو گئی اسکے بعد ۷۵ھ میں حجاج بن یوسف کے عہد میں ۱۸۰۰۰۰۰۰ درہم تک پہنچ گئی مگر ۱۰۰ھ کے اندر خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے وہاں کی توفیر ۱۲۰۰۰۰۰۰۰ درہم کر دی انکے بعد ابن ہبیرہ نے فوج کی خوراک اور جنگی لوگوں کے وظائف کے علاوہ ۱۰۰۰۰۰۰۰۰ درہم تک

تحصیل کیے پھر یوسف ابن عمر کا زمانہ آیا یہ والی ۶۰۰۰۰۰۰ درہم سے ۷۰۰۰۰۰۰ درہم تک دارالخلافت کو بھیجا
کرتا تھا اور اپنے ساتھ والے ملک شام کی فوج کے اخراجات میں ۱۶۰۰۰۰۰ درہم اور ڈاک ۴۰۰۰۰۰ درہم طوارق
۲۰۰۰۰۰ درہم صرف کیا کرتا تھا اسکے بعد بھی ۱۰۰۰۰۰۰ درہم احداث اور عواتق کے گھرانوں پر صرف کرنے
کیلئے اسکے پاس باقی رہ جاتے تھے اس حساب سے اسکے عہد میں "سواد" کی تمام جمعبندی تقریباً ۱۰۰۰۰۰۰ درہم تھی

ملک مصر سے عمرو بن العاصؓ نے ۲۰۰۰۰۰۰ دینار وصول کیے تھے مگر مقریزی کی عبارت سے ظاہر
ہوتا ہے کہ یہ رقم صرف جزیہ کی آمدنی تھی جو فی کس ۲ دینار کے حساب سے واجب الادا سمجھی گئی تھی چنانچہ مقریزی کا
قول ہے اور عمرو بن العاص کے بعد عبداللہ بن ابی سرح نے ملک مصر کا مالیہ ۴ ملین دینار تحصیل کیا بنو امیہ کے
عہد میں مصر کا خراج کم ہو گیا تھا یہاں تک کہ ہشام بن عبدالملک کا عہد (۱۰۵ھ لغایت ۱۲۵ھ) آیا تو اسکی
طرف توجہ ہوئی اور اُسنے اپنے وہاں کے عامل کو فرمان لکھا کہ ملک کی پیمائش کرے والی مصر نے خود تمام
آباد اور ویران زمینوں کی پیمائش کی تو اس سرزمین کو جسے دریائے نیل کا پانی سیراب کرتا ہے ۳۰۰۰۰۰۰
فدان[1] پایا یہ اراضی بنجر اور شور زمینوں کے علاوہ تھی پھر اُسنے ان اراضیات میں تعدیل کی جسکی وجہ سے اُسنے ۴۰۰۰۰۰
دینار قائم ہوئے اور اسی کیساتھ نرخ ارزاں تھا اور سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں اسامۃ بن زید نے
ملک مصر کا لگان ۱۲۰۰۰۰۰ درہم وصول کیا تھا اسکے بعد سے مصر کی توفیر کم ہوئی اور وہاں کی حالت روز
بروز خراب ہوتی گئی خصوصاً جس وقت خلافت بنی عباس کے ہاتھوں میں آئی اور مرکز خلافت وادی نیل سے بہت دور جا
پڑا یہاں تک کہ مصر کا خراج گرتے گرتے ۸۰۰۰۰۰ دینار پر آ رہا مگر جس زمانہ ۲۵۷ھ میں ابن طولون والی مصر مقرر
ہوا تو اُسنے وہاں کی زیر کاشت زمینوں کی پیمائش کرائی جسکی وجہ سے وہاں کی مالگذاری نرخ غلہ کی
ارزانی کیساتھ ۴۳۰۰۰۰۰ دینار تک پہنچ گئی اس زمانہ میں ایک دینار کو دس "اردب" گیہوں آتے تھے اسکے
بعد سے برابر بنی عباس کے تمام عہد حکومت میں مصر کا خراج اسی کے قریب رہا۔

ملک شام کا خراج عبدالملک بن مروان کے ایام میں ۱۷۲۰۰۰۰ دینار تک پہنچ گیا تھا اور اسی کیساتھ نرخ بازار
بھی بہت ہی ارزاں تھا مذکورہ بالا رقم میں ۱۸۰۰۰۰ "اردن" کی آمدنی سے اور ۳۵۰۰۰۰ فلسطین کی
توفیر سے اور ۴۰۰۰۰۰ دمشق کے محاصل سے اور ۸۰۰۰۰۰ حمص قنسرین اور عواصم کی مالگذاری سے آتے تھے۔

خراج کی ضمانت داری

خراج کی ضمانت لینے کی دو قسمیں ہیں۔
(۱) عاملوں گورنروں کو اس کی کمی بیشی کا ضامن ٹھہرانا اسلامی شریعت میں نادرست ہے

[1] اس پیمانہ مساحت کا مملکت اسلامیہ کے باب میں ذکر آچکا ہے۔

اسلئے کہ عامل محض ایک معتمد علیہ اور امانتدار ہوتا ہے جو واجب شدہ لگان جمع کرتا اور حاصل کیا ہوا خراج دربار خلافت میں نذر کرتا ہے اس حیثیت سے وہ مثل ایک وکیل کے ہے جسوقت اُسنے اپنی امانت ادا کردی پھر اسکے ذمہ کسی امر کی ضمانت نہیں صدر اسلام میں صحابہؓ اس خیانتداری کو بہت زور کے ساتھ منع کرتے تھے ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا جس نے "ابلہ" کو ایک لاکھ درہم خراج ادا کرنے کی ضمانت پر اُن سے لینا چاہا ابن عباسؓ نے اس شخص کو سو کوڑے مارے اور دوسرونکو عبرت دلانے کی غرض سے اُسے زندہ دار پر کھینچ دیا مگر جس وقت اسلامی خلافت دنیاوی ملکداری کے لباس میں آگئی تو خلفاء نے اس امر کیجانب سے چشمپوشی اختیار کی وہ لوگ اکثر حالتوں میں اپنے عاملوں کو تو فیر خراج کا ضامن بناتے تھے' اوران کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی ولائیتوں اور عمال کو ایک خراج کی مقدار مقررہ پر حکام اور والیوں کے حوالہ کیا کرتے تھے' اور وہ حکام ملک کی مالگذاری کو تحصیل کر کے زائد رقم خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہو خود لے لیا کرتے تھے جیسا کہ برمک کے بیٹے یحییٰ اور اسکے سوا چند اور شخصوں نے کیا اور خلفاء اسلام نے اس تضمین کے رواج پاجانیکے بعد قاضیوں محتسبوں اور پولیس والوں کی بھی ضمانتیں لینی شروع کردیں جسکا بیان آگے چل کر آئے گا۔

(۲) شکل خراج کی ضمانت لینے کی یہ تھی کہ التزام والوں کو اس کا ضامن بنادیا جاتا اہل التزام وہ لوگ ہوتے تھے جو مالدار یا صاحب حکومت و مرتبہ ہوتے وہ اراضیوں کو قبول کرتے تھے یعنے اسکی ضمانت لیتے تھے اور متولی خراج سے معاہدہ کرلیتے کہ اسقدر مال پر (جو باہم بڑھ کر بولیاں بولنے سے طے پاجاتا) ہم یہ اراضیاں لیتے ہیں اسطرح ایک شخص ایک گاؤں یا ایک شہر (ضلع) یا پرگنہ ضمانت پر لیتا اور اسمیں زراعت کرتا یا شکمی کاشتکاروں کو اُٹھا دیتا اسکی پیداوار سے اس زمین کا خراج ادا کرنیکے بعد جو باقی بچتا اُسے اپنے تصرف میں لاتا' اسطرح اراضیات کی ضمانت لینی یا ان کا التزام کرنا کچھہ اسلام کی اختراعات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ قاعدہ اہل یونان کے قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے اور رومانی قلمرو میں پوری طرح اس کا رواج تھا انہیں سے اہل عرب نے بھی اس قاعدہ کو اخذ کیا۔

اسلامی قلمرو میں اراضی کی تضمین کا دستور اسوقت سے کچھہ ہی قبل تک برابر قائم ورائج رہا اور اس طریقے کے رواج پر کئی دور گذر گئے جنہیں اُسنے کئی مختلف انقلابات بھی دیکھے اور اسکے اندر تغیر و تبدل بھی ہوا اسی قسم کی باتوں میں سے عشر کی آمدنیوں کی ضمانت کرانی ہے جو آجتک سلطنت عثمانیہ میں رائج ہے۔

خراج کے توابع

اسلامی عہد حکومت میں مالی آمدنیوں کے اندر اراضی کے خراج اسکے عشر اور صدقات اسلام اور جزیہ کے علاوہ جہازوں کے مال کا دسواں حصہ کانوں کی پیداوار کا خمس

(یا پچواں حصہ) دار الضرب (ٹکسال) رصدخانوں اور علاقوں کا منافع، آبپاشی کی آمدنی اور چراگاہوں اور جنگلوں اور دریاؤں کے ٹکس وغیرہ بہت سی قسموں کی دوسری آمدنیاں بھی تھیں جو خراج ہی کی قسم سے شمار ہوتی ہیں۔

جہازوں کے عشر ان جہازوں سے لئے جاتے تھے جو بعض سرحدی مقاموں پر ہو کر گزرتے تھے ایسے جہازوں کے مجموعی بار کردہ مال میں سے دسواں حصہ نقد یا اصل جنس کی صورت میں لیتے تھے مین کے عامل اس ٹکس کو ان جہازوں سے وصول کیا کرتے تھے جو ہندوستان سے آتے ہوئے انکے ساحل سے گذرتے تھے ان جہازوں پر طرح طرح کی خوشبودار لکڑیاں مثلاً عود اور صندل اور مشک کافور عنبر اور دار چینی وغیرہ اشیا بار ہوتی تھیں اسی لئے حکام مین ایسے جہازوں کا ٹکس اصل جنس کی صورت میں لیا کرتے تھے چنانچہ واثق باللہ عباسی کے عہد میں جہازوں کی عشر کی آمدنی سے بڑی بیش قرار رقم حاصل ہوتی تھی۔

اندلس کے مسلمان حکمران ان جہازوں سے ٹکس وصول کیا کرتے تھے جو آبنائے جبل طارق کیطرف ہو کر آمد و رفت رکھتے تھے اہل فرنگ وغیرہ جسوقت اس آبنائے میں ہو کر اپنے جہاز لیجاتے تو ایک شہر میں پہنچکر جو جنوبی سمت میں مملکت اندلس کا آخری سرحدی مقام ہے اور اسوقت میں اس کا نام "طریف" تھا اس ٹکس کو ادا کیا کرتے تھے آجکل اس شہر کا نام طریفہ (Tarifa) ہے اور اہل فرنگ لفظ (Tariff) کے بارہ میں (جو انکے یہاں درآمد و برآمد مال کے محصولوں پر دلالت کرتا ہے یا اس تحریر پر دال ہے جس میں وصول کردہ ٹکس کی تفصیل ہوتی ہے اور جس کو "روزنامہ" کہتے ہیں یا مال کی بیجک پر دلالت کرتا ہے) یہ کہتے ہیں کہ وہ اسی مقام مذکورہ بالا (طریف) کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ فرنگستان والے جہازوں کی جن رسوم کو ادا کیا کرتے تھے انہیں "رسوم الطریف" کے نام سے موسوم کرتے تھے اسکے بعد پہلا لفظ (رسوم) ترک ہو کر صرف دوسرا لفظ باقی رہگیا اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ عربی زبان میں (تعریفہ) کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو یورپین زبانوں میں (طریفہ) کے معنی لئے جاتے ہیں اسلئے ہو سکتا ہے کہ افرنجی لفظ عربی زبان کے لفظ "تعریفہ" سے منتقل ہو گیا ہو جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے لفظ "طریف" کی تحریف ہو۔

معادن کے خمس میں وہ آمدنیاں تھیں جن کو اہل اسلام زمین کے اندر سے نکلنے والی معدنی اشیا یا ان کے مثل اور چیزوں پر بطور ٹکس کے پیدا کیا کرتے تھے۔ معدنی چیزوں کی دو قسمیں ہیں ظاہری معادن اور باطنی معادن۔ ظاہری معدنی پیداوار میں مثلاً سرمہ، نمک، تیر اور نفط ہیں یہ معادن وہی حکم رکھتی ہیں جو دریاؤں کے بہتے ہوئے پانی کا ہے یعنی انکا استعمال اسلامی شریعت میں مباح ہے ان چیزوں کا احتکار

جائز نہیں ان میں تمام آدمیوں کا حق یکساں ہے جو ان کے قریب پہنچ جائے وہ اُن میں سے بے تامل حسب مرضی یہ چیزیں لیلے۔ باقی رہے وہ معادن جو اندرونی ہیں یعنے جن کا جوہر زمین کے اندر قرار پذیر ہے اور وہ بلا کیمیائی عمل کے نکل نہیں سکتے۔ مثلاً چاندی سونے پیتل لوہے اور سیسے کی کانیں ان معادن کا اجارہ ایسے لوگوں کو دیدیا جاتا تھا جو انکے نکالنے کا کام کیا کرتے تھے اور انپر یہ شرط لگادی جاتی تھی کہ حاصل شدہ مال کا پانچواں حصہ بیت المال کو ادا کرتے رہیں۔ ٹکسال کی آمدنی اس قسم کی ہوتی تھی کہ وہاں بننے والے سکوں پر فی صدی کے حساب سے کچھ محصول لیا جاتا تھا جسے ہم اسی کتاب میں ٹکسال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہیں اسی دارالضرب کی آمدنی اندلس کے حکمران بنی مروان کے عہد میں ایک سال کے اندر ..... ۲۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔

جن قسم کے ٹکس اسلامی عہد حکومت میں لئے جاتے تھے منجملہ ان کے ایک قسم کا نام "مکوس" تھا جس کا واحد "مکس" ہے۔ یہ ٹکس اجناس تجارت پر لیا جاتا تھا جسطرح موجودہ زمانہ میں چنگی یا "قرونہ" وغیرہ طرح طرح کے محصول لئے جاتے ہیں "مکس" یا "مقس"۔ زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھا اور "مدینہ" میں قبطی اور فارسی سوداگروں سے انکے مال تجارت کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اسلام کا ظہور ہوا تو عمر بن الخطاب نے اس کو برقرار رکھا یہ محصول تاجروں سے صرف اسیوقت لیا جاتا تھا جبکہ وہ اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک کو جانا چاہتے اسوجہ سے اگر ایک شامی تاجر تمام ملک شام میں اپنا مال لئے پھرتا تو اس سے کوئی عشر یا ٹکس کا طالب نہیں ہوتا تھا لیکن جب وہ مصر یا عراق کو جانا چاہتا تو اس سے فوراً مکس وصول کر لیا جاتا عمر رضی کے مقرر کرنیکے اعتبار پر ٹکس کے تین درجے تھے: ذمی لوگوں (نصاریٰ اور یہود) سے عشر کا آدھا یعنے بیسواں حصہ لیا جاتا تھا اور مسلمانوں سے عشر کا چہارم یعنے چالیسواں حصہ (ہر چالیس میں سے ایک درہم) لیا جاتا۔ مگر دوسو درہموں سے کم پر کچھ نہیں لیا جاتا اور ان عرب لوگوں سے جو رعایا میں داخل نہیں تھے پورا دسواں حصہ وصول کیا جاتا۔ مکس کا رواج عہد اسلام میں نہیں ہو سکا۔ کیونکہ پرہیزگار اور خدا ترس لوگ اُسے برا سمجھتے تھے اسی انداز پر باقی ٹکسوں کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

قطاع جاگیریں جو اموال خراج کیساتھ ملحق تھے منجملہ اُن کے ایک رقم جاگیروں کی آمدنی سے بھی حاصل ہوتی تھی جاگیروں کا دستور سلطنتوں میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے اسکی اصل یہ تھی کہ جسوقت بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اُسے یہ منظور ہوتا کہ اس مفتوحہ ملک کو اپنے قبضہ میں رہنے دے کر

یا اس کی آمدنی سے نفع اٹھائے تو وہ اسے اپنے سپہ سالاروں کے مابین ان کی سرفروشی وجانبازی کے صلہ میں تقسیم کر دیا کرتا گویا کہ ان کی اجرت ملتی تھی اس امر کی تائیدیوں اور بھی ہوتی ہے کہ افرنجی زبان میں اصل لفظ اقطاع کے معنے اجرت ہی کے سپاہ۔ لوگ اپنے حصّہ کی اراضیوں کو اپنے ماتحت افسروں میں تقسیم کر دیتے اور وہ لوگ عام فوجی سپاہیوں پر بانٹ دیا کرتے یا ان کے قائمقاموں کو دیدیتے جبوقت بادشاہ اپنے سپہ سالاروں کو جاگیریں عطا فرماتا تو انپر مشروط کر دیتا کہ وہ لوگ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں اسکے مددگار رہیں گے اسی لیے جبوقت ان سرداروں میں سے کوئی شخص بددیانتی اور عہد شکنی کرتا تو زمین اسکے ہبہ کرنیوالے کو واپس ملجاتی (یعنے شاہی ملک ہوجاتی) اور اگر کوئی ادنے درجہ کا فوجی سپاہی بددیانتی کا مرتکب ہوتا تو اس کی اراضی ضابطہ (کپتان) کو ملجاتی اور ماتحت افسر بغاوت یا عہد شکنی کا مرتکب ہوتا تو اسکی جاگیر سپہ سالار ضبط کر لیتا اسیطرح سپہ سالاروں کی جاگیر کو خلاف ورزی معاہدہ کی صورت میں شاہی ملکیت بنا لیا جاتا تھا۔ بہرحال اس آغاز کا انجام یہ تھا کہ مختلف شرطوں اور ڈھنگوں سے جنہیں اس غرض کیلئے وضع کیا تھا ملک کی زمین بادشاہ کے قبضہ میں رہی مگر چونکہ ان قواعد اور قانون کا بیان کرنا اس موقعہ پر ضروری نہیں اسلئے ہم انہیں چھوڑے دیتے ہیں لیکن اسبات کا بیان کردینا ضروری ہے کہ انہیں قوانین کا مقتضا تھا کہ بادشاہ اس کی رعایا اور اس کی فوج یہ سب لوگ متفق۔ یکدل اور ملک کو بیرونی دشمنوں کے حملوں سے بچانے پر تیار رہتے تھے کیونکہ اس ملک میں ان سبھوں کی ضرورتیں مشترک تھیں اور تبادلہ حالات کا سلسلہ ان کے مابین قائم رہتا تھا یہی جاگیر دینے کا طریقہ یورپ کے ملکوں میں بھی پھیلا اور اسی لئے وہاں کے رہنے والوں کو رومانی لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے پر قوی بنا دیا۔

مگر اسلام میں جاگیروں کی کچھ اور ہی کیفیت تھی امام یوسف نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو اراضیاں اس قسم کی تھیں کہ ان کا کوئی مالک یا علیٰحدہ دعویدار نہ تھا مثلاً وہ زمینیں جو قبل مفتوح ہونے کے حاکم ملک یا ایسے شخص کی ملکیت تھیں جو جنگ میں قتل کر دیا گیا یا ترائی وغیرہ کی اراضیاں تھیں اور یہ سب اقسام اراضی مسلمانوں کے ہاتھ لگیں تو ان کے مالک خلفائے راشدین ہوتے تھے اور وہ جس کو چاہتے بطور انعام کے ایسی اراضیوں میں سے جاگیریں دیتے ہوئے یہ شرط لگا دیتے تھے کہ ان کی آمدنی کا عشر یا کچھ کم وبیش جیسا خلیفہ کو مناسب معلوم ہوتا بیت المال کو ادا کرتے رہیں عمر رض کے ایام میں عراق کے ملک کی ایسی اراضیوں کا خراج ...... ۷ درہم تک پہنچ گیا تھا اور ان کے بعد کے خلفا اور امرا بھی اسی اصول پر قائم رہے

عثمانؓ کے عہد میں ان اراضیوں کی آمدنی ۵۰۰۰۰ درہم ہوگئی تھی اور ۸۲ھ میں جسے "جماجم" کا سال کہتے ہیں عبد الرحمن بن اشعث کے فتنہ کے دوران میں خراج کا دفتر باغیوں کے ہاتھوں جل گیا اس وجہ سے ہر ایک گروہ اپنی اپنی مقبوضہ اراضیوں پر مالکانہ قبضہ کر بیٹھا۔

بنو امیہ اور بنو عباس کا یہ بھی دستور تھا کہ وہ اپنے بعض کنبہ والوں اور خاص لوگوں کو بہت سی اراضیاں جاگیریں دے کر ان کا خراج نہ لیتے تھے فوج کی تنخواہیں اور تمام اخراجات خراج کی آمدنی میں سے وضع ہونے کے بعد جسقدر رقم باقی بچتی وہ بیت المال میں داخل کر دیجاتی اور جاگیریں اُن کے مالکوں کے ہی قبضہ میں رہتیں۔

مگر جب حکومت کی باگ خلفاء کے قابو سے نکلکر سلجوقی سلاطین کے قبضہ میں چلی گئی تو انہوں نے جیسا کہ پہلے بھی فوج کی تنخواہوں کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے نظام الملک طوسی اپنے وزیر کے ہاتھوں میں جاگیریں دینے کے تمام اختیارات دیدیئے اور انکے بعد میں آنیوالے سلاطین نے اسی نظام الملک کے قاعدہ کی پیروی کی جن میں کرعی خاندان کے حکمران یعنے ملک مصر کے حکام بنی ایوب بھی داخل ہیں کیونکہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے تمام ممالک اپنے امرا اور اہل فوج کو جاگیروں میں دے ڈالے تھے خاصکر مصر کا ملک تو بالکل جاگیروں ہی میں تقسیم ہوگیا تھا اس کے بعد جاگیروں میں تعدیل ہوگئی اور اس قاعدہ کو تبدیل کر دیا گیا یعنے ملکی اراضیاں تین قسموں پر تقسیم ہوگئیں کچھ اراضیاں جاگیروں میں دیجاتی تھیں اور کچھ فروخت ہوجاتی تھیں اور بعض موقوف ہوتی تھیں۔

مقریزی نے اپنے زمانہ (نویں صدی ہجری) میں سرزمین مصر کا حال یوں بیان کیا ہے:۔

"مصر کی اراضی سات قسموں پر منقسم تھی (۱) جو شاہی دیوان میں اجرا پاتی تھی یعنے نزول کی اراضی (۲) جو امرا اور فوجی لوگوں کو جاگیروں میں دیدی گئی تھی (۳) جو جامع مسجدوں۔ مدرسوں۔ خانقاہوں اور وقف کرنیوالوں کی ذریات کیلئے وقف تھی (۴) اس قسم کی اراضی تھی کہ کچھ لوگ جو کسی مسجد وغیرہ کے کاروبار کو انجام دیتے تھے وہ اسکی آمدنی سے متمتع ہوتے رہتے اس قسم کی اراضیوں کا نام "احباس" تھا (۵) ایسی اراضی جو ملک خاص ہو کر خرید فروخت میراث اور ہبہ کی قابل ہو گئی ہو کیونکہ وہ بیت المال سے بقیمت خرید لیجاتی تھی (۶) اراضی ناقابل زراعت (۷) وہ اراضی جو دریائے نیل سے سیراب نہوتی تھی یہ زمین غیر آباد (ادسر) کہلاتی تھی"۔ جاگیروں کی بھی دو قسمیں تھیں (۱)[1] قطاع استغلال (۲)[2] اقطاع تملیک۔

(۱)[1] ایسی جاگیریں جنکی آمدنی سے جاگیردار نفع اٹھاتے اور شاہی مالگذاری ادا کرتے تھے گویا کہ وہ زمینیں بادشاہ کی ملک ہوتی تھیں جاگیردار کو ان اراضیوں کے انتقال کا حق نہ تھا۔

(۲)[2] وہ جاگیریں جو جاگیردار کی کامل ملکیت ہوتی تھیں اور اسے انکے انتقال بیع وغیرہ کے بھی حقوق حاصل ہوتے۔ +

ان ہر دو اقسام جاگیر کی نوعیت - آبادی - سرسبزی زمین اور حالت جنگ و صلح کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہتی تھی اوران تمام امور کا خلیفہ کی رائے پر دار و مدار تھا۔

اسلامی دولت کی تحصیل ملکی خراج و محاصل کی مقدار جو عباسیوں کے زمانہ میں تھی نیز اس آمدنی کا وہ علاقہ جو اسی سلطنت کی ثروت کے ساتھ تھا ہم انشاء اللہ کتاب ہذا کے حصہ دوم میں سلطنت اسلامی کی دولتمندی کا بیان کرتے ہوئے مفصل لکھیں گے۔

ڈاک
بریڈ

اسلامی عہد حکومت میں "بریدہ" کے جو معنے لیے جاتے تھے وہ آجکل کے استعمال و محاورہ سے بالکل جداگانہ تھے اس زمانہ میں "صاحب البرید" یا "صاحب الخبر" خفیہ پولیس حکام ملک کے خفیہ نگران اور پرچہ نویس لوگوں کے افسر سے ملتا جلتا ہوا کرتا تھا یا اس سے وہ شخص مراد ہوتا جو خلیفہ یا امیر کا جاسوس تھا اسکی وہ آنکھ اور نیز سننے والا کان ہوتا جو اس کے عاملوں کی خبریں اور اس کے دشمنوں کی چالیں اس سے بیان کرتا تھا اس طرح کا "برید" آجکل کے صیغہ جنگ کے محکمہ خبر رسانی سے بہت کچھ مشابہ کہا جا سکتا ہے۔

خلیفہ لوگ برید کی خدمت ان لوگوں کے سوائے اور کسی کو نہیں دیتے تھے جو بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہونے کے علاوہ انکے معتمد الیہ بھی ہوتے کیونکہ جیسی خبریں وہ لوگ پہنچاتے انہیں پر خلفا کے اپنے عاملوں اور ہمعصر حکمرانوں سے تعلقات قائم رکھنے کا دار و مدار ہوتا تھا اور کسریٰ شاہ فارس تو برید کی خدمت اپنے بیٹوں کے سوا کسی اور کو مقرر ہی نہ کرتا تھا۔

برید کی مصلحت (ضرورت) خبر رسانی کی ضرورت قدیم الایام سے تمام حکومتوں میں پائی جاتی ہے رومی اور فارسی سلطنتوں میں اس کا پورا محکمہ قائم تھا مسلمانوں میں سب سے پہلے جس حکمران نے اس صیغہ کو اخذ کیا وہ معاویہ بن سفیان تھے اس بارہ میں انہوں نے اپنے سے قبل گزرے ہوئے فرمانروایان شام کی پیروی کی تھی ان کے ان عاملوں نے جو ملک عراق میں متعین تھے ان کو صیغہ قائم کرنیکا مشورہ دیا تھا پہلے پہل اس محکمہ کے وضع کرنیکا مقصد یہ تھا کہ خلیفہ اور ان کے ان عاملوں کے مابین جو دنیا کے

مصر عراق اور فارس پر متعین تھے تیزی کیساتھ خبر رسانی کا سلسلہ قائم رہ سکے اسکے بعد اس صیغہ میں توسیع کرتے کرتے اُسے اس حد تک پہنچادیا گیا کہ وہ خلیفہ کے عاملوں اور اس کے راز دار لوگوں پر خفیہ نگرانی کا بنگیا کیونکہ "طاہر ذی الیمینین" گورنر خراسان نے جو وقت اپنے صوبہ میں خلیفہ مامون الرشید کا خطبہ ممبروں پر پڑھا جانا بند کر دیا تو صیغہ خبر رسانی کے افسر نے اسے اس بات سے متنبہ کیا اور ملامت کی پہلے تو طاہر نے یہ عذر پیش کیا کہ میں نے بھول کر خلیفہ کا خطبہ نہیں پڑھا تم اس کی اطلاع دربار خلافت میں نکردینا مگر جب تین دفعہ ایسا ہی ہوا اور ہر بار طاہر صیغہ خبر رسانی (پرچہ نویس) کے افسر سے یہی درخواست کرتا رہا کہ خلیفہ کو ابات کی اطلاع نہ دے تو آخر کار پرچہ نویس نے اس سے کہا تاجروں کے خطوط بغداد آتے جاتے رہتے ہیں اسلئے اگر کسی غیر نے خبر امیر المومنین کو پہنچادی تو مجھ کو اپنی ملازمت سے برطرف ہوجانے اور جان سے ہاتھ دہونے کا خوف ہے" طاہر نے اسبات کو سنکر جوابدیا کہ اچھا "لکھدے" اسوقت پرچہ نویس نے دربار خلافت کو تمام واقعہ لکھ بھیجا۔

برید۔ (پرچہ نویسی کا محکمہ) خلیفہ اور اس کے ملکی حکام کے مابین تعلق کام رکھنے کا ذریعہ تہا خلفاء کے احکام گورنروں کو اور گورنروں کی خبریں خلفا کے دربار میں پہنچانا اسی محکمہ کا فرض تہا پرچہ نویس لوگ گورنمنٹ کیجانب سے خبروں کی تفتیش اور حکام کے چالچلن کی نگرانی کا کام بھی انجام دیتے تہے وہ لوگ فوج اور مال وغیرہ امور مملکت کے حالات مفصل لکھ لکھ کر دربار خلافت میں ارسال کرتے رہتے تہے اسلئے جبوقت خلیفہ اور اسکے کسی عامل (گورنر) کے مابین تعلقات میں کدورت پیدا ہوتی اور عامل سبات کا ارادہ کرتا کہ سرکشی کرکے خود مختار حکمران بنجائے تو وہ خلیفہ کے پاس خبر رسانی کا انتظام بند کر دیتا تہا جسکی نظیر مامون عباسی کا فعل ہے کیونکہ جبوقت مامون خراسان کا گورنر تہا اور اُسے یہ خبر ملی کہ اس کے بہائی "امین" نے اسکی بیعت توڑ دی ہے اور بجائے اسکے اپنے بیٹے "موسیٰ" کو ولیعہد بنا لیا ہے تو مامون نے طراز میں سے "امین" کا نام نکالڈالا اور خبر رسانی کا سلسلہ بند کر دیا۔

صیغہ خبر رسانی (برید) کے معاملہ میں بنی عباس کی توجہ سب سے زیادہ تھی انہوں نے اس محکمہ سے بہت بڑا کام لیا یہانتک کہ انمیں سے بعض حکمرانوں کی نسبت یہ بھی سنا جاتا ہے کہ انہوں نے خاص اپنی ذات سے یہ کام کیا تاکہ اپنے عاملوں نوابوں اور رعایا کے حالات سے پوری واقفیت بہم پہنچائیں اور بسا اوقات اس طریقہ سے ان کو عوام اور خاص شخصوں کے خفیہ حالات سے آگاہی بھی ملگئی بعض خلفاء نے علانیہ اس قسم کے لوگ ہر ایک حاکم کے ساتھ مقرر کر دیتے تہے ایک معتبر مخبر وزیر کے ساتھ مقرر کیا جو دربار خلافت کے تمام حالات پادست کنندہ خلیفہ کے حضور میں پہنچایا کرتا تہا اور وزیر بغیر اس شخص کی موجودگی کے کسی کیساتھ کوئی سلوک نہ کرسکتا تہا اور

نہ دربار کر سکتا اسی طرح سے قاضی نائب اور دوسرے حاکموں کے ساتھ بھی ایک ایک نگران تعینات کیے تھے خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کہا کرتا تھا کہ مجھ کو اس بات سے زیادہ کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے کہ میرے در دولت پر چار شخص اس طرح کے ہوں جن کے بالمقابل میرے درباریوں میں کوئی شخص زیادہ پرہیزگار و پاکباز نہو اور وہی چار شخص ارکان دولت ہیں کہ ان کے بغیر ملک کی اصلاح نہیں ہوسکتی ان چار شخصوں میں ایک شخص ایسا قاضی ہو جسپر خدا کے حکم جاری کرنے میں کسی کی ملامت یا بدگوئی کا اثر نہ ہو۔ دوسرا پولیس کا افسر جو کمزور کو زور آور کے مقابلہ میں اپنے انصاف سے قوی بنا دے اور تیسرا وہ خراج وصول کرنیوالا افسر جو تشخیص جمع میں ملک کی اصلی آمدنی کا سُراغ لگائے اور رعایا پر ظلم نکرے اسکے بعد منصور نے اپنی کلمہ کی انگلی کو تین مرتبہ دانتوں سے کاٹا اور ہر بار وہ آہ! آہ! کا لفظ کہتا تھا لوگوں نے دریافت کیا۔ "اے امیرالمومنین وہ کون ہے جسکے وجود سے آپ مایوس ہو رہے ہیں؟" منصور نے کہا۔ ایسا پرچہ نویس جو ان (مذکورہ بالا) حکام کی خبریں سچائی کیساتھ مجھ کو لکھے

لہٰذا اس موقعہ پر خبر دینے والے لوگوں سے آجکل کے جاسوس مراد ہیں اور صاحب برید (پرچہ نویس افسر) اور خلیفہ یا سلطان کے مابین کوئی واسطہ نہوتا تھا۔ بلکہ یہ بلاواسطہ مل سکتے تھے چنانچہ جسوقت پرچہ نویس کا افسر کوئی خبر لاتا تو خلیفہ سے پہلے کسی شخص کو اسپر مطلع نہیں کرتا تھا تاکہ خود خلیفہ ہی اس خبر کو یا تو عام طور پر فاش کر دے یا مخفی رکھے جیسا چاہے کرے اکثر حالتوں میں بادشاہوں اور امیروں کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے اور اپنے پرچہ نویس کے مابین کوئی خاص علامت رازداری کیلئے قرار دیدیتے تھے اسلیئے جبتک وہ علامت موجود نہوتی ان کو پرچہ نویس کی اس تحریر پر اعتماد نہیں ہوتا تھا اگرچہ وہ خاص اُس پرچہ نویس ہی کے ہاتھ کی لکھی اور اس کی مہر سے مختوم کیوں نہو اس لئے کہ ممکن تھا کہ وہ کسی مجبوری یا دباؤ میں آکر ایسا کرنے پر آمادہ ہوگیا ہو اس کی ایک مثال ابو مسلم خراسانی کا یہ قصہ ہے کہ جسوقت خلیفہ منصور نے اسکو اپنے حضور میں طلب کیا تو وہ انجام بینی کے لحاظ سے اپنی جان کا خوف کرکے ابا نصر مالک بن الہیثم کو اپنی فوج کا افسر بنا کر اسطرح ذیل کر گیا تھا: "تم اسوقت تک ٹھیرے رہنا جبتک کہ تمہارے پاس میرا خط آئے اگر وہ خط آدھی مہر سے مختوم ہو تو سمجھنا میری خاص تحریر ہے اور میں نے اُسپر مہر لگائی ہے لیکن اگر پوری مہر چسپاں دیکھو تو جاننا کہ میں نے اسے مختوم نہیں کیا اور تم اسکی تعمیل ہرگز نہ کرنا۔" یہ حکم دیکر ابو مسلم بغداد کی جانب روانہ ہوگیا اور جسوقت وہ مدائن میں پہنچا تو اسکے قتل کا جو واقعہ پیش آیا اُس سے تمام لوگ واقف ہیں ابو مسلم کو قتل کرا دینے کے بعد منصور نے اسکی طرف سے ابی نصر کو ایک تحریر لکھوائی جسمیں یہ حکم تھا کہ جسقدر مال و اسباب میں نے تمہارے پاس چھوڑا ہے اسکے ہمراہ لیکر دربار

خلافت میں حاضر ہو۔ پھر اس تحریر کو ابی مسلم کی مہر سے مختوم کرایا اور روانہ کر دیا ابو النصر نے پوری مہر چسپان دیکھ کر معلوم کر لیا کہ اس تحریر کا لکھنے والا خود ابو مسلم نہیں ہے۔

خبر رسانی کا صیغہ ایک بھاری عہدہ ہے اس کا افسر بہت سے ماتحتوں اور بیش قرار اخراجات کا حاجتمند ہوتا ہے تاکہ اپنے ماتحتوں کو بھاری بھاری تنخواہیں اور انعام دے کر انہیں راضی اور امانتداری پر قائم رکھ سکے "صاحب البرید" کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ وہ راستوں کی حفاظت کرے اور ان کو چوروں لٹیروں اور دشمنوں کے حملوں سے بچائے اور خشکی و تری میں مخالفین کے جاسوسوں کا آنا بند کرے سرحدی مقامات کے افسروں اور اطراف ممالک کے حاکموں کے تمام خطوط "صاحب البرید" ہی کے پاس آیا کرتے اور وہ ان خطوں کو جسقدر ممکن ہوتا قریب ترین راستوں اور تیز رو سواریوں کے ذریعہ خلیفہ کے حضور میں پہنچایا تھا۔

برید (ڈاک) کے راستے ڈاک کے چند خاص راستے تھے جو مرکز خلافت سے اطراف سلطنت تک ہر چہار جانب پھیلے ہوئے تھے جہاں تک کہ وہ غیر ملکوں کے راستوں سے جا ملتے تھے ان میں سے ہر ایک راستہ چند منزلوں پر اور ہر منزل چند دم لینے کی جگہوں یعنی چوکیوں پر منقسم ہوتی تھی اور ہر ایک چوکی پر تازہ دم گھوڑے یا اونٹ تیار رہا کرتے تھے ڈاک کے ہلکارے ان چوکیوں پر اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو تازہ دم گھوڑوں سے بدل لیا کرتے تھے تاکہ راستہ تیزی کے ساتھ طے ہو سکے اہل عرب کے یہاں تو گمان غالب ہے کہ ڈاک کی سواریوں میں اونٹ مستعمل ہوتے رہے ہوں مگر فارس والے اپنے یہاں گھوڑوں کا استعمال کرتے تھے عباسی حکومت کی ترقی کے زمانہ میں ڈاک کے راستوں کی تعداد ترانوے تک پہنچ گئی تھی اور جانوروں کی قیمتیں ان کا خرچ خوراک اور ملازمین کی تنخواہ وغیرہ کے تمام مصارف سال میں ۱۵۹۱۰۰ دینار تک ہوتے تھے۔

ہم نے جس مقام پر "ملک سواد" کے اس خراج کی حالت بیان کی ہے جو بنو امیہ کے زمانہ میں وہاں سے حاصل ہوتا تھا اسی جگہ یہ بھی دکھایا ہے کہ بنو امیہ ڈاک کے انتظام پر چار ملین درہم یعنی قریب قریب بنو عباس کے اخراجات سے دگنی رقم صرف کرتے تھے اور یہ بات ہمارے اس قول کی تائید کرتی ہے جو ہم بنو امیہ کے اپنی حکومت کو زور آور بنانے کی غرض سے بے دریغ مال و دولت صرف کرنے کے بارہ میں کئی بار لکھ آئے ہیں۔

ڈاک کا ہر ایک راستہ ایک گھوڑے سے بڑھتے بڑھتے چالیس پچاس جانوروں تک ترتیب پاتا اور اکثر حالتوں میں ڈاک کے گھوڑوں کو بعض لوگوں کے جلد لانے کیواسطے اور انہیں خلیفہ یا امیر کے روبرو عجلت کے ساتھ حاضر کرنے کیلئے بھی استعمال کرتے تھے۔ ڈاک کی تیز روی راستوں اور سواریوں کی قسموں کے اختلاف کے ساتھ مختلف

ہوا کرتی تہی یہ سواریاں اونٹ اور گہوڑوں ہی کی ہوتی تہیں اور ان جانوروں کے گلوں میں زنجیر یا گھنٹیاں لٹکا دیجاتی تہیں جب چلنے سے ان کو جنبش ہوتی تو دور تک آواز سنائی دیتی اور اس آواز کو ان کے محاورہ میں "قبقبة البريد" کہتے تہے اور کبہی ایسا بھی ہوتا کہ ڈاک کی روانگی دریائی راہ سے کشتیوں پر عمل میں آتی۔

ڈاک کے ذریعہ خبر بھیجنے میں علاوہ اس کے کہ جانوروں یا کشتیوں پر خطوط کے تہیلے روانہ ہوں ایک طریقہ یہ بھی تہا کہ پیدل ہرکاروں کی معرفت جنکو "سعاۃ" کہتے تھے ڈاک روانہ کیجاتی تھی یہ ہرکارے ایسے لوگ ہوتے تھے جو چھریرے بدن والے اور تین تین منزلوں کی ایک ہی منزل کرنیکے عادی ہوجاتے تہے عموماً جنگلوں کے رہنے والے اس کام کیلئے زیادہ مستعد پائے جاتے تہے سب سے پہلے جس شخص نے "سعاۃ" کا گروہ قائم کیا وہ معز الدولہ تہا اسنے عباسی حکومت میں بغداد کے اندر اس جماعت کو تیار کیا اور اس کی غرض یہ تھی کہ اپنے بہائی رکن الدولہ کو بہت جلد جلد حالات کی اطلاع دیتا رہے "معز الدولہ" کے عہد میں دو "ساعی" بہت نامور نکلے جنمیں سے ایک کا نام "فضل" تہا اور دوسرے کا "مرعوش" یہ دونوں تمام دوسرے "سعاۃ" پر سبقت لے گئے تھے ان دونوں میں سے ہر شخص ایکدن میں چالیس سے بھی کچھہ زیادہ "فرسخ" یعنے تقریباً (۱۴۰) میل راہ طے کرلیتا تہا

ایک صورت خبر رسانی کی نامہ بر کبوتروں کا استعمال بھی تہا۔ اہل عرب اس صیغہ کو بہت کارآمد خیال کرتے اور اس کا اہتمام بڑی توجہ سے کیا کرتے تھے کبوتروں کے ذریعہ سے پیغام رسانی کا کام نکالنا قدیم اقوام میں بہت دنوں سے رائج چلا آتا تہا۔ مگر مسلمان لوگ اس بارہ میں اور تمام لوگوں سے زیادہ سرگرم ہوگئے اور ہم نے سال دہم کے الہلال نمبرات میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔

مسلمانوں کے یہاں مراسلت کے جو طریقے مستعمل تھے منجملہ انکے ایک طریقہ یہ بہی تہا کہ کاغذ کا ورق لکہہ کر ایک بانس کے پہرے میں لٹکا دیا جاتا اور وہ ایک گہاس کے گٹھے میں گاڑ کر گٹھے کو پانی میں ڈالدیا جاتا گہاس بہتی ہوئی نہر کے بہاؤ پر چلی جاتی یہانتک کہ وہ شخص جس کے پاس پیام بہیجا جاتا وہ اسے دیکہتا اور نکال لیتا ایک قاعدہ یہ بہی تہا کہ تیروں کی پیکان پر خبریں لکہہ کر انہیں مقام مقصود کیجانب پہینکا جاتا تہا مگر اس صورت کی بابت گمان غالب ہے کہ حصار اور رستوں کے بند ہوجانیکی حالت میں مستعمل ہوتی تہی۔

ڈاک کے ملازموں میں "سعاۃ" کے علاوہ ایک قسم کے ملازم "شوذی" ہوا کرتے تہے یہ امیروں کے قاصد ہوتے تہے جو ڈاک پر روانہ کئے جاتے تہے اور ایک دوسری قسم کے ملازم "کوہبانی" ہوتے تہے یہ ایسے مخبر ہوتے تہے جو تجسس حالات کیغرض سے روانہ کئے جاتے تہے بعض وہ ملازم تہے جو خلفا کے روبرو ڈاک

کی ہتھیلی کھولتے تھے یہ تھیلے عمدہ کپڑوں یا چمڑے کے بنے ہوئے ہوتے تھے جنمیں خطوط رکھکر اوپر بھیجنے والے کی مہر لگادی جاتی تھی اور مرسل الیہ کے پاس پہونچنے پر وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کی مہر کھولتا تھا یا جو اس خدمت پر مامور ہوتا اُس کے حکم سے وہ کھولا کرتا۔

قضا

قضاء کی تاریخ

اسلام سے قبل قضاء کی کیا حالت تھی

قضاء (جس سے لوگوں کے مابین واقع ہونے والے جھگڑوں کا فیصل کرنا مراد ہے) نہایت قدیم صنعت ہے کیونکہ انسان اپنے وجود میں آنے کے اوّل زمانہ سے ہی اس بات کا محتاج پایا گیا ہے کہ اس کے قضایا کوئی شخص فیصل کرے تمام قبیلوں اور گھرانوں کے قاضی ان ہی کے معزز اور عقلمند لوگ ہوا کرتے تھے اور وہی لوگ ان قبائل کے حکمران اور امیر بھی ہوتے تھے جب کوئی شخص جسمانی اور دماغی قوتوں میں نامور ہوتا تو وہی اپنے قبیلہ کی امارت اور اس کے قضایا فیصل کرنیکا ذمہ دار ٹہیرتا فطرت انسانی کے مطابق زمانہ "بدو" (وحشت) کی یہی حالت تھی اہل عرب بھی ایام جاہلیت میں اسی طریقہ پر قائم تھے ان کا دستور تھا کہ اپنی قوم کے وجیہ اور عقلمند لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصل کرایا کرتے اسلام سے قبل کے قاضیوں کی ایک بڑی جماعت مشہور ہے جنمیں سے ہر شخص اپنے قبیلہ میں فیصلہ معاملات کا کام سرانجام دیا کرتا تھا چنانچہ قبیلہ تمیم میں سے "حاجب بن زرارہ" اور "اقرع بن حابس" اور "ربیعۃ بن مخاشن" اور قبیلہ ثقیف میں سے "غیلان بن سلمہ" اور خاندان قریش میں سے "ہاشم بن عبد المناف" "عبد المطلب بن ہاشم" اور "ابو طالب بن عبد المطلب" نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور "عاص بن وائل" بنی اسد میں سے "ربیعۃ بن خدار" اور کنانہ میں سے "یسلمہ بن نوفل" وغیرہ اشخاص تمام قبائل میں مشہور گزرے ہیں جو قضا کا کام کرتے تھے جیسے اکثم بن صیفی اور عامر بن الضرب وغیرہ اور اہل عرب کاہنوں اور عرافوں سے بھی اپنے معاملات فیصل کراتے تھے۔

قضا کا عہدہ اسلام میں

اسلام میں سب سے پہلے قضا کے اختیارات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاحب

شریعت اسلامیہ کو بہ نفس نفیس حاصل رہے اور اُنکے بعد خلفائے راشدین اس منصب پر قائم رہے کیونکہ قضاء کا عہدہ بھی کاروبار خلافت کے تحت میں داخل ہے صدر اسلام میں خود خلفائے راشدین بذات خاص اس فرض کو انجام دیا کرتے تھے اور اپنے سوا کسی کو یہ کام سپرد نہ فرماتے تھے مگر جب وہ وقت آیا کہ اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہوا نئے نئے ممالک فتح ہوئے اور خلفاء کے فرائض منصبی روز بروز بڑھنے لگے تو وہ اسبات پر مجبور ہوئے کہ خاص دار الخلافت اور بیرونی ممالک میں اپنے قائممقام قاضی مقرر کریں خلفائے راشدین میں سب سے اول جنہوں نے اس کام کو کیا وہ عمر بن الخطابؓ خلیفہ دوم تھے انہوں نے مدینہ میں اپنے ساتھ "ابی الدرداءؓ" کو قاضی بنایا اور "شریحؒ" کو بصرہ میں اور "ابو موسیٰ اشعریؓ" کو کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا اور انہیں ابی موسیٰ کے نام ایک فرمان لکھا جو اسلامی فقہ کا دستور العمل ہے اور اسی کے محور پر آج تک قاضیوں کے احکام دورہ کرتے ہیں اس فرمان کی عبارت مشہور ہے؛

عمر بن الخطاب کا قصد یہ تھا کہ جس طرح انہوں نے مدینہ اور بصرہ میں قاضی مقرر کیئے ویسے ہی ملک مصر میں بھی قاضی کا تقرر کریں۔ کیونکہ ملک مصر میں منصب قضاء پر کسی شخص کا تقرر وہیں کے والی (گورنر) کے قبضہ میں تھا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عمر بن الخطابؓ نے مصر کے امیر عمرو بن العاص کو لکھا کہ وہ "کعب بن یسار بن ضنہ" کو مصر کا قاضی مقرر کردیں شخص مذکور ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے جاہلیت کے عہد میں قضا کا کام انجام دیا تھا؛ "کعب" نے اس عہدہ کے قبول سے انکار کرتے ہوئے کہا جینے جاہلیت کے زمانہ میں قضا کا فرض انجام دیا ہے اور اسلام میں اب پھر دوبارہ اس کام کو نہ کرونگا" امیر عمرو بن العاصؓ نے اسے سنکر "عثمان بن قیس بن ابی العاص" کو قاضی مصر مقرر کردیا اسکے بعد سے اسوقت تک مصر کے امیروں ہی کو قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل رہا اور جب بنی عباس کی حکومت کا دور شروع ہوا تو انہوں نے ملک مصر پر اپنا پورا قبضہ جمانے کی نیت سے وہاں کی قضاء کا منصب کسی کے حوالہ کرنا اپنے اختیار میں لیا سب سے پہلا ملک مصر کا قاضی جو خلفاء کی جانب سے مقرر ہوا وہ عبداللہ بن لہیعہ حضرمیؒ اس کو ابوجعفر منصور عباسی نے ۱۵۵ھ میں مصر کا قاضی بنایا اور اس کے بعد سے قاضی مصر کا تقرر خلفاء کے اختیار میں چلا گیا اور آج تک برابر یہی دستور جاری ہے؛

ابتداءً ہر ایک اقلیم میں ایک ہی قاضی ہوا کرتا تھا۔ مگر جبکہ اسلامی مملکت کی آبادی اور وسعت کا دائرہ بڑھ گیا تو قاضیوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی یہانتک کہ یہ نوبت آپہنچی کہ بڑے بڑے شہروں میں کئی کئی قاضی مقرر کیئے جاتے تھے یعنی شہر کی ہر ایک جانب (حصہ) میں ایک قاضی ہوتا تھا اور خود خلیفہ بذات خاص ان کا تقرر

کیا کرتا۔ خلیفہ رشید عباسی کے عہد سے قبل تک یہی طریقہ رائج رہا۔ مگر رشید کے عہد میں بغداد کی وسعت ترقی پذیر ہوئی اور مشہور قاضی ابو یوسفؒ انہوں میں بہت نامور اور متبحر قاضی ہوئے رشید ان کی بہت عزت اور تکریم کیا کرتا تھا اس لئے اُسنے ان کو "قاضی القضاۃ" کا لقب عطا کیا اور پہلے قاضی القضاۃ ہیں قاضی ابو یوسفؒ بڑے عالی ہمت شخص تھے انہوں نے اس منصب کے فرائض نمایاں کامیابی کیساتھ ادا کئے اور علماء کے گروہ کو ایک خاص لباس سے امتیاز بخشا ورنہ اس سے پہلے وہ بھی عام آدمیوں کا سا لباس پہنتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ کے بعد قاضی القضاۃ کو شہر بغداد کے ماتحت قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل ہوگیا اور اس کے بعد اقلیموں کے قاضیوں کا عزل و نصب بھی اسی کے قبضہ و تصرف میں آگیا مصر اور اندلس کے اُن خلفاء نے جو عباسی خلفاء کے معاصر تھے انہیں کی پیروی کی اور وہ بھی قاضی القضاۃ کو مقرر کرکے اُسے ماتحت قاضیوں کے تقرر کا اختیار دینے لگے۔

صدر اسلام میں قاضی کا فرض منصبی صرف لوگوں کی خصومتوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ مگر بعد میں مقتضیات احوال کے مطابق یا خلفا کے دیگر اشغال سیاسی میں مصروف رہنے کی وجہ سے بعض اور امور بھی ان لوگوں کے ہاتھوں میں آنے لگے چنانچہ قاضی کے اصلی فرائض منصبی کے علاوہ مسلمانوں کے بعض عام حقوق کا ادا کرنا بھی انکے ذمہ آپڑا مثلاً۔ دیوانوں یتیموں مفلسوں اور اہل سفاہت کے مال جو حکومت کے زیر نگرانی (بطور کورٹ آف وارڈس) رہتے تھے انکی نگرانی مسلمانوں کی وصیتوں اور اوقاف کا جاری کرنا اور جب کوئی ولی نہو تو بیتیوں کا نکاح بیاہ کرا دینا اسکے بعد ان کے اختیارات کا دائرہ راستوں کی مصلح تعمیرات کی ضرورتوں گواہوں امینوں کے اور نائبوں کے تصفیہ (یعنے جستجو کے حالات اور انکے چال چلن کی دیکھ بھال) تک وسیع ہوگیا اور انکو حق مل گیا کہ عدالت اور جرح کیساتھ ان کا علم و تجربہ حاصل کریں بعض خلفاء نے ان اختیارات کو اور بھی وسعت دی یہاں تک کہ "صوائف" کی فوجوں میں جہاد کی افسری بھی انہی کے حوالہ کردی منجملہ ایسے قاضیوں کے ایک قاضی یحییٰ بن اکثم بھی تھے جو "مامون" کے عہد میں "صیفی" مجاہدوں کے ہمراہ ممالک روم پر حملہ آور ہوا کرتے تھے اسیطرح عبد الرحمٰن الناصر اموی حکمران اندلس کے قاضی منذر بن سعید کو بھی اختیارات وسیع حاصل تھے عزیز باللہ فاطمی (خلیفہ) نے "علی بن نعمان" کو مصر کا قاضی مقرر کرکے شام مغرب حرمین اور تمام مملکت کا عہدہ قضا سپرد اضافہ کر دیا۔ نیز خطابت امامت اور سونے چاندی کے کھوٹے کھرے کی پرکھ ترازوں اور پیمانوں کی کمی بیشی کا اندازہ اور جانچ یہ سب امور بھی اسی کے حوالہ کردیئے حاکم بامر اللہ کا عہد آیا تو سنہ ۳۹۸ھ میں

ابو محمد یازوری قاضی کے منصب پر مامور ہوا اور پھر بعد میں وزارت کا بھی اضافہ کیا گیا وہ پہلا قاضی تھا جو حکومت کے دو جلیل مناصب کا باہم جمع کرنا نصیب ہوا اگرچہ اس کے بعد اوروں کو بھی ایسے موقعے ملے۔

پس بیانات بالا سے حاصل یہ ہے کہ قضاء کا منصب جیسا کہ ہے مگر وہ ہر ایک زمانہ میں اتنا ہی وسیع نہیں رہا بلکہ حکومتوں کے اختلاف اور تغیر و تبدل کے ساتھ ادلتا بدلتا رہا اور اس کے اختیارات میں رفتہ رفتہ وسعت پیدا ہوتی گئی جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اوائل اسلام میں خلفائے راشدین محض انہیں لوگوں کو قاضی کے منصب پر مامور کیا کرتے تھے جو اپنے عصبیت کی وجہ سے خاندان اہل عرب میں سے ہوں یا حلیف یا رقیق (غلامی سے آزاد ہونے کے بعد) یا دیگر وجوہ سے ان کے گہرے دوست ہوں اور وہ ان پر کفایت اور رشوت لینے سے بے پرواہ ہونے کی بابت کامل اعتبار رکھتے ہوں لیکن جب اسلامی خلافت دینی رنگ سے بدل کر سیاسی رنگ میں رنگی گئی اور حکومت کا معاملہ شاہی حالت میں آگیا اور یہ شرط کمزور ہو گئی اس کے بعد حکمرانی کی باگیں عجمی النسل لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں اور رفتہ رفتہ قاضی کے فرائض کم ہوتے ہوتے محض مقدمات کے فیصل کرنے اور شخصی حالات کا فیصلہ کرنے تک ہی محدود رہ گئے اور بعد ازاں محض شرعی امور میں شخصی حالات کی بنا پر حکم دینا ہی ان کا کام باقی رہ گیا جس طرح آجکل کے زمانہ میں دیکھا جاتا ہے

قاضی لوگ مسجدوں میں بیٹھ کر لوگوں کے معاملات فیصل کیا کرتے تھے اگر مدعی مدعا علیہ انکے پاس آتے تو وہ وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر دیا کرتے تھے علمائے اسلام اور دیگر پرہیزگار مسلمان علم و فہم والے لوگ قضا کے منصب کو دینی پہلو کے لحاظ سے ایک امر دشوار و خطیر سمجھا کرتے تھے کیونکہ اسمیں قاضی کی خطا کرنے کی صورت میں جبکہ وہ غلطی سے کسی حقدار پر ظلم کر بیٹھے یا خلاف حق فیصلہ کر دے تو مستوجب مواخذہ ہونیکا ڈر کا لگا رہتا اسی لیئے بہت سے علماء اور متقی لوگوں نے اس منصب کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا جیسا کہ کعب بن لیسار کے معاملہ میں دیکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے عمر بن الخطاب کے حکم سے مصر کا قاضی ہونا منظور نہ کیا اور امام اعظم نعمان بن ثابت ابو حنیفہ نے خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کے فرمان سے جبکہ اس نے ان کو قاضی مقرر کرنا چاہا انکار کر دیا اور کہا خدا سے ڈر اور اپنی امانت میں اس شخص کو شریک نہ کر جو خدا سے خوف کھانیوالا ہو واللہ میں خدا کی رضامندی میں بھی بخطر نہیں ہوں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کے غضب سے بے خوف بنجاؤں؟ اگر کوئی موقعہ ایسا آپڑا کہ خود تجھے حکم دینے کی نوبت آئی پھر تم نے مجھکو یہ دہمکی دی کہ یا تو اپنا حکم نافذ کر ورنہ میں تجھکو دریائے فرات میں غرق کرا دونگا تو یقین مانو کہ میں دریا میں ڈوبنے کو پسند کرونگا اور تمہارے

حاشیہ کے لوگ اس امر کے محتاج ہیں کہ قاضی انکی عزت و حرمت کریں بیچارہ اس کام کے قابل نہیں ہوں لہذا مجھے معاف ہی رکھو مسلمانوں کا قاعدہ تہا کہ جوقت کوئی قاضی مقرر کرتے تو اس کو جامع مسجد میں لیجا کر وہاں بڑے مجمع کے سامنے وہ فرمان پڑھکر سناتے جو اس شخص کے تقرر کی نسبت دربار خلافت یا بارگاہ سلطانی سے صادر ہوتا۔

مصر کے قاضی امام شافعی کا مذہب ظاہر ہونے کے وقت سے اسی مذہب کے پابند ہوا کرتے تہے مگر وہاں کے قاضی کو یہ اختیار حاصل ہوتا تہا کہ اپنے رائے کے مطابق دوسرے مذہبوں کے قاضی بطور نائب کے مقرر کرلے چنانچہ ۵۲۵ھ میں قاضی ابواحمد بن افضل نے چار قاضی اپنی نیابت میں مقرر کئے تہے اور یہ قاضی چاروں مذہبوں (حنفیؒ۔ مالکیؒ۔ حنبلیؒ۔ شافعیؒ) کے مطابق علیحدہ علیحدہ فیصلے کیا کرتے تہے اسکے بعد سے یہ قاعدہ "ممالیک" (غلام خاندان حکمران مصر) کے ایام میں بھی برتا جاتا رہا۔

قاضی کا وظیفہ (تنخواہ) حکومتوں اور زمانوں کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتا رہا اس مقام کے علاوہ کسی موقعہ پر ہم دکہا چکے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے شریح کو بصرہ کا قاضی مقرر کرکے ان کا وظیفہ سو درم ماہوار نقد اور خرچ خوراک کیلئے کچھ مقدار گیہوں کے بوروں کی قرار دیا تہا خلفائے راشدین کے عہد میں قاضیوں کے وظائف اتنے ہی رہے مگر بنی امیہ کے زمانہ میں ان کی تنخواہوں میں ترقی ہوئی اور صرف انہیں کے وظائف نہیں بڑہے بلکہ فوجی اور ملکی عہدہ داروں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا گیا عباسیوں کا زمانہ آیا تو قاضی مصر کا مشاہرہ تیس دینار قرار پایا سب سے پہلے جس شخص کو اس قدر تنخواہ ملی وہ قاضی (ابن لہیعہ) تھے جن کو خلیفہ مذکور نے مقرر کیا تہا اور جنکا ذکر اوپر آچکا ہے پھر خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں قاضیوں کی تنخواہیں بہت بڑہ گئیں ان دنوں مصر کے قاضی عطا بن سکندر کی تنخواہ ۴ ہزار درم یا تقریباً ۲۷۰ دینار تہی۔ جو ایک بیش قرار مشاہرہ ہے شائد خلیفہ مذکور نے اتنی زائد تنخواہ کسی خاص غرض سے مقرر کی ہو کیونکہ اس کے علاوہ خلیفہ نے قاضی مذکور کو ہزار دینار اور بھی بطور انعام دیئے تہے اسکے بیس سال سے کچھ عرصہ بعد قاضی مصر کا وظیفہ پھر دوبارہ ایکہزار دینار سالانہ تک گہٹ گیا اور جس شخص نے سب سے پہلے اس وظیفہ کو منظور کیا وہ بکار بن قتیبہ تہا جو احمد بن طولون کے عہد ۲۴۵ھ میں قاضی مصر مقرر ہوا فاطمی حکومت کے دور میں پھر قاضیوں کی تنخواہیں بڑہنے لگیں ان دنوں میں جو شخص قاضی القضاۃ ہوتا تہا اس کو علاوہ مصارف خانگی سامان خورد و نوش اور تحفہ تحائف کے بارہ سو دینار سالانہ ملا کرتے تہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایوبی خاندان کے حکمرانوں اور انکے بعد آنیوالے حکام کے عہد میں وظیفہ اسی حالت پر قائم رہا۔

بغداد کے قاضیوں کے وظائف ہم کو معلوم نہیں ہو سکے کہ عباسیوں کے زمانہ میں کس قدر ملتے تھے، مگر ہم نے یہ ضرور دیکھا کہ قضا کا عہدہ التزام میں داخل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے قاضی لوگ قضا کی آمدنی کو خلیفہ یا سلطان وقت سے ایک مقدار مال کے معاوضہ میں جو وہ ادا کرتے رہتے تھے ضمانت لیتے تھے پہلا شخص جس نے منصب قضا کی ضمانت کی وہ عبداللہ بن حسن بن ابی الشوارب تھا اس نے معز الدولہ بن بویہ کے عہد ۳۵۰ھ میں سبات کی ضمانت کی تھی کہ بغداد کا قاضی القضاۃ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر سال ۲۰۰۰۰۰ درم سلطان کو نذر کرتا رہے گا اس کے بعد سے منصب قضا کی ضمانت کرنا ایک عام بات ہو گئی اور محتسب اور شرطی (پولیس افسر) کی جگہیں بھی ضمانت میں دی جانے لگیں۔

دیوان المظالم

یہ عدالت بھی منصب قضا کے ماتحت تھی اور جس کو ہم آجکل "مجلس استیناف" (عدالت اپیل) کہتے ہیں اس کے ساتھ بہت مشابہ تھی اس محکمہ کی اصل غرض تھی کہ لوگوں کی جو فریادیں قاضیوں وغیرہ کے فیصلہ سے ناراضی میں کی جائیں ان کو سنکر دادرسی کی جا سکے اہل عرب زمانہ جاہلیت میں سبات کی جانب بہت التفات رکھتے تھے اور لوگوں کی فریادیں سننے کیلئے باہم مخالفت کر لیتے تھے جیسا کہ اسلام سے پہلے قریش کے گھرانے نے کیا تھا یہ واقعہ اسطرح ہوا تھا کہ جس وقت قریش کے گھرانے میں سرداروں کی کثرت اور باہم کشمکش اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کی کوشش میں زیادتی ہوئی تو انکے بطون (گھرانوں) نے باہم جمع ہو کر اس بات پر ایک حلف اٹھایا کہ ظلموں کو رد کریں اور ظالم سے مظلوم کا انصاف دلائیں اسی حلف کا نام حلف الفضول مشہور ہے جو مکہ میں کیا گیا تھا اور اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال کی تھی اس اقرار کا موضوع یہ تھا کہ شہر مکہ میں جس شخص پر ظلم ہو اس کا انصاف کریں اور حق دلادیں خلفائے اربعہ نے کبھی مظالم (فریادیں) سننے کیلئے کبھی اجلاس نہیں کیا اسلئے کہ اسلام کے صدر اول میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ خود انکو انصاف پسندی حق بات کی جانب کھینچتی تھی یا وعظ و نصیحت انکو ظلم سے مانع آیا تھا مگر علی کو اس قسم کا اجلاس کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ زبردست لوگوں کے ظلموں پر خیال کریں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ اس کام کی نوعیت اس زمانہ میں ایسی تھی جیسی ان کے بعد ہو گئی علاوہ اس کے یہ بات بھی تھی کہ انہوں نے فریادیں سننے کیلئے کوئی دن یا گھنٹہ مقرر نہیں کیا تھا بلکہ جس وقت کوئی شخص فریاد لے کر آجاتا تو فوراً اس کا انصاف کر دیتے تھے مگر زمانہ مابعد میں فریادیوں کی باتیں سننے اور انکے فصول کا تصفیہ کرنے کیلئے ایک خاص دن مقرر کر دیا گیا جس شخص نے سب سے پہلے اس شخص کا تعین کیا وہ عبدالملک بن مروان

اموی تھا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ جس وقت اس کام میں اسے کوئی مشکل پیش آجاتی اور یہ ضرورت پڑتی کہ کسی کو اس معاملہ میں حکم بنائے تو وہ مقدمہ اپنے قاضی "ابن ادریس ازدی" کے سپرد کر دیا کرتا تھا گویا کہ ابن ادریس کام کرتا تھا اور عبدالملک فقط حکم سنا دیا کرتا اور جس شخص نے پہلے پہل بذات خاص لوگوں کی فریادیں سننے کا کام انجام دیا وہ مشہور عادل خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی تھے انکے بعد سے عباسی حکومت کے آغاز تک پھر یہ دستور متروک رہا۔ البتہ فرمانروایان بنو عباس نے اس کو دوبارہ جاری کیا چنانچہ عباسیوں میں ابتداءً خلیفہ مہدی پھر خلیفہ ہادی پھر رشید اور اس کے بعد مامون نے سماعت مظالم کیلئے اجلاس کئے اور عباسی خاندان میں سب سے آخر میں جس حکمران نے یہ فرض انجام دیا وہ مہتدی باللہ محمد بن الواثق تھا خلفاء اس اجلاس میں بڑے سے بڑے معزز لوگوں مثلاً گورنروں اور عاملوں اور خراج وصول کرنے والوں کے ہاتھ سے عام رعایا پر جو زیادتیاں ہو جاتی تھیں انکی شکائتیں سنکر انصاف کیا کرتے تھے ایسے لوگوں میں جنکی شکائت خلفاء کے پاس کیجاتی تھی دفتروں کے عملہ والے اور خود خلفاء کی اولاد بھی داخل تھی یہ لوگ عام رعایا کے وظائف جاری کرنے میں ان کو دق کرتے یا زبردستی کسی کا مال اڑا لیتے زمین غصب کر لیتے تو وہ مظلوم شخص خلیفہ کے پاس جا کر فریادی ہوتا تھا قاضی لوگ معاملات کا فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی زیادتی یا کمی سے کام لیتے تو اسکا مرافعہ بھی خلفاء کے حضور میں کیا جاتا یا جو شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا کسی پر ظلم کرتا تو ان سبھوں کی فریادیں دربار خلافت میں پیش ہوتی تھیں اور اسپر منصفانہ احکام صادر ہوتے تھے اس بات پر نظر کرنے سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ دیوان المظالم کا دائرہ عدالت اپیل کی حدود سے بہت زیادہ وسیع تھا اور اس عدالت کی طاقت و قوت سب بالاتر تھی نیز اس کے احکام بہت جلد نافذ ہو جاتے تھے اس طرح سے جن استغاثوں کو سنا گیا ہے اور لوگوں کی دادرسی کیگئی ہے اس کی ایک مثال خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی کا یہ قصہ ہے کہ وہ ایکدن نماز پڑھنے کو جا رہے تھے کہ یکایک راہ میں ایک یمن کا رہنے والا شخص انکے روبرو آکر فریادی ہوا! خلیفہ نے دریافت کیا کہ تجھ کو کیا شکائت ہے؟ اُسنے عرض کی۔ "ولید بن عبدالملک نے میری اراضی غصب کر لی ہے" عمر بن عبدالعزیز نے یہ سنتے ہی حکم دیا "مزاحم سے کہو کہ وہ صوافی کا رجسٹر میرے پاس لے آئے"۔ رجسٹر میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اسمیں لکھا ہے "عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے فلاں شخص کی زمین ضبط کر لی ہے"۔ یہ بات معلوم کرکے خلیفہ نے حکم دیا کہ اس ضبطی کو دفتر سے کالعدم اور ولید بن عبدالملک کو فرمان لکھ دو کہ اسکی اراضی اسے واپس دینے کے علاوہ جو اس کا وظیفہ مقرر تھا اسے دوگنا کر دے۔ د

مامون کا ذکر ہے کہ وہ یکشنبہ کے دن دربار عدالت منعقد کیا کرتا تھا ایک دن وہ اسی دربار سے اٹھ کر چلا ہی تھا کہ ایک عورت میلے کچیلے کپڑے پہنے اس کو ملی اور فریاد کرنے لگی کہ آپ کے فرزند عباس نے مجھ پر ظلم کیا ہے خلیفہ نے اپنے بیٹے کو اس کے برابر کھڑا کر کے اس کا انصاف کر دیا اور اس کی شکایت دور کر دی خلیفہ مہتدی کے بعد عباسی خلفاء میں سے کسی خلیفہ نے بذات خاص مظالم کا فیصلہ کرنے کیلئے اجلاس نہیں کیا بلکہ اکثر یہ خدمت اپنے وزراء کے حوالے کر دیا کرتے تھے جس طرح مامون نے اپنے وزیر یحییٰ بن اکثم کو اور معتصم نے احمد بن ابی داؤد کو یہ خدمت سپرد کر دی تھی اور اس کے بعد جبکہ عباسی خلفاء پر سلاطین کا غلبہ ہو گیا تو وہ لوگ اس کام کو انجام دینے لگے۔

ملک مصر میں جس شخص نے سب سے پہلے مظالم کے بارہ میں نظر کی وہ احمد بن طولون تھا جو (سنہ ۲۵۵ھ) میں مصر کا مستقل حکمران بن گیا تو ہفتہ میں دو دن اس غرض کیلئے دربار کیا کرتا تھا احمد بن طولون کے بعد اس کے جانشین حکمرانوں نے اس فرض کے ادا کرنے کیلئے عہدہ دار مامور کئے یہاں تک کہ فاطمی خاندان کے حکمرانوں نے ملک مصر کو فتح کر لیا اور شہر "قاہرہ" کی تعمیر کے بعد فاطمی خاندان کے حکام بہت سرگرمی سے اس شعبہ کی طرف متوجہ ہوئے ان میں سے پہلا حاکم جس نے یہ کام انجام دیا وہ فاطمیوں کا مشہور جنرل "جوہر" فاتح مصر تھا وہ فریادیوں کی درخواستوں پر خاص اپنے ہاتھ سے حکم لکھتا اور دستخط کیا کرتا تھا مگر جوہر کے بعد والے خلفاء نے یہ خدمت قاضی القضاۃ یا بعض اور بڑے بڑے ملکی عہدہ داروں کے سپرد کرنی شروع کر دی فاطمیوں کی حکومت کمزور ہونے کے سبب سے جب ان کے وزیر لوگ حکومت کے کاروبار میں خود سری کرنے لگے تو مظالم کا محکمہ بھی انہیں کے قابو میں آگیا چنانچہ سب سے پہلے فاطمی خاندان کے وزیروں میں سے "امیر الجیوش" بدر جو بہت مشہور گذرا ہے بذات خاص استغاثوں کی سماعت کیلئے اجلاس کرتا تھا اور اس کے بعد آنے والے وزیروں نے بھی اس کی پیروی کی ان وزیروں کا دستور تھا کہ دربار کے دروازہ پر ایک منادی مقرر کر دیتے جو آواز دیا کرتا تھا کہ "فریادیو! چلو اور اپنی درخواستیں گزرانو" یہ صدا سنکر وہ لوگ حاضر ہو جاتے اور وزیر انکے ساتھ انصاف کئے جانے کا حکم دیدیتا

دار العدل

حکومت مصر جب ایوبی سلاطین کے قبضہ میں آئی تو انہوں نے مظالم کی سماعت کیلئے ایک خاص مکان بنوا دیا اور اس کا نام "دار العدل" رکھا اس سے پہلے دمشق کے حکمران ملک عادل نور الدین زنگی نے بھی ایک اسی قسم کا دار العدل بنوایا تھا ایوبیوں نے بھی اسی کی بنیاد طرح کر دی تھی ایوبی سلاطین دار العدل میں صرف مظلوموں کی داد رسی کی غرض سے اجلاس کیا کرتے تھے

غلام سلاطین بھی ایوبیوں کے بعد اسی طریقہ پر چلتے رہے ایوبی خاندان کے حکمرانوں اور غلام خاندان کے سلطانوں کو لوگوں کا انصاف کرنے میں بہت بڑی توجہ تھی وہ لوگ اپنے اس اجلاس کا بہت احترام کرتے تھے جس میں دادرسی کیلئے جلوس فرماتے تخت سلطنت کو خالی چھوڑ کر اسی کے برابر ایک کرسی پر جلوس فرما ہوتے تاکہ ان کے پیر زمین سے ملے رہیں چاروں مذہبوں کے قاضی القضاۃ انکے داہنے ہاتھ کیجانب بیٹھتے اور بیت المال کا وکیل یا اور لوگ جو دوسرے عہدوں پر مامور ہوتے اور حرس (سنتریوں کا دستہ) اور خاص درباری لوگ سلطان کے روبرو ایستادہ ہوتے انہیں لوگوں میں ایک شخص بھی ہوتا جو داد خواہوں کی عرضیاں پڑھ کر سلطان کو سناتا جاتا اور سلطان قاضیوں اور فوجی سرداروں سے جس چیز میں کچھ کہنا سننا ہوتا کہتا سنتا اور آخر میں اپنی رائے سے فیصلہ کر دیتا۔

مسلمان سلاطین اور امرا اپنی رعایا کے مظالم سننے میں نہایت توجہ کیا کرتے تھے اور انکی شکایتوں کے رفع کرنے میں پوری کوشش سے کام لیتے خواہ ان کے اپنے ہی بیٹوں نے لوگوں پر ظلم کیا ہو اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رعایا کو بھی اس بات کی عادت پڑ گئی تھی کہ مقررہ دنوں میں اپنی شکایتیں اپنے خلفا اور سلاطین کے حضور میں گذرانیں وہ لوگ اسے ایک ضروری فرض خیال کرتے تھے اسی لئے اگر ایک دن یا کئی دن تک خلیفہ اجلاس عدالت نہ کرتا تو وہ رنجیدہ اور بددل ہو جاتے تھے بعض خلفا کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شکایتوں کی سماعت کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے کوئی فوجی لوگوں کی شکایتیں سننے کیلئے مخصوص ہوتا کوئی عاملوں کی بد اطواریاں معلوم کرنے کیلئے علی ہذا ہر صیغہ کے افسروں کی شکایتیں باری باری سنی جاتی تھیں۔ +

حسبہ یہ بھی ایک دینی خدمت اور قضا کی اقسام میں سے ہے صیغہ حسبہ کا عہدہ دار یعنی محتسب ناشروع باتوں اور حرام چیزوں کا سراغ لگایا کرتا تھا اور ان کے مرتکبوں اور استعمال کرنیوالوں کو واجبی سزا اور تنبیہ کیا کرتا تھا محتسب کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ اہل شہر کو عام مصلحتوں کا پابند بنائے مثلاً راستوں کے تنگ کرنے سے لوگوں کو روکے اور جہازوں اور مزدوروں پر زیادہ بوجھ لادنے سے منع کرے جن لوگوں کے مکانات گرنے کے قریب ہو گئے ہوں ان کو ہدایت کرے کہ وہ بنظر حفظ ما تقدم ان مکانوں کو منہدم کر دیں تاکہ رستہ چلنے والوں کو ان کے اچانک گرنے سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔ اگر مکتبوں کے معلم شاگردوں کو بہت مارتے تو انکے ہاتھوں پر لکڑیاں لگائے محتسب کو کھوٹی چیزوں کے پرکھنے اور ضروریات زندگی میں

اندر ملاوٹ کرنیوالوں یا ناقص اشیا بیچنے والوں کو سزا دینے کا بھی اختیار تہا وہ باٹوں اور پیمانوں کو بھی جانچتا رہتا تہا غرضیکہ جو امور آجکل (میونسپلٹی) کے فرائض میں داخل ہیں وہ محتسب کو حاصل تھے جن باتوں کا ہمنے ذکر کیا ہے دراصل تو وہ قاضی کے فرائض میں داخل ہونی چاہئیں تہیں لیکن ان ہونے قاضی کو بات خاص ایسی باتوں کی تلاش و جستجو سے بچانے کیلئے یہ ایک مستقل عہدہ نکالدیا تہا اسکے علاوہ اکثر حالتوں میں جبکہ ملک مصر میں بنی فاطمہ کی حکومت تھی تو یہ عہدہ بھی قضا کے اعمال میں داخل رہچکا تہا اور اندلس کے اموی حکمرانوں نے بھی یہی طریقہ برتا تہا مگر جب کہ سلطان کا منصب خلافت سے علیحدہ ہو گیا اور تمام ملکی معاملات کی عام نگرانی اس کے قابو میں آگئی تو یہ محتسب کا وظیفہ ولایت (گورنری) کی خدمات میں داخل ہو گیا۔

محتسب کا عہدہ کسی مسلمان وجیہہ شخص کے سوا اور کو نہ ملتا تہا کیونکہ یہ ایک دینی خدمت تھی صیغہ احتساب کا افسر تمام اطراف ملک میں اور صوبوں میں اپنی جانب سے نائبوں کا تقرر کیا کرتا تہا اور اس کا اجلاس جامع مسجد میں ہر روز ہوا کرتا تہا اس کے نائب پیشہ وروں اور تاجروں کے ہاں گشت لگایا کرتے تھے جو محتسب کہ ملک مصر میں تہا وہ ایک ایک دن باری باری قاہرہ اور فسطاط کی جامع مسجدوں میں اجلاس کرتا اور اپنے نائبوں کو ہر گلی کوچے میں اس غرض سے بھیجا کرتا تہا کہ وہ گوشت اور پکی ہوئی چیزوں کی جانچ کریں بار برداری کے جانور رکھنے والوں کی نگرانی رکہیں کہ وہ اپنے بے زبان خادموں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادنے پائیں سقوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی مشکوں کو تھیلوں سے ڈہانک کر رکہیں نیز سقوں کیواسطے ایک پیمانہ بھی مقرر تہا جسکی مقدار ۲۴ ڈول تھی اور ہر ڈول چالیس رطل کا ہوتا تہا ان کو یہ بھی حکم تہا کہ نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پاجامے پہنا کریں جو ان کے ستر عورت کو بخوبی چھپائے رہیں یہی محتسب کے نائب مکاتب کے استادوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ بچوں کو سخت سزائیں جسمانی نہ دیں اور انہیں اس طرح نہ ماریں کہ کہیں بیجا چوٹ لگنے سے وہ مرجانے کے قریب ہو جائیں اسی طرح عام معلموں کو یہی حکم سنا دیا جاتا تہا کہ وہ بچوں کو ذرا احتیاط سے سزا دیا کریں جو شخص بد معاملہ ہوتا اس کو بدی سے روکتے اور باٹوں پیمانوں کو جانچتے محتسب کو سرکاری گھر میں جانچ کرنیکا اختیار ہوتا تہا

اندلس میں اس عہدہ کا نام "خطة الاحتساب" تہا اور اس کا متولی ایک قاضی ہوتا تہا اس ملک میں دستور تہا کہ جو قاضی محتسب ہوتا وہ خود سوار ہو کر بازاروں میں گزرتا اس کے ماتحت سپاہی ہمراہ ہوتے اور ایک سپاہی کے ہاتھ میں وہ ترازو رہتی جس سے بازاری روٹیوں کا کم بیش وزن جانچا جاتا تہا اسی طرح گوشت کا بہاو بھی ایک کاغذ پر لکہا رہتا تہا قصاب کی مجال کیا تہی کہ مقررہ نرخ سے کم بیش دے سکے

اگر وہ بد دیانتی کرتا تو چھپ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ محتسب کسی چھوٹے بچہ کو قصاب کے پاس گوشت خریدنے بھیجتا اور جب وہ گوشت لیے آتا تو اُسے تول کر دیکھتا کہ کم تو نہیں دیا اگر کم نکلتا تو اسی پر اندازہ کر لیتا کہ گاہکوں سے ایسا ہی معاملہ کرتا ہوگا محتسب لوگوں کے احتساب کے اصناع میں کچھ خاص قوانین بھی تھے جن کو وہ اسی طرح پڑھتے اور مشق کرتے تھے جس طرح فقہا احکام فقہ کا درس دیتے ہیں۔

شرطہ یعنی (پولیس)

شرطہ کا محکمہ بھی اصل میں فقہا کے تابع تھا کیونکہ اس سررشتہ سے مراد یہ تھی کہ قاضیوں کے احکام نافذ کئے جائیں ثبوت جرائم سے پہلے عبرت کیلئے سزاؤں کا تقرر اور جو شخص جرائم کے ارتکاب سے باز نہ رہے اُسے سزا دینا یا تادیب کرنا وغیرہ بھی اسی صیغہ کے ذریعہ سے عمل میں آ سکے اس لحاظ سے شرطہ کا محکمہ قضا کا خادم تھا اور ملزمو نیز مجرم ثابت کرنے میں قاضی کی امداد کیا کرتا اور حکومت کو اسکے احکام نافذ کرنے میں مدد دیتا تھا۔ شرطہ کا افسر۔ زنا اور استعمال مسکرات پر حد شرعی بھی قائم کیا کرتا تھا اور اسکے علاوہ بہت سے ایسے امور شرعی کو بھی انجام دیا کرتا تھا جنکے لئے قاضی کا اجلاس کھلا رہتا تھا اسکے بعد عباسی اندلس کی اموی اور مصر کی فاطمی حکومتوں میں جرائم کی سماعت اور ان کا فیصلہ اور حدود شرعی کا اجراء محکمہ شرطہ کے افسر کا فرض قرار پاکر قاضی کے حدود اختیارات سے نکال لیا گیا اور اس منصب کو بڑے بڑے سرداروں اور خاصہ کے لوگوں میں سے ذی عزت اشخاص کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ اندلس میں شرطہ کی دو شاخیں کر دیگئی تھیں شرطہ صغریٰ۔ اور شرطہ کبریٰ۔ شرطہ کبریٰ کا محکمہ خاص لوگوں سرداران قوم اور اہل مراتب سلطانی کے حلقہ میں اپنے اختیارات برتتا تھا اور استغاثوں میں شاہی خاندان کے لوگوں اور ذی مرتبہ نوابوں اور امیروں کو گرفتار کرنا۔ سزا دینا اسی محکمہ کے سپرد تھا۔ شرطہ صغریٰ۔ عام رعایا اور معمولی لوگوں کے معاملات کا نگراں رہتا تھا شرطہ کبریٰ کے اعلیٰ افسر کیلئے سلطانی دربار کے دروازہ پر کرسی بچھتی تھی اور اس کے ماتحت لوگ بھی وہیں اسکے روبرو اپنے اپنے قرینہ سے بیٹھتے تھے اور بلا اس کے حکم کے کوئی کام نہ کرتے تھے اس افسر کی ولایت (عہدہ) وزارت یا حجابت کا ایک زینہ خیال کیجاتی تھی۔ ممالک اندلس میں صاحب الشرطہ کا نام حاکم شہر یا صاحب اللیل بھی تھا سلاطین کے عہد حکومت میں صاحب شرطہ کو "والی" اور افریقیہ کی گورنمنٹوں میں "حاکم" کہتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ شرطہ کا وجود عہدہ قضا کے ساتھ ساتھ تھا۔ مگر بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں وہ ایک علیحدہ صیغہ یا ممتاز عہدہ بن گیا۔ اس سے قبل وہ قضا کے ماتحت تھا۔

دیوان الانشا

کتابت

ایام جاہلیت میں بہت تھوڑے سے اہل عرب لکھنے سے واقفیت رکھتے تھے ان کی کتابت عربی حروف میں نہ ہوتی تھی جو ان دنوں مروج ہیں بلکہ وہ عبرانی خط میں لکھتے تھے جسے انہوں نے آداب معاشرت وغیرہ کے سلسلہ میں اہل یہود سے اقتباس کر لیا تھا جس شخص نے عبرانی خط میں عربی عبارت تحریر کی وہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ بی بی خدیجہ رضہ کا ماموں زاد بھائی ورقہ بن نوفل تھا یا بعض اہل عرب نبطی خط میں لکھتے تھے جسے انہوں نے ان نبطیوں سے سیکھا تھا جو پہلی دوسری عیسوی صدیوں میں رومن قوم کے ظلم سے تنگ ہو کر ملک عرب میں بھاگ آئے اور آباد ہو گئے تھے ہمارے خیال میں یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ عربی خط اسی نبطی خط سے نکلا ہے جس کی نقل ہمنے اس کتاب کے شروع میں دی ہے اس خط اور عربی خط نسخ کی طرز میں ایک قسم کا تشابہ بھی پایا جاتا ہے کوفی خط کی نسبت معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اسطرنجلی" طرز تحریر سے نکلا ہے جو سریانی اور کلدانی اقوام عراق اپنی تحریر میں استعمال کیا کرتی تھیں اہل عرب نے جسوقت شروع میں اس خط کو اپنی لغت کی تحریر میں استعمال کیا تو اس کی کشش اور روش میں کچھہ تبدیلی پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس کی یہ صورت ہو گئی جو آج موجود ہے ہمارے اس قول کی تائید یوں بھی ہو جائیگی کہ وہ ملک عراق کا خط ہے اور اس کا یہ نام اسلام کے بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ کوفہ ان شہروں میں سے ایک مشہور شہر ہے جسکو مسلمانوں نے ملک عراق میں بسایا ہے جب کہ اسلام کا ظہور ہوا ہے ان دنوں عربی خط میں لکھنے والے بہت تھوڑے آدمی تھے اور وہ سب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے صحابی تھے انمیں عمر بن الخطاب رضہ علی بن ابیطالب رضہ طلحہ رضہ عثمان رضہ ابوسفیان رضہ اور ان کے دونوں بیٹے معاویہ اور یزید وغیرہ شامل ہیں علی رضہ عثمان رضہ زید بن ثابت رضہ اور عبداللہ بن ارقم ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں محرری کا کام انجام دیا ہے۔ کیونکہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے لکھا پڑھا کچھہ نہ تھا ان ہی لوگوں نے ان کے حکم سے قران شریف کی سورتیں اور وہ خطوط تحریر کئے جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے شاہان روئے زمین کے نام دعوت اسلام کی غرض سے ارسال فرمائے تھے بعض وہ اصحاب جو لکھنے سے واقف تھے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتی ضرورتوں میں محرری کا کام کرتے تھے اور بعض لوگ اہل مدینہ کے خطوط و حسابات

تحریر کیا کرتے تھے کچھ لوگ اس قسم کے تھے جو قوم کے بانیوں اور قبیلوں اور انصار کے گھرانوں کے مردوں اور عورتوں میں کتابت کرتے رہتے ابوبکرؓ کی خلافت ہوئی تو عثمان بن عفانؓ ان کے منشی تھے اور عاملوں اور فوج کے سرداروں کو خطوط لکھا کرتے تھے اسی وقت سے محرری بھی مناصب حکومت میں سے ایک ایسا منصب ہو گیا جو کسی حالت میں بغیر پُر ہوئے نہ رہتا تھا عمرؓ کے دور خلافت کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے ان کے کاتب (میر منشی) زید بن ثابتؓ رہے اور ان کے بعد اور لوگ پھر جبکہ بہت سے شہر فتح اور وفاتر مرتب ہو گئے تو عمرؓ نے ہر ایک ولایت میں ایک ایک محرر مقرر فرما دیا جو اس ولایت کے دفتر میں تحریر کا کام کیا کرتا تھا ابتدا میں محرر فوجی دفتر اور بیت المال کا حساب لکھا کرتے تھے عثمانؓ اور علیؓ کے عہد تک جنکے بعد سے خلفاء راشدین کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا ایک ہی محرر ہوا کرتا تھا جو فوجی عطیات کا حساب دفتروں میں درج کرتا اور انکے نام رجسٹروں میں مرتب رکھتا اور اسکے ساتھ ہی خطوط و فرامین لکھا کرتا تھا اور بعض اوقات دو بھی ہو گئے جنمیں سے ایک شخص بیت المال کا حساب لکھنے پر مامور ہوتا تھا خلافت کا عہدہ بنی اُمیہ کے قابو میں آیا اور کاروبار حکومت بڑھے تو کاتبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اور کتابت کی پانچ قسمیں بن گئیں۔ ا۔ عاملوں امیروں اور بادشاہوں وغیرہ کے نام خطوط اور فرمان لکھنے والا منشی (۲) محرر خراج جو خراج کے داخل خارج کا حساب مرتب رکھتا تھا (۳) فوجی دفتر کا محرر اس کا فرض یہ تھا کہ فوجی سپاہیوں کے نام انکے چہرے مہرے (حلیے) انکے درجے اور انکی تنخواہیں یا وظیفے اور اسلحہ وغیرہ کے اخراجات سب لکھا کرتا تھا (۴) محکمہ شرطہ کا محرر۔ یہ عقود (اقرار ناموں) اور خون بہاؤں وغیرہ کے معاہدے اور بیانات لکھا کرتا تھا (۵) قاضی کا محرر جو شرطوں اور احکام کو قلمبند کیا کرتا تھا

دیوان الانشا

جس کو ہم آجکل کے سکریٹریٹ آفس سے مشابہ کہہ سکتے ہیں اس دفتر میں متعدد اقسام کے انشا پرداز (منشی) ملازم رہتے تھے شاہی خطوں اور فرمانوں کا لکھنے والا سب سے مقدم ہوتا تھا اور اس کو کاتب السرّ (راز نویس) بھی کہتے تھے یہ شخص خلیفہ کا دست و بازو اس کا پرائیویٹ سکرٹری اور اسکے اہم رازوں کا امانتدار رہتا تھا جس طرح ابی بکر صدیقؓ کے میر منشی عمرؓ اور عمرؓ کے کاتب السر عثمانؓ تھے اسلام کے ابتدائی دور میں خلفاء نے اس منصب کے نازک فرائض کو ملحوظ رکھ کر اسے سوا اپنے مخصوص لوگوں یا نہایت قریبی عزیزوں کے کسی اور شخص کے حوالہ نہیں کیا اور بنی عباس کے عہد تک اس امر کا خیال برابر قائم رہا ابتدائی حکومت میں بنو عباس کے کاتب خلیفہ سے اجازت لیتے یا اس کے احکام کو مناسب طرز سے لکھنے میں خیانت برتنے لگے تھے اسلئے آگے چل کر خلفاء عباسیہ نے یہ خدمت بھی وزیروں کے سپرد کر دی۔ مگر

وزیر اپنے ہاتھ سے رقعے اور خطوط نہیں لکھتا تھا بلکہ وہ انپر صرف دستخط کردیتا تھا جس طرح آجکل
پرائیویٹ سکرٹری کیا کرتا ہے اور وزیر دستخط کردیتا ہے عباسی خاندان کے وزیروں میں سب سے پہلے
جس شخص نے فرمانوں اور خطوط پر دستخط کئے وہ یحیی بن جعفر برمکی تھا جب خلیفہ رشید نے تمام کاروبار
حکومت اسکے قبضۂ اختیار میں دیدیئے تو جس وقت کوئی شخص کوئی استغاثہ یا وظیفہ کی درخواست پیش کرتا
یحیی اُسپر اپنے ہاتھ سے حکم لکھدیتا اور یحیی کے بعد جسقدر وزیر ہوئے وہ سب رقعوں اور معروضات پر حکم لکھتے رہے
اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی وزیر علیحدہ طور پر صرف "دیوان السر" یا "دیوان الرسائل" یا انشا کی خدمت پر مامور ہوا ہو
بنی عباس کے آخر عہد حکومت میں کتابت ایک مستقل عہدہ ہوگیا اور وزیروں کے علاوہ اس صیغہ کا ایک جداگانہ
افسر متعین ہونے لگا یہ عہدہ دار بغداد ہی میں رہتے اور دار الانشا کے محرر کہلاتے تھے ان کا افسر رئیس دیوان الانشا
یا صاحب دیوان الانشا یا کاتب السر کہلاتا تھا اور اُسے "دیوان العزیز" بھی کہتے تھے یہی افسر خلفاء کیجانب سے
ہمعصر شاہان ممالک غیر کے نام خطوط لکھا کرتا تھا جسکی نظیر ان دنوں میں "نظارت خارجیہ" یا "باب عالی" ہے۔

توقیع

دوائر حکومت اسلامیہ میں آجکل توقیع سے دستخط مراد لیجاتی ہے مگر خلفاء کے عہد میں اس سے
وہ عبارت مفہوم ہوتی تھی جو خلفاء درخواستوں یا استغاثوں پر اپنے قلم سے لکھا کرتے تھے
جو کسی امر کی طلب یا شکایت سے متعلق انکے حضور میں پیش ہوا کرتے تھے خلیفہ ان کاغذ پر کوئی ایسی عبارت
لکھدیا کرتا جس کا اجرا لازم ہوتا یا جو مضمون درخواست کا جواب ہوتی جسکی مثال میں ہم مصری حکومت کی "تأشیر"
یا "تعلیم" کو پیش کرسکتے ہیں توقیع دیوان الانشاء کے افسر کا خاص فرض تھا یا وہ شخص اس کام کو انجام دیتا تھا
جو مخصوص طور پر اسکے لئے مامور ہوتا فیصل مقدمات کے وقت دربار میں فرمانروائی میں کاتب (منشی) ہمیشہ خلیفہ یا سلطان
کے روبرو حاضر رہتا تھا اور خلیفہ عرضداشتوں اور رقعوں کو دیکھ دیکھ کر اسے اس غرض سے دیتا جاتا تھا کہ وہ انپر توقیع
(حکم) تحریر کرتا جائے وہ منشی اپنے امکان بھر نہایت بلیغ عبارتوں میں ان احکام لکھتا جاتا توقیع کیواسطے اہل
بلاغت اور استادان سخن کی کوئی عمدہ کتاب بطور نمونہ مقرر ہوتی تھی جس سے عبارت کا مقابلہ اور اسکی درستی یا نادرستی
کا اندازہ کیا جاتا تھا جعفر بن یحیی کا قاعدہ تھا کہ وہ خلیفہ رشید عباسی کے حضور میں بیٹھے بیٹھے تمام درخواستوں پر
توقیع کرتا اور ان کو انکے پیش کرنیوالوں کیطرف پھینکتا جاتا تھا اور باوجود اس قدر عجلت سے جواب دینے کے
اسکی توقیع کی عبارتیں اسالیب بلاغت اور تحصیل فنون میں بڑے بڑے بلیغ لوگوں کو نیچا دکھاتی تھیں یہانتک کہ
ان عبارتوں کیوجہ سے لوگوں کا بیان ہے کہ جعفر کی توقیع کی ہوئی درخواستیں ایک ایک دینار کو بکا کرتی تھیں

صدر اسلام میں خلفاء بذات خاص درخواستوں اور استغاثوں پر توقیع کیا کرتے تھے یا اپنے منشیوں کو
انکے مکمل اور مرتب کرنے کا حکم دیتے تھے ان کی توقیعات میں اکثر تو کسی آیت، حدیث یا مشہور حکمت کا
اقتباس ہوتا تھا ورنہ کوئی ایسا شعر جس کے معانی حکمت آمیز ہوں اسکی مثال یہ ہے کہ سعید بن ابی وقاص عراق کے
عامل نے عمر بن الخطاب کو ایک تحریر اس غرض سے بھیجی کہ ان سے ایک مکان بنوانے کی اجازت لے۔ عمرؓ نے اس
تحریر کے نیچے یوں جواب لکھدیا۔ "ابن ما یکنک من الهواجر واذی المطر" یعنے ایسا مکان بنوالو
جو تم کو مینہ اور آندھی وغیرہ کی تکلیفوں سے پناہ دے سکے نیز عمرؓ نے اپنے عامل عمرو بن العاص کو جو حاکم مصر تھے
انکے ایک خط کے جواب میں یوں لکھا تھا "کن لرعیتک کما تحب ان یکون لک امیرک" یعنے اپنی رعیت
کیساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو جیسا کہ اپنے امیر سے اپنے واسطے چاہتے ہو۔ کچھ لوگوں نے عثمان بن عفانؓ سے مروان بن
حکم کے کسی حکم پر شکائت کی عثمانؓ نے اس درخواست پر تحریر فرمایا۔ "فان عصوک فقل انی بریءٌ مما
تعملون" یعنے پھر بھی اگر وہ لوگ تیری بات نہ مانیں تو ان سے کہدے کہ میں تمہارے معاملہ سے الگ ہوں اور
اسکے بعد وہ درخواست مروان کے پاس بھجوادی۔ حضرت علی بن ابیطالب کی توقیعیں مشہور ہیں جنمیں سے ایک عبارت یہ ہے
جو انہوں نے اپنے فرزند حسنؓ کے جواب میں لکھی تھی "رای الشیخ خیر من جلد الغلام" یعنے ایک بڈھے
کی رائے نوجوان لڑکے کی جوانمردی سے بہتر ہے۔ ایک بار سلمان فارسیؓ نے علیؓ کو لکھکر دریافت کیا کہ
"قیامت میں لوگوں سے حساب کیونکر لیا جائیگا۔ حضرت علیؓ نے اس رقعہ پر لکھدیا۔ "یحاسبون کما یرزقون"
(جیسے رزق دیا جاتا ہے ایسے ہی حساب لیا جائیگا) معاویہ بن ابی سفیان کی توقیعیں حسب ذیل ہیں عبد اللہ بن
عامر نے امیر معاویہ سے بذریعہ تحریر درخواست کی کہ وہ ان کیلئے "طائف" کی آمدنی میں سے کچھ مال مد خرچ
کو مقرر کردیں معاویہ نے اسی کاغذ پر لکھدیا "عش رجبا تری عجبا" (یعنے جبتک زندہ رہو تو پھر نتیجہ دیکھ لوگے
زیاد بن ابیہ نے معاویہ کو اس امر کی اطلاع دی کہ عبد اللہ بن عباسؓ تمہاری خلافت میں طعنہ زنی کرتے
ہیں اور اس کو برا سمجھتے ہیں اسکے جواب میں معاویہؓ نے یوں لکھا۔ "ان ابا سفیان وابا الفضل کانا فی الجاهلیة
فی مسلاخ واحد وذالک حلف لا یحله سوء رایک" (یعنے ابوسفیان اور ابوالفضل زمانہ جاہلیت میں ہم
مشرب تھے اور یہ ایک ایسی قسم ہے جسے تمہاری بدخیالی نہیں توڑ سکتی) عبد الملک بن مروان نے اس تحریر پر جو حجاج
بن یوسف عامل عراق نے اسکے بھیجی تھی اور جسمیں یہ لکھا تھا کہ اہل عراق بہت سرکشی کرتے ہیں اگر اجازت ہو تو انکے
چند اشراف کو قتل کردیا جاوے یہ جواب لکھا تھا۔ "ان من یمن السائس ان یتألف به المختلفون ومن شومه

ان یختلف المؤتلفون۔ (ریاست والے کی برکت کی یہ ہے کہ وہ پراگندہ (جماعت) کو اکٹھا کر دے اور اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ اکٹھوں کو علیحدہ علیحدہ کر دے) اور ایک خط میں "جو اشعث" کے نام آیا تھا (اشعث وہ شخص تھا جو عبدالملک سے بغاوت پر آمادہ تھا) یہ لکھا:۔

"فما بال من اسعیٰ لاجبر عظمہ　حفاظاً و ینوی من سفاہتہ کسری"

(یعنی اس شخص کا کیا حال ہے جو جبراً اپنی عظمت و عزت کا خواہاں ہو، حالانکہ کسریٰ شاہ فارس اپنی سفاہت کے باعث اس سے دم دباتا ہو۔)

قتیبہ بن مسلم نے سلیمان بن عبدالملک کو خلافت سے معزول کر دینے کی دہمکی لکہی تو سلیمان نے اسی تحریر پر یوں لکھدیا

"زعم الفرزدق ان سیقتل مربعاً ✦ فابشر بطول سلامۃ یا مربع"

(یعنی کیا فرزدق نے یہ گمان کیا ہے کہ مربع قتل کیا جاویگا۔ لیکن تو مربع کی سلامتی کی خوشخبری دے کہ اسکی نیک عادت کے باعث کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا) اور جبکہ قتیبہ نے دوبارہ اسے دہمکی آمیز تحریر بہیجی تو اسکے اوپر یہ عبارت لکھدی۔ "وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً" (یعنی اگر تم صبر و تقوے کام لو تو انکے فریب تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے) عمر بن عبدالعزیز رحمہ کے کسی عامل نے انکو ایک عرضداشت بھیجی جسمیں ایک شہر کی مرمت کیلئے اجازت طلب کی تہی اس عرضداشت کے آخر میں عمر بن عبدالعزیز نے حسب ذیل توقیع لکہی "ابنھا بالعدل ونق طرقھا من الظلم" (یعنی شہر کی مرمت عدل سے کرو اور انکے رستوں کو ظلم سے پاک صاف کردو) عمر بن عبدالعزیز کے عامل نے جو ملک عراق پر مامور تھا ان کو اس بات کی شکایت لکھی کہ میرے ملک کے باشندے سرکشی کرتے ہیں اسکا جواب دیا "ارض لھم ما ترضی لنفسک وخذ بجرائمھم بعد ذالک" (یعنی تو ان کیلئے انہیں باتوں میں راضی ہو جن باتوں سے تو اپنے لئے راضی ہوتا ہی اور انکے بعد انکے جرائم ان کی گرفت کر) عمر بن عبدالعزیز کی توقیعیں بکثرت تہیں۔ یزید بن عبدالملک نے ایک شخص کے رقعہ پر جسنے اسکے کسی عامل کی شکائت کی تہی لکھا تھا۔ "وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" (یعنی جن لوگوں نے ظلم کئے ہیں انہیں عنقریب معلوم ہو جاویگا کہ کیسی جگہ لوٹ کر ان کو جانا ہے)"

بنو عباس کی توقیعات کے نمونے ہم ذیل میں دکہاتے ہیں۔

شہر انبار کے کچھ لوگوں نے خلیفہ سفاح عباسی کی خدمت میں اس بات کی شکائت لکہی کہ انکے مکانات چہینکر اس عمارت میں داخل کر دیئے گئے ہیں جسکی تعمیر کا حکم خلیفہ نے دیا ہے اور ان کو ان مکانوں کی قیمتیں

اس درخواست پر "سفاح" نے حسب ذیل توقیع لکھی تھی۔ "ھذا بناء اسس علی غیر تقوی" (یعنی یہ ایسی عمارت ہے جسکی بنیاد پرہیزگاری پر نہیں رکھی گئی ہے اور حکم دیا کہ ان لوگوں کے مکانات گرا دیئے جائیں) کوفہ کے لوگوں نے ابوجعفر منصور خلیفہ عباسی سے اپنے عامل کی بدعاملگی کا شکوہ کیا منصور نے ان کی عرضداشت پر لکھدیا۔ "کما تکونوا یولی علیکم" (جیسے تم ہوگے ویسے ہی تم پر حکومت ہوگی) اور ایک شخص کی درخواست پر جس نے ناداری و افلاس کی شکایت کی تھی یہ لکھا۔ "سل اللہ من رزقہ" (خدا سے رزق مانگ) منصور کے پاس اس کے ایک عامل کا خط آیا جو حمص پر متعین تھا اس خط میں کہیں کہیں لکھنے میں غلطی ہوگئی تھی منصور نے اس کے نیچے یہ عبارت لکھدی۔ "استبدل بکاتبک والا استبدل بک" (اپنے محرر کو بدل دے ورنہ میں تجھے بدل دونگا) آرمینیہ کے حاکم نے خلیفہ مہدی کو اپنی رعایا کی سرکشی کی شکایت لکھی مہدی نے اسی عرضداشت پر لکھدیا۔ "خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاھلین" (عفو کی خو اختیار کر امر بالمعروف کرتا رہ اور جاہلوں سے روگردانی کر) کچھ لوگوں نے مہدی سے اسبات کی شکایت کی کہ اس کا وہ عامل جو خراسان میں ہے کام میں سستی کیا کرتا ہے مہدی نے ان لوگوں کے شکایت نامہ پر لکھدیا "انا شاھر وانت نائم" (یعنی میں جاگتا ہوں اور تو سوتا ہے) اور اسے اس عامل کے پاس بھیجدیا ہارون الرشید عباسی نے اپنے عامل خراسان کو لکھا تھا۔ "داو جرحک لا یتسع" (اپنے زخم کی دوا کر تاکہ بڑھنے نہ پائے) اور عامل مصر کو لکھا۔ "احذران تخرب خزانتی وخزانۃ اخی یوسف فیاتیک منہ مالا قبل لک بہ ومن اللہ اکثر منہ" (خبردار کہیں اپنا اور میرے بھائی یوسف کا خزانہ برباد نہ کر ڈالیو پس اسطرح تجھے اس سے وہ کچھ ملیگا جو اب تک نہیں ملا تھا اور اللہ تعالے سے اور بھی زیادہ ملے گا) ابن ہشام نے مامون الرشید خلیفہ کو کسی معاملہ کی شکایت لکھی جسپر مامون نے تحریر کیا۔ "من علامۃ الشریف ان یظلم من فوقہ ویظلمہ من دونہ فای الرجلین انت؟" (شریف کی ایک علامت ہے کہ ظالم بنے اسطرح کہ زبردست پر ظلم کرے یا مظلوم بنے اسطرح کہ زبردست کا ظلم سہے) پس تو ان دونوں شخصوں میں سے کون سا ہے؟) اسی نمونہ پر خلفاء کی تمام توقیعات کو قیاس کر لینا چاہیئے۔

اس کے علاوہ توقیع کا دستور صرف خلفاء کیواسطے مخصوص نہ تھا بلکہ امیروں اور بڑے بڑے لوگوں میں بھی اس کا رواج تھا جیسے زیاد بن ابیہ ابی مسلم خراسانی اور جعفر بن یحیٰی برمکی آخر الذکر کی توقیعات بلاغت کے اعتبار سے بہت مشہور اور مقبول ہوتی تھیں جسکا اوپر بیان ہوچکا ہے اسنے ایک قیدی کی درخواست پر لکھا تھا۔ "والکل اجل کتاب"

اور ایک عرضداشت پر جو کسی عامل کی شکایت میں گذری لکہا تہا "لقد کثر شاکوک وقل شاکروک فاما اعتدلت واما اعتزلت" (یعنی تیرے شاکی بہت ہیں اور شکر گذار کم ہیں یا تو اعتدال اختیار کرو ورنہ معزول کردیا جائیگا) اور ایک شخص کے رقعہ پر جس نے سفر حج کی اجازت مانگی تہی یہ لکہا "من سافر الی اللہ انجح" (جو اللہ کی طرف سفر کرے وہ نجات پائیگا) اور ایک شخص کی درخواست پر جو کسی ولایت (گورنری) کا خواہشمند تہا لکہا "لا اولی بعض الظالمین بعضاً" (میں ظالموں کو ظالموں پر ولی بنانا نہیں چاہتا) اور ایک شخص کو یہ جواب لکہا تہا جبکہ وہ بارہا اس سے بہت کچہ انعام وعطیات لے چکا تہا اور پہر اس نے طلب کیا "دع الضرع یدر لغیرک کما در لک" (جب تو نے فائدہ اٹہا لیا ہے دوسروں کو بھی فائدہ اٹہانے دے) اور بھی بہت سی قابل قدر باتیں ہیں جن کا بیان بخوف طوالت کے مناسب مقام بھی نہیں ہے اور فضل بن سہل اور طاہر بن حسین وغیرہ کی بہی بہت سی توقیعات موجود ہیں۔

اہل عرب مسلمانوں کو مراسلات لکہتے وقت اختصار کرنے کے بارہ میں عجیب قسم کا شوق تہا جو بلاغت کیلئے ایک قابل تقلید امر ہے اس کی مثال عمر بن الخطابؓ کی وہ تحریر ہے جو انہوں نے اہل مدینہ کے قحط سے تنگ آجانے پر گیہوں اور غلہ کی امداد طلب کرنے کیواسطے عمرو بن العاص عامل مصر کو لکہی تہی انہوں نے لکہا "من عبد اللہ امیر المومنین الی العاصی بن العاصی سلام اما بعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا شبعت انت ومن معک ان اہلک انا ومن معی فیا غوثاہ ثم یا غوثاہ" (عبداللہ امیر المومنین کیجانب سے عاصی بن عاصی کو بعد سلام واضح ہو کہ مجھے قسم ہے اپنی زندگی کی اے عمرو کہ تو اور تیرے ساتھی تو شکم سیر ہوں اور میں اور میرے ساتھی جو تیرے اہل ہیں بہوکے رہیں فریاد فریاد) عمرو بن العاص نے اس کا جواب یوں دیا "لعبد اللہ امیر المومنین من عبد اللہ عمرو بن العاص اما بعد فیا لبیک ثم یا لبیک قد بعثت الیک بعیر اولہا عندک واخرہا عندی والسلام" (خدا کے بندے امیر المومنین کو عمرو بن عاص کیجانب سے ہمنے تیری فریاد سنی اور تیری طرف ایک قافلہ اونٹوں کا بھیجا ہے جس کا ایک سرا تیرے پاس ہے اور دوسرا ہمارے پاس) انکی بہت سی مثالیں انکے مراسلات میں پائی جاتی ہیں جو ادب کی کتابوں میں تلاش کرنے سے ملیں گی اختصار کا یہ طریقہ صرف خلفا اور انکے عاملوں کے بیچ ہونیوالی خط وکتابت ہی پر منحصر نہ تہا بلکہ تمام لوگ مراسلت لکہنے میں وہ اسی انداز کے پابند رہتے تہے اسکی مثال ہارون الرشید خلیفہ کا وہ جواب

پیش کرنا کافی ہے جو اُسے نقفور (نیسفورس) رومی شاہنشاہ کو دیا تھا قیصر مذکور نے خلیفہ موصوف کے
نام ایک نامہ بھیجکر اُسے دھمکی دی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ (امیرس) روم کی حکمران تھی اس سے
جس قدر خراج تمنے وصول کیا ہے وہ مجھکو واپس بھیجدو ورنہ تمہاری خیر نہیں خلیفہ رشید اس خط کو پڑھتے ہی غصہ سے
کانپنے لگا اور جوش غضب میں آپے سے باہر ہوکر قلم دوات اُٹھا اسی خط کی پشت پر لکھا بسم اللہ الرحمن الرحیم
من ھرون امیر المومنین الی نقفور کلب الروم قد قرأت کتابک یا ابن الکافرة والجواب
ماتراہ لا ما تسمعہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم امیر المومنین ہارون کی جانب سے روم کے کتے نقفور کے نام
اے کافرہ کے بچے میں نے تیرے خط کو پڑھا اور تیری باتوں کا جواب یہی ہے جو تو دیکھتا ہے نہ کہ وہ
جو تو نے سنا ہوگا) ایسا ہی بلکہ اس سے بھی مختصر جواب مراکش کے حکمران یوسف بن تاشفین نے افرنج تاجدار
اذفونش کو دیا تھا کیونکہ اُسنے ایک طویل تحریر میں اسے بہت کچھ ڈرایا دھمکایا تھا ملک یوسف نے خط پڑھنے کے بعد
اسکی پشت پر لکھدیا الذی یکون ستراہ یعنے جو کچھ ہونے والا ہے وہ خود تم بہت جلد دیکھ لوگے

خلفاء کی مکاتبت

خلفاء کی خط وکتابت میں جن قواعد کا لحاظ رکھا جاتا تھا انہیں سے ایک اہم
امر یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے مخاطب کا ذکر کرنیسے قبل ابتدا اپنے ذکر کیا
کرتے تھے اور جو لوگ اُنکے کاتب ہوتے انپر فرض ہوتا تھا کہ سیاق کا خوب خیال رکھیں اس کا نمونہ
ان تحریروں میں لکھا جا چکا ہے جو خلیفہ عمر بن الخطابؓ اور عمرو بن العاصؓ عامل مصر کے مابین ہوئیں
گویا کہ اس قاعدہ سے خلاف ورزی ناقابل معافی گناہ تھا جس سبب سے منصور عباسی کو ابی مسلم خراسانی کے قتل پر
آمادہ کیا بحالیکہ عباسی حکومت جس قدر اس کے زیر بار احسان تھی وہ لوگوں سے مخفی نہیں پھر بھی منجملہ اور امور کے
ایک بات یہی تھی کہ ایک مرتبہ اُسنے خلیفہ منصور کو عرضداشت لکھتے ہوئے پہلے اپنا ذکر کردیا تھا اسلیے اگر بعض
مراسلتوں میں اس قاعدہ کے خلاف صورت نظر آتی ہو تو اسے کتاب لکھنے والوں کا سہو سمجھنا چاہیئے
بنو بویہ کے اختیارات بڑھنے کے زمانہ تک یہی حالت قائم رہی مگر جب ان لوگوں کی قوت زیادہ ہوجانے سے
یہ لوگ خلافت کے کاروبار میں دخیل ہو چلے اور خلفاء کو برائے نام مسلوب الاختیارات بنانے لگے تو
اسوقت سے خلفاء نے جواب لکھنا شروع کردیا اور سب انکی طرف سے سوا فرمان حکومت اور سند سلطنت
کے جو دیگر مراسلات فاتح لوگوں اور بادشاہوں کے نام دیوان سے عطا ہوتی تھی اور کوئی چیز نہ لکھی جاتی تھی
خط وکتابت کے تمام شعبے وزیروں کے حوالہ ہوگئے اور اب یہ صورت قائم ہوگئی کہ جسوقت خلیفہ کے ذکر کی

ضرورت پڑتی تو مواقف المقدسہ مقامات الشریفہ سدۃ النبویہ دار العزیزۃ اور المحل الممجد وغیرہ
الفاظ سے کنایۃً ان کا ذکر کر دیا جاتا تھا مواقف کے لفظ سے وہ جگہیں مراد ہوتی تھیں جنمیں خلیفہ ٹہرتا تھا یا کہڑا
ہوتا اسکے بعد امیروں اور وزیروں کے لئے مجلس عالی الحضرۃ السامیہ ایسے ہی اور تعظیمی الفاظ کا رواج ہو گیا

اشارہ یا رمز

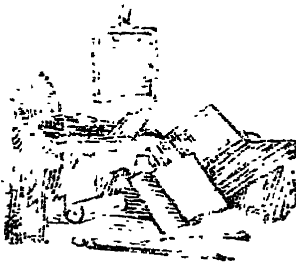
مسلمانوں نے مکاتبات میں جو تفنن کئے ہیں منجملہ ان کے ایک بات یہی تھی کہ صرف
ایک حرف کے ذریعہ سے کسی بڑی عبارت کیجانب اشارہ کیا کرتے تھے جیسا واقعہ کہ
سلطان محمود ابن سبکتگین غزنوی کو پیش آیا۔ اس سلطان نے مستقل سلطنت قائم کر لینے کے بعد خلیفہ بغداد
کو ایک نامہ لکھا جسمیں اس بات کی آرزو ظاہر کی کہ خلیفہ اسکے نام کو خطبہ میں داخل کر کے پڑہے اور سکوں پر بھی
اس کا نام مضروب کرائے۔ خلیفہ اس بات سے منکر ہوا تو محمود نے طیش میں آکر اس کو ایک خط لکھا جسمیں بہت
دہمکیاں دی تہیں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی لکھی تہی کہ اگر میں ارادہ کروں کہ بغداد کے پتھروں
ہاتھیوں پر لاد کر غزنی میں لے آؤں تو یہ کام کر سکتا ہوں۔ خلیفہ نے اس طویل الذیل تحریر کے جواب میں
جو خط بھیجا وہ محمود کے سامنے آکر کہولا گیا۔ محمود اس بات کو دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہوا کہ خط میں کوئی
عبارت نہیں لکھی صرف شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے اس کے بعد ایک الف ممدودہ (آ) اور خط کے
بیچوں بیچ میں لام (ل) اور آخر میں میم (م) تحریر ہے اور اس کے بعد صلوٰۃ و حمد صلوٰۃ ہے۔ سلطان اور
اسکی مجلس کے لوگ بہت حیران ہوئے اور اس تحریر کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکے یہانتک کہ علامہ ابو بکر قہستانی جو اس
زمانہ کا بڑا ذی علم شخص تہا اور محمود کے دربار کی زینت دربار میں داخل ہوا اور اس نے دیر تک خط کو غور سے
دیکھ کر آخر کار اس کا مطلب پا لیا۔ ابو بکر نے سلطان سے کہا میں اسکا مطلب جانتا ہوں۔ سلطان نے کہا بیان
کرو اور اسکے صلے میں تم جو مانگو گے ملیگا۔ ابو بکر نے کہا تم نے خلیفہ کو جو تحریر لکہی تہی اسمیں اسکو دہمکی
دی تہی کہ میں ہاتھی پر لے کر فوج کشی کرونگا اسکے جواب میں خلیفہ نے یہ خط لکہا ہے اور اسمیں الف
لام میم تحریر ہے ان حروف مقطعات سے اسنے خداوند پاک کے ارشاد۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ
بِأَصْحَابِ الْفِيلِ الآیہ کیجانب اشارہ کیا ہے۔ سلطان اس بات کو سنکر کانپ گیا اور اسے بد فالی
خیال کر کے اپنی حرکت پر نادم ہو گیا اور اس کے بعد حسن سلوک کے سوا کبہی کوئی بد خیال خلیفہ کی بابت
دل میں نہ لایا۔ اسی قبیل کی ایک اور حکایت بھی ہے جو سدید الملک علی بن مقلد حاکم قلعہ شیزر کو پیش آئی تہی
یہ شخص نہایت دلیر جنگجو اور [illegible] پانچویں صدی ہجری کے وسط میں گذرا ہے اس شخص نے قلعہ شیزر کا

مالک ہونے سے قبل حلب کو بہت آیا جایا کرتا تھا ان دنوں حلب کا والی تاج الملوک محمد بن صالح تھا
اتفاقاً سدید الملک اور تاج الملوک کے مابین کوئی ایسی بات آپڑی جس کی وجہ سے اول الذکر آخر الذکر
کی جانب سے خائف ہوگیا اور اسی خوف میں طرابلس شام کی جانب نکل گیا اس زمانہ میں طرابلس کا حکمران
جلال الملک بن عمار تھا۔ سدید الملک اس کے یہاں مقیم ہوگیا۔ تاج الملوک کو یہ خبر ملی تو اسنے
کسی حیلہ سے سدید الملک کو اپنے ہاں بلانے اور اس کے ساتھ فریب کرنے کا قصد دل میں کر کے
اپنے کاتب ابی النصر محمد بن الحسین کو اشارہ کیا کہ سدید الملک کو ایک [illegible] خط جس میں اس سے ملنے اور
اسکے اپنی جانب مائل کرنے پر زور دیا گیا ہو لکھے کہ اسے یہاں بلائے ابوالنصر اصل غرض کو سمجھ گیا اور اسے معلوم ہوگیا
کہ یہ خط کیوں لکھا جاتا ہے چونکہ وہ سدید الملک کا دلی دوست تھا اسلئے وہ دل سے تو خواہاں تھا کہ سدید الملک یہاں نہ آئے
مگر حاکم سے انکار بھی نہ کر سکتا تھا خط لکھنا ضروری تھا بہرحال اسنے تاج الملوک کے حکم کی تعمیل کی اور جیسا
مضمون اسنے بتایا تھا ویسا ہی خط لکھ کر تیار کر دیا یہاں تک کہ جب وہ لکھتے لکھتے ایک مقام پر "ان شاء اللہ تعالیٰ"
کے فقرہ تک پہنچا تو اسنے نون کو تشدید اور فتحہ دے کر "انّ" بنا دیا اور خط روانہ کر دیا سدید الملک
کو خط پہنچا تو اسنے پڑھ کر اسے ابن عمار حاکم طرابلس کی خدمت میں پیش کیا اسوقت دربار لگا ہوا تھا؛
ابن عمار اور اس کے خواص نے خط کی عبارت بہت پسند کی اور تاج الملوک کا وہ شوق جو اسنے
سدید الملک سے ملنے اور اسے تقرب سے سرفراز کرنے کی بابت ظاہر کیا تھا عظمت کی نگاہ سے دیکھا سدید الملک نے
ان لوگوں کی باتیں سنکر کہا میں تو اس خط میں ایک ایسی بات دیکھتا ہوں جو تم کو ہرگز نظر نہیں آئی اس کے بعد
سدید الملک نے موقع اور مناسبت کا لحاظ کر کے خط کا جواب لکھ دیا اور جہاں اور باتیں لکھی تھیں ایک فقرہ یہ
بھی تحریر کیا "انا الخادم المقر بالانعام" اور انا کے ہمزہ کو کسرہ اور نون کو تشدید و فتحہ دیدیا جس کی وجہ سے
یہ لفظ "انّا" ہوگیا جب یہ خط تاج الملوک کے پاس پہنچا اور ابونصر کاتب اس سے واقف ہوگیا تو اسے بہت خوشی ہوئی
اسنے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ مجھ کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ میری تحریر سدید الملک کے سمجھ میں آگئی۔ ابونصر
نے "انّ" کے نون کو مشدد بنا کر اس آیت "ان الملا یاتمرون بک لیقتلوک" کی جانب اشارہ کرنیکا
قصد کیا تھا جسکے جواب میں سدید الملک نے اسی نون "انا" کو مشدد اور ہمزہ کو مکسور کر کے "انّا" لکھا
اور اس سے اس آیت "انا لن ندخلها ابدا ما داموا فیها" کی طرف اشارت کردی۔
اسی قسم کی تلمیح کی ایک اور مثال وہ تحریر ہے جو عضد الدولہ بن بویہ نے ابی منصور افتکین والے

دمشق کو بھیجی تھی افتکین نے عضدالدولہ کو لکھ بھیجا تھا کہ شام کا ملک دشمنوں سے صاف ہو چکا اور میرے قبضہ میں آگیا حکمران مصر کا اب یہاں کوئی اثر باقی نہیں رہا ہے اگر تم مال اور سامان سے مجھ کو مدد دو گے تو میں دشمنوں سے خاص اُن کے ملک میں جا کر لڑنے کیلئے مستعد ہونگا" عضدالدولہ نے اس خط کا جواب ایسے متشابہ الخط کلموں میں لکھا جو بلا نقطہ دینے اور منضبط کرنیکے نہ پڑھے جا سکتے تھے اور اس تحریر کا نمونہ یہ ہے۔ عزک تصہار تصہار ذالک ذالک فاحش فاحش فحال فعلک بھذا الخ عضدالدولہ کی اس قسم کی تحریر سے مراد یہ تھی کہ مبادا یہ خط کسی غیر کے ہاتھ میں جا پڑے اور وہ اصل مدعا پر واقف ہو جائے افتکین اسکے مدعا کو سمجھ کر اسپر عمل پیرا ہوا۔

تحریر کے آلات و سامان

اہل عرب قلم "نے" کا بناتے تھے جس طرح آج کل ہم بناتے ہیں باقی رہی روشنائی سو غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کوئلہ کو باریک پیکر کاجل سا بنا لیتے تھے جس میں کوئی چپکنے والی شے مثل گوند وغیرہ کے بنا دیتے تھے۔



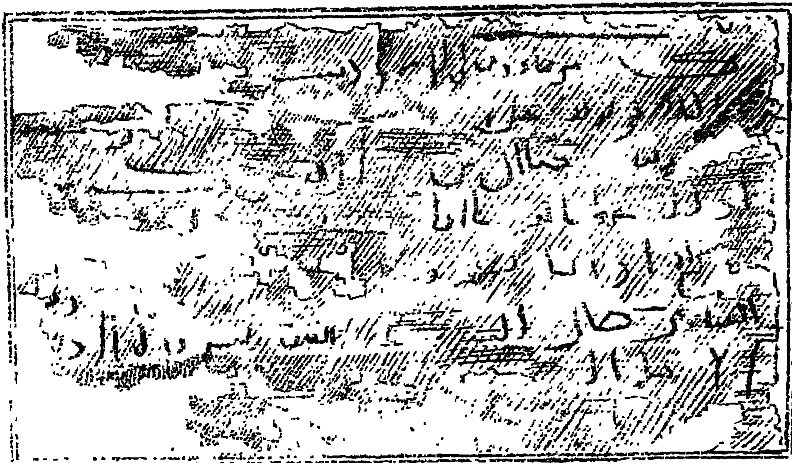
کاغذ کے متعلق سب سے قدیم چیز جس کو اہل عرب نے آغاز اسلام سے لکھنے میں استعمال کیا وہ "رق" یعنی پتلی پتلی کھالوں کے ٹکڑے تھے اور اسکے علاوہ کپڑوں پر بھی لکھا ہے جنمیں سب سے زیادہ مشہور ملک مصر کا بنا ہوا "قباطی" نام ایک کپڑا تھا اور اسی کپڑے پر اسلام سے قبل "معلقات سبعہ"[1] لکھے گئے تھے اور جب مذکورہ بالا چیزوں کا ملنا دشوار ہوتا تھا تو وہ لوگ لکڑی کے تختوں چوڑی ہڈیوں ٹھیکریوں یا پتھروں وغیرہ پر بھی لکھدیا کرتے تھے"۔

جب مسلمانوں نے ملک مصر کو فتح کیا تو انہوں نے "بردی" (پاپیرس) کو تحریر کے مصرف میں لیا

---

[1] اہل عرب کی زبان آوری مشہور ہے اسلام سے قبل انکے نزدیک فخر و مباہات کی صرف دو چیزیں تھیں سیف اور زبان شعرائے عرب جو قصائد نظم کرتے تھے اور انکے لیے مثل ہونے کا فیصلہ ہوتا تھا وہ قصید سے لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیئے جاتے تھے ظہور اسلام کے وقت سات قصیدے مشہور شاعروں کے لٹکائے جاچکے تھے اور یہی قصائد معلقات کے نام سے مشہور ہیں۔

چنانچہ اموی خاندان کی اکثر تحریریں پاپیرس اور قباطی پر لکھی گئی ہیں قاہرہ خدیوی کتبخانہ کے اندر کچھ آثار عربی خط میں لکھے ہوئے موجود ہیں، قطر مصری کے بعض اطراف میں دستیاب ہوئے ہیں انہیں ہم نے ایک صفحہ پاپیرس کا اور ایک قطعہ قباطی کا دیکھا ہے اگرچہ یہ پرچے پرانے ہونے کے باعث جا بجا سے گل گئے ہیں تاہم لکھائی انپر صاف ظاہر ہے اسکے علاوہ ہم نے "تجارہ" کا بھی ایک قطعہ دیکھا جسپر عربی کتابہ موجود ہے ان سب کتابوں میں قدیم سے قدیم تحریر بھی پہلی صدی ہجری کے آخری زمانہ سے قبل کی نہیں ہے اور یہ سب خدیوی کتبخانہ کے بڑے ہال میں لوگوں کے دیکھنے کیلئے لگے ہوئے ہیں۔



(عربی تحریر کپڑے پر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں لکھی ہوئی)

چنانچہ اگلی تصویر شکل میں ایک عربی خط دکھایا گیا ہے جسکی بابت گمان ہے کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھا گیا تھا یہ عبارت کپڑے پر لکھی گئی ہے اور لندن کے برطانی عجائب خانہ میں محفوظ رکھی ہے۔

عباسی حکومت کا دور شروع ہونے کے بعد اہل عرب نے کاغذ کا استعمال شروع کیا فضل بن یحییٰ برمکی نے اسکی جانب رہنمائی کی اور مسلمانوں نے کاغذسازی کو رواج دیا گمان غالب یہ ہے کہ اہل عرب نے کاغذ بنانے میں چینیوں کی شاگردی کی ہے کیونکہ چینی لوگ ولادت مسیح سے قبل کاغذ کی صنعت میں استادی کے پایہ پر پہنچ گئے اور مشہور ہو چلے تھے اور یہ صناعت اُن کے ملک میں پہلی ہوئی تھی [illegible] سمرقند کا شہر [illegible] اور وہاں کے لوگوں کو یہ ہنر سکھایا [illegible] کے فروغ دینے اور کام [illegible] طرف عباسی [illegible]

میں متوجہ ہوئے اور وہ بھی اسوقت جبکہ خطوط مراسلات اور اقرار ناموں وغیرہ کے لکھنے کی کثرت
کہ اس کا دستیاب ہونا مشکل ہو گیا ایسے وقت میں فضل برمکی نے کاغذ بنانے کا حکم نافذ کیا اور مسلمانوں نے بغداد
اور شام وغیرہ مقامات پر اس کے کارخانے کھول دیئے جو کہ ان دنوں اسلامی حکومت کے پایۂ تخت تھے کاغذ بنانے کی
صناعت کو دنیا میں پھیلانے کے متعلق مسلمان لوگ اگر یکتائی کا دعوے کریں تو زیبا ہے اسلیے کہ انکے سوا اور کوئی
ذریعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا جسنے اس دستکاری کو رواج دیا ہو اور نیز اسباب سے بھی اسکا پتہ ملتا ہے کہ
جبوقت وسطی صدیوں میں اہل یورپ غفلت کی گہری نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے ملک شام کا بنا
ہوا کاغذ استعمال کیا جس کا نام ان کی زبان میں تھا

کاغذ بنانے کی صنعت یورپ میں اندلس (اسپین) کے راستے داخل ہوئی کیونکہ شاطبیہ
اور طلیطلہ وغیرہ مقامات میں کاغذ سازی کے بڑے بڑے اسلامی کارخانے موجود تھے چنانچہ جب
اندلس کا ملک افرنجی لوگوں کے قبضہ تصرف میں آیا تو انہوں نے ان کارخانوں کو قائم رکھا اور
اسکے بعد یہ صنعت اسپین سے تمام یوروپین ملکوں میں پھیلتی گئی عربی خط میں کاغذ پر لکھی ہوئی چیزوں کا سب سے قدیم نمونہ
کتاب "غریب الحدیث" کا ایک نسخہ ہے جو لیڈن کے "مکتبہ جامعہ" میں محفوظ ہے اور گمان کیا
جاتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھا گیا تھا اور ایک کتاب "دیوان الادب" برٹش میوزیم
لنڈن کے کتبخانہ میں پائی جاتی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے شروع میں لکھی گئی ہے"

حجابت

اسلامی حکومتوں کے حاجب سے وہ عہدہ دار مراد ہے جس کو آجکل "تشریفاتی" سے تعبیر کرتے ہیں
اور تشریفاتی اُسے کہتے ہیں جو امرا بادشاہ یا شاہنشاہ سلطانوں کے حضور میں لوگوں کی حاضری کی اجازت
حاصل کرتا اور بعد اجازت انہیں دربار میں لا کر پیش کرتا ہے شاہی ہیبت کو محفوظ رکھنے کیلئے اس
عہدہ دار کا ہونا لازمی ہے جس جس طرح سے حکومت مدنیت اور عیش و عشرت میں ڈوبتی جاتی ہے اسی طرح
رفتہ رفتہ اس کے بادشاہ اور رعایا کے مابین گہرے پردے قائم ہو جاتے ہیں خلفائے راشدین
کا دستور تھا کہ ان کے دروازے ہر شخص کیلئے کھلے رہتے تھے وہ فقیر اور مالدار سے ملتے اور زبردست

یکساں بلا کسی حجاب یا وقت کے گفتگو کیا کرتے تھے۔

مگر جبکہ خلافت کا صیغہ ملکداری سے بدل گیا تو جو نئی نئی باتیں آئین حکومت میں داخل ہوئیں منجملہ انکے ایک بات حجاب میں دقتیں پیدا کرنا اور لوگوں کو خلفا کے حضور میں درجوں مرتبوں اور خاندانوں اور نسبوں کے اعتبار سے بار ملنا ہی تھا سب سے پہلے جس خلیفہ نے اس بات کا خیال قائم کیا وہ معاویہ بن ابی سفیان تھے ان کو زیاد بن ابیہ ان کے مشیر خاص نے اسطرف توجہ دلائی تھی ان کے وقت میں صرف اسقدر امتیاز قائم ہوا تھا کہ خلیفہ کے دربار میں سب سے پہلے اہل بیوتات یعنی بڑے عالی نسب لوگوں کو بار ملتا تھا اور جب باریاب ہونیوالوں کے نسب برابر ہوتے تو عمر کو فضیلت دیا کرتے تھے اور سن و سال کی برابری میں علم و ادب کو مابہ الامتیاز ٹھہراتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی چار شخصوں کو عام حکم تہا کہ وہ جبوقت چاہیں خلیفہ کے پاس چلے آئیں وہ چار شخص حسب ذیل تھے؛

(۱) موذن (۲) رات کو گشت کرنیوالا افسر جو کہ عام محافظت کا ذمہ دار تھا (۳) سرحدی افسر کا قاصد اور (۴) خوان سالار (کھانا کھلانیوالا شخص جو خلیفہ کو کھانا دیتا تھا) چنانچہ اسی امر کی تشریح زیاد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس نے اپنے حاجب سے کہا تھا اور وہ یہ ہے۔ میں نے تجھ کو اپنے حاجب کی خدمت حوالہ کی ہے مگر چار شخص ہیں جنپر تجھے کوئی اختیار نہیں ایک تو نماز اور فلاح میں خدا کیطرف بلانیوالا اسکو میرے پاس آنے سے نہ روکنا تجھ کو اسپر کوئی حق نہیں اور دوسرے رات کو گشت کرنیوالے کو بھی نہ روکنا کیونکہ نہ معلوم وہ کوئی بری خبر لے کر آیا ہوگا؛ اگر اچھی خبر ہوتی تو ایسے وقت میں نہ آتا اور تیسرے سرحدی قاصد کو نہ روکنا کیونکہ اس کو مجھ تک آنے میں ایک ساعت کی دیر لگنے سے ایک سال کا کام بگڑ جائیگا لہذا اگر میں اپنے لحاف میں بھی ہوں تو اسے میرے پاس بھیجدینا اور چوتھے داروغہ مطبخ کو نہ روکنا کیونکہ جس وقت کھانے کو دوبارہ گرم کیا جاتا ہے تو وہ بگڑ جاتا ہے؛

بنی عباس کی حکومت آئی اور اس کو ترقی ہوتے ہوتے مشہور عظمت و کامرانی کا دور نصیب ہوا تو ان لوگوں نے رعایا کے خلیفہ سے ملنے جلنے میں اور بھی زیادہ روک ٹوک کی البتہ جب کوئی سخت حاجت یا ضروری کام ہوتا تو اس کی دوسری بات تھی ابن خلدون نے اس حجاب کا نام "حجاب ثانی" رکھا ہے بنی عباس کے عہد میں لوگوں اور خلیفہ کے مابین دو دربار قائم ہو گئے ایک تو دربار خاص اور دوسرا دربار عام ایک گروہ حاجب کی رائے اور تجویز کیمطابق ایک دربار میں خلیفہ کی حضوری کا شرف پاتا تھا بنو عباس اپنی حکومت

کمزور ہونے کی حالت میں ایک تیسرا حجاب بھی اختیار کیا تھا جو پہلے دونوں حجابوں کی نسبت کہیں زیادہ پائدار اور گہرا تھا یہ حجاب صرف اسی صورت میں ہوتا تھا جبکہ خلیفہ پر وزیروں اور (سلطانوں) کی جانب سے دباؤ زیادہ پڑنے لگتا تھا اور وہ گویا ایک طرح سے قیدی یا نظر بند کر دئے جاتے تھے اس کی صورت یہ تھی کہ جس وقت ارکان دولت خاندان خلافت کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خلیفہ بنا کر ان پر دباؤ ڈالے رکھنا چاہتے تھے تو سب سے پہلے اس بات کا انتظام کرتے تھے کہ انکے خاندان والے اور اُن کے اولیا اُن سے نہ ملنے پائیں اور اپنی اغراض کو مخفی رکھنے کیلئے ان کم فہم خلفاء کو یہ پٹی پڑھا دیتے تھے کہ ان لوگوں میں ملنے جلنے میں ہیبت خلافت زائل ہو جائیگی اور ان کے مودب رہنے کی عادت جاتی رہے گی۔ یہ حالت عباسی دور حکومت میں پیدا ہو گئی تھی اور قاعدہ کی بات ہے کہ ہر سلطنت کے آخری زمانہ میں جب اسکے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

نقابت

نقابت۔ جو اشراف کی نقابت ہوتی تھی اس کا نام نقابت اشراف اسلئے رکھا تھا کہ اس کو اشراف مسلمانوں کے ساتھ تعلق تھا جو کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہلبیت سے تھے یہ بات یوں تھی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کنبہ اوائل اسلام میں اسوجہ سے کہ اُن کا زمانہ نبوت سے بہت قریب تھا قابل تعظیم و تکریم مانا جاتا تھا۔ مسلمانوں کا دستور تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے پر اُنہیں کے افراد میں سے ایک شخص کو رئیس یا سردار بنا دیتے تھے جو اپنے کنبہ کے معاملات کو درست انکے نسب ناموں کو منضبط اون کی ولادتوں اور وفاتوں کو مرتب رکھتا اور ادنےٰ پیشوں میں مصروف ہونے سے ان کو الگ رکھتا تھا بدعادتوں کے اختیار کرنے اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتا رہتا تھا اور ان کے حقوق کا مطالبہ کیا کرتا خود ان لوگوں کو دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی ہدایت کرتا رہتا اور مال غنیمت اور فئی کی آمدنی میں سے ذوی القربےٰ کا جو حصہ نکلتا تھا حکومت سے اس کا مطالبہ کر کے حاصل کرنے کے بعد ان کے مابین تقسیم کر دیا کرتا انکی لڑکیوں کو اس بات سے باز رکھتا کہ وہ ہم کفو کے سوا غیر کفو سے نکاح کریں اسیطرح کی اور باتیں جو جماعت عامہ سے مشابہ ہوتی تھیں اس کے ذمہ واجب تھیں گویا کہ اشراف کا نقیب اُن کا وصی ہوا کرتا تھا۔

اشراف کی نقابت نہائیت معزز منصب تہا اور بلحاظ شرف کے ان کی شان بعد از خلیفہ سب سے اول تھی اسلیے جب اشراف کے نقیب شریف رضی نے ایک قصیدہ میں خلیفہ قادر باللہ عباسی کو مخاطب کرکے یوں کہا ہے

عطفا امیر المومنین فاننا
فی دوحۃ العلیاء لانتفرق
مابیننا یوم الفخار تفاوت
ابدا کلانا فی المعالی معرق
الا الخلافۃ میزتک فاننی
انا عاطل منہا وانت مطوق

امیر المومنین ہمپر مہربانی کی نظر رکہیے اسلیئے کہ ہم اور آپ عالی خاندانی میں جدا جدا نہیں ہیں۔
فخر کرنیکے دن ہم میں اور آپ میں کوئی تفاوت نہیں ہے ہم دونوں معالی (بلند مرتبوں) میں اعلیٰ درجہ رکہتے ہیں۔
مگر خلافت نے تجہہ کو ممتاز بنا دیا ہے اسلیئے کہ بیشک میں اس سے عاری ہوں اور تم کو خلافت کا طوق نصیب ہے۔

خلفاء اشراف کے نقیبوں کیلیئے ایسے عہدے اور فرمان سرداری لکہا کرتے تہے جنکے حرف حرف سے انکی جلالت و عظمت مرتبہ کا اظہار ہوا کرتا تہا اور اکثر حج کے زمانے میں آب زمزم پلانے کی خدمت اور دیوان المظالم (عدالت مرافعہ) کے مثل اعلیٰ مناصب ان کے حوالہ کرتے تہے اسلامی حکومتیں اپنی تواریخ کے تمام دوروں میں نقابہ اشراف کی تعظیم و تکریم کرتی رہیں یہانتک کہ موجودہ عثمانی (ٹرکی) حکومت بھی اس بات کا پورا لحاظ رکہتی ہے اس حکومت میں نقیب اشراف ہی وہ شخص ہے جو تمام رسمی اعزازوں میں دولت علیہ کے سارے عہدہ داروں پر فوقیت رکہتا ہے یہانتک کہ اس کا رتبہ وزیر اعظم اور شیخ الاسلام سے بھی بڑہ کر ہے۔

صوفیہ طریقوں کے مشائخ

یہ ایک دینی منصب ہے جو وجود صوفیہ کے بعد رائج ہوا ہے اس منصب کا بانی وہی الاصوفیہ کے تمام طریقوں پر کلام کر سکتا ہے صوفیہ کرام کے طریقوں میں یہ دستور ہے کہ ہر طریقہ کا ایک شیخ ہوتا ہے اور دیگر گاؤں اور بستیوں میں اسکے خلفاء ہوتے ہیں جنمیں سے ہر ایک خلیفہ کے بہت سے مرید ہوا کرتے ہیں شیخ خلیفہ لوگوں کے معاملات کا انتظام کرتا ہے اور خلفاء عام مریدوں کی دیکھہ بہال رکہتے ہیں لیئے ان کو ہدایت

وارشاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، مراقبہ اور ترتیب کیے لیتے رہتے ہیں۔ شیخ المشائخ جو شخص ہوتا ہے
وہ سب کے اوپر والی عام ہونے کا حق رکھتا ہے۔ جس وقت تک صوفیوں میں عام مشیخت کا دستور نہ تھا اس وقت
تک ان کا ہر ایک گروہ مستقل بالذات اور اپنی افراد کا حاکم تھا مگر اس کی وجہ سے یہ قباحت آ پڑی تھی کہ
اس کے مختلف گروہوں میں باہم آتش فتنہ و فساد برپا رہتی تھی کیونکہ کوئی عام شیخ تو تھا نہیں جس کے
زیر حکم سب فرقوں کے لوگ ہوں اور گو مختلف طریقوں سے ایک کام کرتے ہوں لیکن اصل سب کی ایک ہو
جس کے سبب سے کوئی معاملہ تنازعہ فیہ پیش آجانیکے وقت ایک حکم کی جانب رجوع کرکے باہمی جنگ و جدل سے باز رہیں
لہٰذا اس کی ضرورت تھی کہ کوئی اعلے پایہ اس طریق میں قائم ہو جس کے سامنے سب کی گردنیں خم رہیں چنانچہ
جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے سعید السعداء کی خانقاہ قائم کی اور اس کا "دویرۃ الصوفیہ" نام رکھا تو وہاں کے
شیخ کو دوسرے مشائخ پر متقدم اور افسر کی امتیازی حیثیت دیدی۔ سلطان صلاح الدین کا دستور تھا کہ سلطنت کے
بڑے بڑے رکنوں کے اور کسی کو اس عہدہ پر مامور نہ کیا کرتا تھا مثلاً شیخ الشیوخ ابن حمویہ کی اولاد کو جن کو وزارت
امارت انتظام سلطنت اور فوجی افسری کے اہم کاموں کی ذمہ داری بھی سپرد تھی۔ چنانچہ ذوی الریاستین وزیر صاحب
تقی الدین عبد الرحمن بن بنت الاعز وغیرہ کے مثل لوگ اس عہدہ شیخ الشیوخ پر مقرر کیے گئے اور یہ حالت
برابر اس وقت تک قائم رہی جبکہ نویں صدی ہجری کے اندر ملک مصر میں صوفیہ کرام کی جدید ریاست قائم ہو گئی اور
اس کی ولایت سید محمد شمس الدین بکری کے حوالہ ہوئی جو اپنے زمانہ میں علم اور دین دونوں کے اعتبار سے
بڑے کامل فرد تھے شعرانی انکے بارہ میں یوں لکھتے ہیں کہ "اگر میں ان کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم کہوں تو
کچھ خلاف نہ کہونگا۔" شیخ موصوف کے بعد ان کے بیٹے امام شیخ الاسلام مشہور مفسر ابو السرور البکری
جانشین ہوئے اور انکے بعد یہ منصب انہیں کے گھرانے اور اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ اور آج تک برابر یہ منصب
"بکری صدیقی" کے ہی گھرانے میں قائم ہے جو ملک مصر کا مشہور خاندان ہے۔

تمام شد

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
فلسفہ ابن عربی	۱ر	مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی	۲ر	مراۃ الاسلام	۴ر
فلسفہ القرآن	۲ر	تربیت اولاد	۴ر	حقیقت اسلام	۴ر
کانشنس -	۱ر	معیار الاخلاق	۶ر	فضائل النبی صلعم	۲ر
کتاب الزکاۃ	۲ر	فلاح دارین	۱۲ر	المنصف	۴ر
مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تنزل کے اسباب	۸ر	تمدن اسلام ہر دو حصہ	للعہ	تہذیب اللسان	۱ر
				تنقیح حقوق نسواں	۸ر
منہاج القواعد	۱۲ر	علم الغیب	۱ر	المراۃ المسلمہ	۱۲ر
مہدی آخر الزمان	۲ر	بشارت فاطمہ (ناول)	۴ر	رباعیات عمر خیام	عہ
محرم کی بدعتیں	۲ر	مکافات عمل حصہ اول (")	عہ	اسرار الحاذقین طب	عہ/۸
مسلمانوں کی تہذیب	۴ر	الایمان - -	۱۲ر	فیض عام "	عہ/۸
ماحضر -	۳ر	قرآن شریف معرا مجلد کپڑا	عہ	مجربات امام سویدی	عہ
مناظرہ رحم و انصاف	۱ر	حمائل شریف معرا مجلد فیروزی	ۓ	دین و دانش	ۓ
ہندوستانیاں	۸ر			اصول عامئہ تکیں	عہ
یورپ و قرآن	۳ر	بنیظیر جیبی حمائل شریف مترجم مجلد چرمی	عہ/۱۲	تاریخ چترال	عہ
فطرت و قانون فطرت	۳ر			تصدیق الاسلام	۱۰ر
مکتوبات امام ربانی اردو حصہ اول	۱۰ر	داستان مریخ	۱۰ر	دینیات کی پہلی کتاب	۱ر
		آدیماق مغل	صہ	خیالات امام اہل اسلام	۲ر
ارمانوسہ (ناول)	۶	زینت النبات	۴ر	حقوق نسواں	۴ر
فتاۃ دفان (ناول) ہر دو حصہ	ۓ	فتح اندلس (ناول)	عہ/۸	کامنی - -	۸ر
مسلمان عورتوں کی بہادری	۱ر	الاسلام دین الفطرۃ	۶ر	عصر جدید مکمل مجلد سنہ ۱۹۰۵	ۓ
		اسلام اور سوشیل ریفارم	۸ر	ایضاً سنہ ۱۹۰۶ء	"
مسدس ننگ خدمت	۱ر	الاسلام والنصرانیہ	۸ر	" سنہ ۱۹۰۷	"

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
آولتہ الکرام	عہ	فتح الیزدان	۶ر	خلاصۃ الاخلاق	۲ر
انتخاب مخزن		فوائد عزیہ تحفہ عثمانیہ	۴ر	داستان پاستان حصہ اول	۴/عہ
حصہ اول	۸/عہ	الیفنز اینڈ اپوتھمگس	۸ر	״ ״ دوم	۸/عہ
آثار اکبری	عا	مظفر ورامابائی	۱۲ر	داستان پاستان کی دوسری جلد	۱۲ر
ارشادات القرآن		طلسمی بدلہ	عا	شمائل ترمذی	۴/عہ
حصہ اول	۸ر	منتخب بوستان	۴ر	رسوم جاہلیت	۴/عہ
المرتضیٰ	۸/عہ	قواعد امیریہ	۲ر	رسوم دہلی کلاں	۱۲ر
الصدیق	۸/عہ	گلدستہ منافع حصہ اول	۸ر	سلسلہ حساب کا پہلا حصہ	۵ر
سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول	۸/عا	گنجینہ مولود شریف	۴ر	سلسلہ حساب کا چھٹا حصہ	۶ر
ایضاً بلاد اسلامیہ	۸/عہ	مراۃ الحقائق	۴/عہ	״ ״ ساتواں حصہ	۸ر
عزلی بدلیجانی ہر دو حصہ	۸/عہ	آبجیات -	عا	قرآن شریف کلاں مترجم	
کتاب الصرف	۱۲	اختلاف اللسان	۱۰ر	معہ تفسیر حسینی و حقانی	۳۰
کتاب النحو	۶ر	آفتاب رسالت	۲ر	ایضاً	۸/عہ
کیا اشاعت اسلام		اکسر سائزان ارتھیٹک	۱۲ر	فطرت الاسلام	عا
بزور تلوار ہوئی ہے	۸ر	ترتیب القرآن	۴ر	قرآن شریف مترجم بلا جلد	
مسدس حالی مجلد مطلا	عہ	چھار گلزار حالی	۳ر	معہ تفسیر حسینی حقانی کاغذ	۶/ے
״ بلا جلد	۸ر	حقیقت الازدواج	عہ	کاردان -	۶ر
علم الحدیث	۸ر	حسامی بالنامی		مائدہ محمدیہ -	۲ر
محکمات آیات		قسم اول	۴/عہ	ہاجرہ ناول -	۸/عہ
قرآنی کی تفسیر	عہ	حسامی بالنامی قسم دوم	۳/عہ	مقامات خلافت استنبول	۸/ے